مرا رختِ سفر
(افسانے)
ترنّم ریاض
Meer Zaheer Abass Rustmani

مرارختِ سفر

(افسانے)

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا وَمِنْ اٰنَآئِ
الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّکَ تَرْضٰى O

Therefore be patient with what they say,and celebrate (constantly) the praises of thy Lord, before the rising of the sun, And before its setting; Yea, celebrate them for part of the hours of the night , and at the sides of the day; that thou mayest have (sipiritual) joy.

مرارختِ سفر

(افسانے)

ترنّم ریاض

پروفیسر اسلم آزاد، رکن بہار قانون ساز کونسل کے
ترقیاتی فنڈ سے طلبہ کی فلاح کے لیے فراہم

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

MIRAA RAKHT-E-SAFARR

(Short Storeis)

by

Tarannum Riyaz
C-11, Jungpura Extn. New Delhi- 14
E-mail: tarannumriyaz@gmail.com

Year of Edition 2008
ISBN 81-8223-409-3
Price Rs. 500/- (Library Edition)

نام کتاب : مرا رختِ سفر (افسانے)
مصنفہ : ترنم ریاض
سنِ اشاعت : ۲۰۰۸ء
قیمت : ۵۰۰ روپے (لائبریری ایڈیشن)
مطبع : عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی ۶

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph: 23216162,23214465 Fax : 0091-11-23211540
E-mail :info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com

شریکِ رنج وراحت ریاض الدین پنجابی

کے نام

صدا، نغمگی، طرز، آہنگ، ساز
ترنم کی تکمیل و طاقت ریاض

قلم اُداس تھا تحریر بینَ کرتی تھی
تمھاری آنکھ ہوئی نم، معاف کر دینا

(ترنم ریاض)

فہرست

◆✣◆

پیش لفظ

مجھے دو چیزیں بہت عزیز ہیں ۔ پرندے اور بچے ۔ بڑے معصوم ہوتے ہیں دونوں ۔ اور انسانی بقا کے لئے اہم بھی کہ ایک شے زندگی ہے تو دوسری زندہ فضا کا استعارہ۔ مگر کئی باتیں ہیں جو ذہن سمجھتا ہے اور دل قبول نہیں کرتا کہ آخر اکثر سارا قہر اُن ہی لوگوں پر کیوں ٹوٹتا ہے جن کے چہرے بہت سفید نہیں ہوتے اور جن کے بالوں کا رنگ کم سفیدی مائل ہوا کرتا ہے۔

دھواں پرندوں کے آشیانوں تک اتر آیا ہے ۔ ان کی کئی اصناف نیست و نابود ہوگئی ہیں۔ بہت سی ہونے کو ہیں ۔ اور کرۂ ارض کے انگنت بچے ہر طرح کے تشدد کے آسان شکار ہیں۔

ایک تصویر دیکھی تھی کسی قحط زدہ علاقے میں کھنچی ۔ ہڈیوں پر آبنوسی چمڑی پہنے جوان عورت کی گود میں پنسل جیسے ہاتھ پیر اور چھوٹی سی توند والے ایک ایسے بچے کی جو ایلومنیم کی اونچے، مڑے ہوئے کناروں والی رکابی سے نوالا اپنے دہانے کی طرف لے جاتی ہوئی ماں کو دیکھ رہا ہے۔ بچے کی آنکھوں میں کچھ ایسا تھا کہ کئی دنوں کے لئے نیند اڑ ہوگئی ۔ آنکھیں بند کرتی تو وہ کھلی آنکھیں میری پتلیوں میں جاگ جاتیں ۔ وہ منتظر آنکھیں، کہ ماں اُسے کب کھلائے گی ۔ ماں اُس سے پہلے کیوں کھا رہی ہے ۔ اور کیا ماں

کے پاس کھانے کے لئے کچھ اور ہوگا؟

وہ تصویر اب بھی یاد آتی ہے تو وجود عجب بے بسی میں گھر جاتا ہے۔

ایک اور تصویر جو میرے تصور میں بیٹھ سی گئی ہے، وہ بھی بچے کی ہے۔ سیاہ گھنگھریالے بالوں اور گورے مکھڑے والا، رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس چھوٹے چھوٹے ہاتھ ذرا سا آگے کو بڑھائے، ایک خوبصورت سے مکان کے ٹوٹے ہوئے دروازے کے پاس کھڑا ہے۔ اس کی شہد رنگ آنکھوں میں آنسو لبالب بھرے ہیں (جو فوٹو کلک ہونے کے بعد ہی چھلک گئے ہوں گے)۔ اس کی آگے کو بڑھی ہوئی باہیں کسی کے لئے وا ہیں جو جلد آکر اس کے دوڈھائی سالہ وجود کو اپنی بے خطر گود کی پناہوں میں لے لے اور کہہ دے کہ کچھ نہیں ہوا اور پل بھر پہلے اسے نہلا کر خرگوش کے اون کا گلابی سویٹر پہنانے والی ماں زندہ ہے اور بابا اس کے لئے اچھی اچھی چیزیں لینے بازار گئے ہیں۔ اس کے بہن بھائی گولیوں کی زد میں نہیں آئے اور سلیٹی رنگ پر بڑے بڑے ہلکے سبز دھبوں اور چھوٹی چھوٹی بھوری ٹیڑھی موٹی لکیروں والی وردی، ہیلمیٹ اور بہت سی بڑی بڑی جیبوں والی ہری تصواری جیکٹ پہننے والے بندوق برداروں نے زبردستی گھر میں داخل ہونے کے لئے اس کے گھر کا دروازہ نہیں توڑا۔

آگے بڑھی ہوئی اُن باہوں کو کسی نے تھاما ہوگا؟ یا اسے بھی اس کے گھر کے لوگوں کے پاس بھیج دیا ہوگا۔ یا اس کے اعضا کا سودا کرلیا گیا ہوگا۔ یا شاید اسے کسی رضا کار تنظیم نے یتیم بچوں کے کسی کیمپ میں چھوڑ دیا ہوگا۔ جہاں وہ بہت دن تک روئے گا۔ اور بڑا ہوکر جانے کون بن جائے گا۔

کچھ دن پہلے کسی ستم گر نے کچھ فارورڈ تصاویر ای میل کی تھیں۔ لباس پر پیش بند باندھے سکارف والی ایک خاتون ہاتھوں میں ایک نیم بے ہوش، تقریباً چار سالہ بچہ لئے دوڑ رہی ہے۔ دوسری تصویر میں اس کا کوئی عزیز بچے کو اس سے لیتے ہوئے پھٹی پھٹی آنکھوں سے عورت کے ایپرن پر لگ جانے والے خون کو دیکھ رہا ہے جو بچے کی کمر کے کسی تازہ زخم سے بہہ نکلا ہے۔ کچھ خواتین اور ایک ضعیف عورت سینہ کوبی کرتی ان کی جانب بھاگتی آرہی ہے جس کے عقب میں ایک پانچ چھے برس کا بچہ بھی دوڑ رہا ہے جس کے سویٹر پر ننھے ننھے ڈائناثور بنے ہوئے ہیں۔ تیسری تصویر میں گود میں لینے والا مرد آسمان کی طرف دیکھتا بلک رہا ہے۔ اس کے ڈھیلے پڑ چکے بازوؤں میں بچے کی بائیں جانب کو ڈھلکی گردن کے رخ پر سے دہانے سے خون اُمڈ کر بائیں کان کی طرف جارہا ہے اور بچے کی کھلی آنکھیں ساکت ہیں۔ آخری تصویر میں قالین پر رکھے چھوٹے سے جسدِ خاکی کے قریب جھکا ہوا دوسرا بچہ جس کے سویٹر پر ننھے ننھے ڈائناثور بنے ہوئے ہیں، زمین پر دراز بچے کی بے نور آنکھوں کو غور سے دیکھ رہا ہے کہ آنکھوں کی زندہ چمک سے

عاری وہ کالی پتلیاں جل کر بجھے دو ننھے ننھے گول کوئلوں سی معلوم ہوتی تھی۔کلوز اپ میں نظر آیا کہ دیکھنے والے بچے کے چہرے پر بھی دھماکے سے اُڑ آنے والے ریزوں نے خراشیں ڈال رکھی ہیں جن پر خون کی لکیریں جم چکی ہیں۔

ان تصاویر سے بھاگ کر کدھر جایا جائے۔

اس کہانی کی تصویریں کھینچنے والے کے دل پر کیا بیتی ہوگی اور اگر وہ زمین اور ہریالی کے ملے جلے رنگوں میں ملبوس باوردی بندوق برداروں کے ہاتھ لگ گیا ہوگا تو اس جرم کی پاداش میں اس کے جسم پر کیا گزری ہوگی۔ (میں سمجھتی تھی کہ خواتین امن پسند ہوا کرتی ہیں کہ خدا نے انہیں تخلیق کی عظمت عطا کی ہے اور دوسروں سے ممیز و ممتاز کر کے ممتا سے لبریز کیا ہے۔ گجرات میں عورتوں نے اپنی ہم صنفوں پر بھالے چلائے تھے۔ابوغرائب میں ان کی ہم مزاجوں نے کوئی کسر باقی نہ چھوڑی تھی۔سوچتی تھی کہ وہ ذہنی مریضائیں ہوں گی یا شاید اس کے پیچھے طاقت کی بھوکی اور انا کی ماری مردانگی ہو کہ عورت کی خمیر میں اس ستم شعاری کی موجودگی ذہن قبول نہیں کر پاتا تھا۔مگر اب کچھ سوچ نہیں سکتی کہ دنیا میں عجب طرح کے لوگ پائے جانے لگے ہیں)۔

کیوں یہ اشرف مخلوق طاقت پا کر یا طاقت حاصل کرنے کی خاطر خوں خار ہو جاتی ہے۔

اکیسویں صدی کے آہنی ڈائنا ثور ہواؤں میں بے خوف وخطر آگ اگلتے پھرتے ہیں۔

دراصل اِن ڈائنا ثوروں کو پالنے والوں کے لئے نسل کشی ہمیشہ سے ایک مشغلہ رہی ہے۔

بدنام زمانہ تجربہ جو ALABAMA کے سیاہ فام مفلس مریضوں پر سفید جلد والے نسل پرست ڈاکٹروں نے کیا تھا، چالیس سال تک جاری رہا تھا۔انیس سو بتیس سے سن بہتر تک۔ڈاکٹر جاننا چاہتے تھے کہ ان امراض کا علاج نہیں کیا گیا تو مریضوں کو کس کس طرح کی تکالیف ہو سکتی ہیں۔انہیں پینسلین کی سہولت میسّر نہیں رکھی گئی اور یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ مہلک امراض دوسروں میں بھی منتقل ہو سکتے ہیں بلکہ یہ کہا گیا کہ ان لوگوں کے خون میں خرابی پیدا ہوگئی ہے اور اس طرح بیماریاں پھیلتی چلی گئیں۔اور لوگ تباہ و برباد ہوتے گئے۔

اور یہ بھی خیال ہے کہ پچھلی صدی کی آٹھویں دہائی میں افریقی امریکیوں کو نیست و نابود کرنے کے لئے ایڈس جیسی مہلک بیماری کے جراثیم منظم طریقے سے ان سے متعارف کرائے گئے۔اب ان کی بے بسی کا تماشہ دیکھا جا رہا ہے۔جب ہی سے یہ خبریں بھی گاہے گاہے گشت کرتی رہی تھیں کہ یہ بیماری سیاہ فام نسل کو ختم کرنے کے لئے پھیلائی گئی ہے۔بندر سے انسان میں آنے اور افریقہ کے اندر

بہت پہلے سے موجود ہونے کا پروپیگنڈا بھی گویا جھوٹ ہی نکلا مگر پھر بھی شک کا فائدہ ملزم کو ہی پہنچتا رہا۔ وہی، 'تیغ منصف ہو جہاں دار و رسن ہوں شاہد'۔ والی بات!

یہی نہیں بلکہ اسے متعارف کرانے والوں کے پاس اس بیماری کا علاج بھی یقیناً ہوگا کہ اپنے تحفظ کا انتظام تو وہ کریں گے ہی اور اس علاج کو وہ نسل کشی جیسے اصول کے تحت دنیا میں عام بھی نہیں ہونے دیں گے۔

مگر آپ یہ باتیں ثابت کیسے کیجئے گا۔ جھوٹ اتنی دفعہ بولا جائے گا کہ سچ سمجھا جانے لگے گا۔ یہ بڑے بڑے حملے کئی کئی بار پلانٹ کئے جاتے ہیں۔ بے خطاؤں پر الزام دھرنے کی خاطر۔ بھلا بغیر الزام دھرے قہر برپا کرنے والی اس طاقت سے کبھی کوئی باز پرس کر سکا ہے جو اپنے جیسے گناہ گاروں کی پشت پناہی بھی کرتی ہے۔ پھر بے قصور پکڑے جاتے ہیں۔ اور بے قصور ہی پکڑے جاتے ہیں۔

کیا ہمارا اپنا کوئی قصور نہیں۔ کیا خود ہم میں تعلیم کا فقدان نہیں، جہالت نہیں، جنھیں اپنی طاقت سمجھ کر ہم ان پر تکیہ کئے بیٹھے تھے۔ (آخر کیوں کئے بیٹھے تھے؟)، وہ اپنی روغنی زمینوں کے نشے میں عیاش نہیں ہو گئے۔ کیا ہم میں ایسے نہیں جو بک گئے اور مذہب کے نام پر اپنی ہی نسلوں کو گمراہ کرتے رہے۔ معصوم زندگیوں کو بارود میں دھکیلتے رہے۔ یہاں تک کہ پوری قوم کی رسوائیوں کا سبب پیدا ہو گیا۔ اور اسی بہانے نسل کشوں کو ملک ملک ہلاکتوں کے منصوبے بنانا آسان ہو گیا۔ اور مزید آسان ہوتا جا رہا ہے۔

مگر کیا عام لوگ اتنے نادان ہیں کہ یہ عیاریاں نہ سمجھیں۔ نہیں۔ عام لوگ نادان ہوتے تو یہ باتیں باہر ہی نہ آتیں کہ وہاں سے بھی احتجاج کی آواز بلند ہوتی ہے۔ چاہے سیاسی اپروچ کچھ بھی ہو۔ وہاں سے انسانی حقوق کی پامالی پر شور بھی مچتا ہے۔ مظاہرے بھی ہوتے ہیں۔

بڑی طاقتیں سازشیں کرنے میں لگی رہتی ہیں۔ کہ صرف یہ خود محفوظ رہیں۔

مگر سیاسی فائدے کے آگے کسی شے کی کوئی وقعت نہیں۔ کبھی کبھی اپنے کچھ افراد کی بھی نہیں کہ عمارتوں کے درمیان سے جہازوں کے گزرنے کی سوچ سمجھ کر بنائی گئی متحرک تصاویر کے آگے چھوٹی چھوٹی مسرتوں کے سہارے زندہ رہنے والا عام انسان دھوکے میں آ ہی جاتا ہے۔ اور طاقت کے سوداگروں کی صرف طاقت میں ہی دلچسپی ہے۔ جینوسائڈ کرنے میں انہیں کوئی برائی نہیں نظر آتی۔

طاقتیں عجیب عجیب کھیل بھی کھیلتی ہیں۔ بہت پہلے ایک فلم آئی تھی کہ کوئی سفید چہرے والا ادھیڑ عمر شخص، آنے والے دنوں کا حال بتاتا ہے۔ کتابیں چھپی تھیں کئی زبانوں میں۔ جو بھی اہم واقعات گزرے تھے ان کی پیشن گوئیاں ان کتابچوں میں اسی شخص سے منسوب کر کے درج کی گئی تھیں۔ اور جو

نئے واقعات ہوتے تھے، نئے اڈیشنز میں ان کا اضافہ کر دیا جاتا تھا کہ فلاں ہستی کے قتل کی اس آدمی نے پیش گوئی کر رکھی تھی۔ اِس زلزلے کی، اُس سیلاب کی وغیرہ وغیرہ۔ اور آخری پیش گوئی یہ تھی کہ دنیا کے سب سے طاقت ور ملک کے ایک اہم ترین شہر کو ریگستانوں میں بسی ایک بادشاہت کی تجربہ گاہوں سے بٹن دبا کر ختم کر دیا جائے گا۔ یہ بات ایسے جواز دے کر ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ عام آدمی یقین کر لے اور اس کے دل میں ناپسندیدگی قائم ہو۔ اور ایسا ہوا بھی۔ مگر یہ سیاسی کھیل کھیلنے والے بھی تو انسانوں جیسے نظر آتے ہیں۔ کسی نہ کسی کے لئے تو وہ نرم گوشہ رکھتے ہی ہیں۔ پیشہ ور قاتل بھی تو کسی نہ کسی کو عزیز رکھتا ہوگا۔ لیکن سیاست اور انسانیت اب ایک جگہ نہیں نظر آسکتی۔ یہ طاقت کا نشہ زہریلا ہوتا ہے۔ جو نشے کے شکار کو نہیں، دوسروں کو ہلاک کرتا ہے۔ یہ نشہ ہی ہے جو اِس وقت ایک مخصوص فرقے کے خلاف باقی دنیا میں نفرت پھیلانے کا منصوبہ بند پروگرام چلا رہا ہے۔ کہ ان زمینوں کے ذخائر پر قابض ہو کر مزید طاقت ور ہو جائے اور اس کے بعد ساری دنیا کو بھی اپنے قبضے میں لے لے۔

ابھی چار ایک صدی پہلے تک صدیوں سے آباد، ریڈ انڈین اب صرف تصویروں میں ہی نظر آتے ہیں۔ ان کے درمیان اُن مہلک بیماریوں کے کیمیاوی جراثیم لے جا کر پھیلائے گئے جن کے تئیں وہاں کے باشندوں کے اندر کوئی مدافعتی نظام موجود نہیں تھا۔ انہیں خسرے اور چیچک جیسی بیماریوں کا کوئی علم تھا نہ کسی موسمی بخار کا تجربہ۔ اور ان کے قبیلوں کے قبیلے فنا ہوتے گئے۔ اصل النسل امریکی تو وہی تھے جن کا صدیوں سے یہی خطہ مسکن رہا تھا۔ جنھیں سولہویں اور انیسویں صدی کے درمیان منظم طریقوں سے ختم کیا جاتا رہا۔ پھر وہ نیٹو کہلائے (جیسے آزادی سے پیشتر برِ صغیر کے عوام کے لئے سفید چہروں والے لوگ کہا کرتے تھے)۔ ان Aborigines کو کولونسٹس کے ہاتھوں رفتہ رفتہ ختم ہونا پڑا کہ انہیں ان کی زمینوں سے بے دخل کر دیا جاتا، غلام بنایا جاتا، گھر چھوڑ کر کسی اور جگہ بسنے کو کہا جاتا پھر وہاں انہیں مختلف بہانوں سے قتل کیا جاتا۔ کیا تاریخ اٹھارہ سو اڑتیس میں ہوئے Trail of Tears کی اصطلاح کو فراموش کر سکتی ہے۔ یا کیا تاریخ دان، Wounded Knee massacare جیسے واقعات بھول جائے گا۔ کیا عام انسان کے ذہن سے یہ چیزیں محو ہو سکتی ہیں۔ ابھی کچھ سال پہلے تک ان کے بوسٹن شہر میں داخل ہونے پر پابندی تھی۔ ایسے ہی جیسے کوئی چھ دہائی پہلے تک ہماری اپنی سرزمین پر تفریح گاہوں کے باہر Indians and dogs not allowed لکھا رہتا تھا۔

شملہ کے انسٹیٹیوٹ آف ایڈوانس سٹڈیز کی گھنے جنگل سے گھری پر شکوہ عمارت کے کمروں میں ایک دیوار پر میں نے ایک تصویر دیکھی تھی۔ جب کی تصویر، جب فوٹو کھینچنا نیا نیا ایجاد ہوا تھا۔ ٹم ٹم کے

قریب صافہ پہنے، کمر بند باندھے اپنی ہی سرزمین پر ایستادہ ایک نوجوان، ٹم ٹم سے اتر رہی ایک سفید فام خاتون کے قدموں کو اپنے ہاتھوں سے سہارا دینے کے لئے تیار کھڑا ہے۔ ٹم ٹم پر سوار دوسرے لوگ کسی بات پر ہنس رہے ہیں اور نوجوان کے وجیہہ گندمی چہرے پر مجبوری، احساسِ ذلت اور بے بسی کے ایسے تأثرات ہیں جو اُس زمانے کے کیمرے کی کمزور آنکھ سے بھی پوشیدہ نہیں رہ سکے۔

کون کس سمت کو جا رہا ہے۔ کچھ سمجھ نہیں آتا۔ ہوسکتا ہے اوباما کے آنے سے دنیا کا سیاسی منظر نامہ بدل جائے اور سکون کے خواب سچے ہوتے نظر آئیں۔ یا خاتون آئے اور انسانیت کو سیاست پر ترجیح دے دے۔ مگر کون جانے۔ سیاست دان اپنے ملکوں کی حکمتِ عملیاں کہاں تبدیل کرتے ہیں۔ بڑی ہمت چاہیے صدیوں سے رائج چلن بدلنے کے لئے اور بڑی صدق دلی درکار ہوگی خم دار راستوں کو صراطِ مستقیم کی جانب موڑ کر انسانی بقا کی خاطر قدم بڑھانے کے لئے۔ ضرورت صرف جذبۂ خلوص کی ہے۔

کہانیوں کے بارے میں کیا عرض کروں۔ اس سے پہلے والے مجموعے کی دو کہانایاں بھی شامل کر دی ہیں کہ کئی منظر آنکھوں میں رہ جاتے ہیں اور بھلائے نہیں بھولتے۔

ترنم ریاض

C-11. Jungpura Extention,
New Delhi-110014

◆❖◆

حضرات و خاتون

عاصمہ بیگم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں ۔۔اف ۔۔کیا خواب تھا۔۔

انہوں نے داہنی اور بائیں جانب نظر ڈالی۔پھر سامنے کھڑکی کے باہر کی طرف دیکھا۔ملحقہ غسل خانے سے بہتے نل کے شور میں سے سلمان صاحب کے ناک سڑکنے کی آواز ابھری تو انہوں نے اطمینان کا سانس لیا اور مسہری سے اٹھ کر پیروں کے انگوٹھوں کو نرم سے سلیپروں کے اوپر لگے کسی مخمل نما سیاہ رنگ کپڑے کی قوس میں پرویا اور اندر کی جانب چل دیں۔اس سے پہلے وہ بیدار ہوتے ہی برآمدے میں نکل کر آسمان کی جانب ایک نظر دیکھا کرتی تھیں اور پھر سیاہی مائل سبز روشنی میں نیم عیاں سی ہریالی کے اندر جھانکتے چھپتے طیور کو دیکھنے اور سننے کی کوشش کیا کرتیں۔مگر آج وہ دونوں بیٹوں کے کمروں کے دروازوں کے دستوں کو باری باری چھو کر لوٹ آئیں۔دستے برف ہو رہے تھے۔یعنی ائر کنڈیشن کی ٹھنڈک میں وہ دونوں اطمینان سے سوتے رہے ہیں اور خواب جھوٹا تھا۔کہیں کوئی میڈیا والا کیمرے کے توپ خانے، شانے پر دھرے ان کے شوہر کی گاڑی کے درپے نہیں تھا۔نہ ہی ان کے بیٹوں کے دوست آنکھوں میں شرارت بھرے سوالات لئے گھر کے پھاٹک کے باہر اپنی موٹر سائیکلوں اور گاڑیوں میں منتظر

کھڑے تھے۔ عاصمہ بیگم نے مطمئن ہو کر شب خوابی کی آدھی آستین والی ریشمی عبا میں چھپے شانے سے اپنا رخسار سہلایا۔ انہیں بے سبب ہی ایسا محسوس ہوا تھا جیسے وہاں پسینے کا قطرہ ہو۔

باورچی خانے سے لگے احاطے میں رکھی کھانے کی میز والی ایک کرسی کھسکا کر وہ اس پر ٹک گئیں اور اپنے لئے چائے بنانے لگیں کہ پیالہ لے کر وہ برآمدے کی طرف جانے والی تھیں۔ ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال تھا کہ سلمان باہر آئیں تو وہ چائے کی کشتی باہر منگوا لیں۔ مگر دماغ کا باقی حصہ سوچوں میں غرق تھا۔ ان کے پاس وقت بہت کم تھا۔

''مین ساب (میم صاحب)۔۔''

کرسی کھنچے جانے کی آواز سے سندری باورچی خانے کے اندر سے نکل آئی۔

''تا جی گڑ مل گئی مین ساب۔۔''

اس نے چھوٹی سی سفید بے داغ کشتی میں رکھی شفاف کانچ کی کٹوری میں گڑ کی ڈلی کو چور کر رکھا تھا اور چمچماتی ہوئی کسی دھات کے منقش چمچ میں بھر کر اس نے یہ چورا عاصمہ بیگم کی پیالی میں انڈیل دیا۔

''ابھی چھوڑ دو یہ نقلی چینی کھانا مین ساب۔۔ ساب بولے تھے نا۔ ہڈی کا بیماری ہوتا ہے اس سے۔''

اس نے شکر دان اٹھا کر دوسری جانب رکھ دیا۔ وہ عاصمہ بیگم کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

''ہاں ٹھیک ہے۔۔ سنو تم۔۔ میں نے سوچ لیا ہے۔۔ وقت بہت کم ہے۔۔''

وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئیں تو سندری جو جھک کر اُن کے پیالے میں چمچہ چلا رہی تھی، پیالہ ہاتھ میں لئے سیدھی ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔ عاصمہ بیگم باہر برآمدے کی طرف چلیں اور سندری ان کے پیچھے پیچھے۔

''وہ جو اس طرف کا راستہ ہے نا۔۔ وہ ادھر سے۔۔''

عاصمہ بیگم نے باہر کی طرف راستے کے رخ پر بانہہ پھیلائی۔

''تم ادھر۔۔ اد۔۔ دھر دوسری اور مڑ جانا۔۔ بالا جی ٹینٹ ہاؤس کے۔۔ سامنے۔۔ وہی جس کے بورڈ پر سہرا باندھے دولہے کی تصویر بنی ہے نا اور لکھا ہے کہ۔۔ اوفو۔۔ تم پڑھ بھی تو نہیں سکتیں نا۔۔ اچھا تو اس کے سامنے جہاں پولیو کے ٹیکے کا اشتہار۔۔ بھئی جہاں ایک چھوٹے سے بچے کے منہ میں دوائی کا قطرہ ٹپکایا جا رہا۔۔''

''جانتی ہے پولیو۔۔ مین ساب۔۔ میرے کو بچپن مے ہوئی تھی نا تو۔۔''

سندری نے پرچ پیالی پتھریلی سفید میز پر رکھ دی۔ عاصمہ بیگم اپنے دادا بزرگوار کے زمانے سے گھر میں پی جانے والی 'ارل گرے' چائے کی سحر انگیز سی خوشبو کو بمشکل تمام نظرانداز کر کے جلدی سے بولیں۔

''اچھا؟۔۔اچھا اچھا۔ تو پہلے میری بات سن۔۔اس کے پاس ایک ریڈ کراس۔۔میرا مطلب ہے سرخ رنگ کا ایسا نشان بنا ہوا ہے۔''

انہوں نے بائیں ہاتھ کی پہلی انگلی پر شہادت کی انگلی آڑی رکھ کر سندری کی آنکھوں کو دیکھا۔

''ایسا۔۔کچھ سمجھی بھی کہ میں یوں ہی۔۔وہاں پر نچلی منزل میں ہی۔۔''

''ہاجی مین ساب مے سب سمج گیا۔۔''

''خاک سمجھ گیا۔۔بیس بار بھی بتائیں جب بھی بھول جاتی ہے۔۔''

عاصمہ بیگم بید کی تیلیوں سے بُنی گئی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

کوئی سال بھر پہلے ایک شام گھریلو ملازمین مہیا کرنے والے کسی ادارے کی طرف سے ایک ملازمہ کو بھجوایا گیا تھا۔لڑکی کی عمر کا کچھ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا، تاہم وہ نوجوان ہی معلوم ہوتی تھی۔چھوٹا سا دبلا پتلا جسم، گہرے سے کچھ کم سانولا رنگ، نمایاں ہڈیوں والا لمبا چہرہ، چھوٹی آنکھیں جن کی پتلیاں دو زاویوں سے دیکھتی تھیں۔سیاہ بالوں میں کچھ سفید بالوں کی لکیریں بھی تھیں اور دانت کچھ بڑے اور لمبے تھے۔

''کہاں رہتی ہے۔۔؟''

عاصمہ بیگم نے ساتھ لانے والے آدمی سے پوچھا اور لڑکی کی جانب ایک نظر ڈال کر اپنے دو سال پرانے باورچی کی طرف دیکھا۔کمل نے سیکنڈ بھر سے بھی کم وقفے میں آنکھیں پھیلا کر شانے اچکائے اور ناک سکیڑ کر منہ دوسری طرف موڑا۔یعنی وہ لڑکی سے خوف زدہ ہونے کے ساتھ ساتھ ناپسندیدگی بھی ظاہر کر رہا ہو۔

یہ تأثرات دیکھ کر عاصمہ بیگم نے دوبارہ لڑکی کی جانب نظر اٹھائی۔برابر کے صوفے پر کچھ دن کے لئے آئی عاصمہ بیگم کی بزرگ والدہ بیٹھی تھیں۔اپنے موٹے سے چشمے کے عقب سے انہوں نے سب کی طرف باری باری دیکھا۔

''کیا نام ہے بیٹی۔''

انہوں نے نرم سی نگاہ لڑکی کی طرف ڈالی۔ لڑکی کے لئے غالباً باورچی کے تاثرات اور عاصمہ بیگم کی سوچتی ہوئی نظروں جیسی چیزیں اجنبی نہ تھیں۔ وہ اس ساری فضا کے زیر بار کچھ منمنائی جسے کوئی نہ سمجھ سکا۔

''اچھا اچھا۔۔ ماں باپ ہیں۔۔؟''

اماں نے گویا نام کی تعریف میں سر ہلایا۔

''میرا ماں نہیں ہے۔۔ سوتیلا ماں ہے۔''

اس دفعہ لڑکی کی آواز واضح تھی جسے سن کر لانے والے شخص سمیت سب لوگ چونکے تھے۔

''اوہ۔۔ اچھا اچھا۔ کوئی بات نہیں۔ جا ہاتھ منہ دھولے۔''

والدہ صاحبہ نے برآمدے کی بائیں جانب اشارہ کیا۔

''پہلی بار سہر آئی ہے نا تو اس کو بھاسا نہیں آتا۔۔''

ساتھ لانے والے شخص نے کہا۔

''آپ کو بہت اچھا بھاشا آتا ہے۔۔''

کمل آنکھوں میں شرارت چھپائے سنجیدگی سے بولا۔ عاصمہ بیگم نے اسے جیسے کہ تنبیہاً دیکھا۔

''مگر سیکھ جائے گی۔۔''

وہ جلدی سے بولا۔ غالباً کمل کا طنز جس کی زبان اس عرصے میں خاصی صاف ہوگئی تھی، اس کی سمجھ میں نہ آیا تھا۔

''میں بھی پچھلے سال آیا تھا جھارکھنڈ سے۔۔ میں نے بھی ادھر ہی سیکھا ہے بھاسا۔''

وہ مسکرایا۔

''تم لوگ اس کی صورت کی وجہ سے اس بن ماں کی بچی کو۔۔''

والدہ صاحبہ نے کمل کی طرف جیسے کہ افسوس سے دیکھا ہو۔

''نہیں اماں جی۔۔ میں تو۔۔''

وہ کچھ شرمندگی سے بولتا ہوا پچھواڑے کی طرف گیا۔

''اور تم میری بیٹی۔۔ اکیلی ہو دیکھا جائے تو۔۔ اللہ نے تمہیں بیٹی نہیں دی۔۔ اسے اپنا لو۔ تمہارا ساتھ دے گی۔۔''

''جی امی مگر اسے کام بھی نہیں آتا۔۔ زبان بھی اچھی طرح نہیں سمجھتی۔۔''

''سیکھ جائے گی۔۔ پہلی بار شہر آئی ہے۔۔ غریب۔۔ یتیم بچی۔۔''

والدہ صاحبہ کی آواز میں درد سا ابھر آیا تھا۔ وہ کچھ کہنے جا رہی تھیں کہ کمل جیسے کہ تیزی سے اندر داخل ہوا۔

''میم صاب جی۔۔ میں باہر الگنی سے کپڑے اٹھانے گیا ناجی تو۔۔ وہ بال بنا رہی تھی۔۔ دوسرے دروازے کے پاس۔۔''

''تو۔۔؟ کیا ہوا۔۔ بال نہیں بنانے چاہئیں اسے۔۔''

''وہ۔۔ کچھ اندھیرا سا ہے ناجی تو۔۔ میں تو ڈر گیا جی۔۔ ایک دم بھوتنی کے جیسی لگ رہی تھی جی۔۔''

والدہ صاحبہ اسے دیکھتی رہ گئیں۔

''چپ۔۔ اللہ نے بنایا ہے اسے۔۔ سوتیلی ماں ہے اس کی۔۔ جانے بھر پیٹ کھانے کو ملتا بھی ہو اُسے۔۔ کمزور سی ہے بیچاری۔۔ کھائے پئے گی ٹھیک ہو جائے گی۔۔ ایسی تکبر کی باتیں نہیں کیا کرتے۔''

والدہ صاحبہ کچھ خفگی سے بولیں اور دیوار پر آویزاں گھڑی کو بغور دیکھنے کی کوشش کرنے لگیں۔ پھر صوفے کے بازو کا سہارا لئے جھرّیوں والے گورے ہاتھ کی پتلی پتلی انگلیوں سے تسبیح کے دانے گھماتیں کھڑی ہوئیں اور اندر کی طرف مڑ گئیں۔ رومن ہندسوں والی اس گھڑی پر انہیں وقت دیکھنا نہیں آتا تھا اور گھڑی کی جانب دیکھ کر وہ وہاں پر موجود کسی سے بھی وقت پوچھا کرتیں۔ اس وقت انہوں نے کسی سے کچھ نہ پوچھا اور خاموشی سے اندر چلی گئیں۔

لڑکی کو ملازم رکھ لیا گیا۔

اس کا نام سندری تھا۔ زبان ہی جانتی تھی نہ کام۔ مگر والدہ صاحبہ جب تک رہیں اس نے ان کے سارے کام کرنے کی بھرپور کوشش ضرور کی۔ ان کے معمول میں رات گئے تک عبادت کرنا شامل تھا۔ اور سندری اکثر دیر رات تک ان کے فارغ ہونے کا انتظار کر کے ہی سوتی کہ اگر انہیں کچھ ضرورت ہو تو وہ پریشان نہ ہوں۔ ملازمین کے کمرے گھر کے پچھواڑے تھے اور والدہ صاحبہ کے کمرے کا ایک دروازہ پچھلے برآمدے میں بھی کھلتا تھا۔ سندری اس دروازے پر دستک دیتی۔ والدہ صاحبہ کی زبان اکثر وظیفے میں مصروف ہوتی اور ہاں ہوں کی آواز سے کلام کا کام لیا جاتا۔ جس میں اشارے بھی شامل ہوتے۔ چٹکی کی شکل میں انگلیاں دہانے کی جانب لے جانا چائے کے لئے اور ہتھیلی کے قریب کلائی کا حصہ ٹھوڑی سے چھو لینا پانی کا اشارہ تھا۔ وہ پانی گرم پیا کرتی تھیں اور اکثر یہی دو چیزیں ان کو ضرورت ہوا کرتیں۔

کبھی کبھار سردی لگنے کی صورت میں گرم پانی کی تھیلی کا اشارہ شانے سکیڑ کر، دانتوں کو بجا کر کیا جاتا۔

''کہا تھا نا۔۔سب سیکھ جائے گی۔۔''

والدہ صاحبہ اس کی تعریف کرتیں تو کمل ان کی غیر حاضری میں عاصمہ بیگم کی طرف جیسے کہ بے بسی سے دیکھتا۔

''یہ کام تو کوئی گونگا بھی کر سکتا ہے نا میم صاحب جی۔''

''تمہارا ہر بات میں بولنا ضروری ہے کیا۔۔''

عاصمہ بیگم مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کرتی دھیرے سے کہتیں۔

''نہیں جی میں تو۔۔''

سندری ایماندار تھی۔اور صاف ستھری رہا کرتی تھی۔اس کے سیاہ فام پیروں کی ایڑھیاں سفیدی مائل نظر آتیں اور چپل چم چم کرتے۔

مخصوص دلچسپ تاریخ کے حامل اپنے علاقے کے بارے میں وہ بڑی دلچسپ باتیں سنایا کرتی۔

''ے یو ہا اچھا پکا تا ہے معلوم۔۔؟''

اس نے ایک دن کمل سے کہا تھا۔

''کیا۔۔؟ کیا پکا تا ہے؟''

پنیر بھونتے ہوئے کمل کے ہاتھ سے کڑھائی میں چمچہ چھوٹ گیا تو تیل کے گرم چھینٹوں سے وہ بلبلا اٹھا تھا۔مگر اس بات میں اس کی دلچسپی جب بھی کم نہ ہوئی تھی۔اس نے کلائی بہتے ہوئے نل کے نیچے چھوڑ دی۔

''کیا کہتی تھی تُو۔۔پھر بول۔۔''

وہ اس کی طرف گردن موڑے بولا۔

''چوہا۔۔بولا تھا۔۔چوہا پکا تا ہے۔۔ے۔۔ہمرا گاؤں میں ایکدم موٹا ہوتا ہے۔۔''

وہ سر جھکائے پالک کے ساگ سے پتے الگ کرتی رہی۔

عاصمہ بیگم نے کھلے نل کی مسلسل آواز سنی تو باورچی خانے میں آ گئیں۔

''کیوں پانی ضائع۔۔۔کیا ہوا۔۔اوہ۔۔ہاتھ جلا لیا۔۔''

وہ جلدی سے نل کے قریب گئیں۔

''آبلہ تو نہیں پڑا۔۔نا؟''

''نہیں میم صاب۔۔بچ گیا میں تو ابھی۔۔مر جاتا جی۔۔''

''کیوں۔۔کیا ہوا؟''

''آپ میم صاب اس سے پوچھئے نا۔۔''

اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیا تم ہر وقت اس کی جان کے پیچھے لگے رہتے ہو۔۔کیا ہوا تھا سندری۔۔؟''

''کچھو نہی مین صاب۔۔مے کچھو نہی کیا ہوں۔۔''

وہ بے خبری کمل کو دیکھ کر بولی۔

''جرا بتانا میم صاب کو تو کیا پکاتی ہے۔''

''اچھا وہ۔۔مے چوہا بوت اچھا پکاتا ہے۔۔میرا نانی کھاتا تھا۔۔اسی نے سکھایا تھا۔۔اور کیا پکاتا۔۔ادھر پشو پکھشی تو کھتم ہو گیا ہے نا۔''

عاصمہ بیگم اسے حیرت سے دیکھتی رہ گئیں۔

''تو بھی کھاتا ہے۔۔؟''

کمل جلدی سے بولا تو عاصمہ بیگم زور سے ہنس پڑیں۔

''مے نہی کھایا۔۔''

سندری سر اٹھا کر دونوں کو باری باری دیکھ کر مسکرائی اور دوبارہ کام میں مشغول ہو گئی۔

''چکھا تو ہو گا نا پکاتے وقت تو نے بھی۔۔''

کمل چھوٹے سے تولئے سے ہاتھ پونچھتا ہوا بولا تو عاصمہ بیگم مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہوتی باورچی خانے سے باہر نکل آئیں۔

کمرے میں پہنچ جانے کے بعد تک ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ چھائی رہی۔

سلمان صاحب نے اُس خطے کے بارے میں بڑی دلچسپ باتیں بتائیں تھیں۔

ہندوستانی جزیرہ نما کے چھوٹا ناگ پور کی سطح مرتفع میں وسطی بھارت کا یہ حصہ ہمیشہ سے دلچسپیوں کا حامل رہا تھا۔برِصغیر کے مختلف جغرافیائی خطوں سے ہجرت کر کے اس ایک جگہ پر جمع ہونے والے قبائل کی موجودگی کے سبب یہاں کئی طرح کی زبانیں، تہذیب، جسمانی خدوخال وغیرہ یکجا نظر

آتے۔مگر انسانی تہذیب کے محققوں اور سیاسی تجربوں نے ان کی اصل تہذیب کو کافی حد تک متاثر کیا۔

برطانوی حکومت نے یہاں بھی لوگوں کو اپنا وفادار بنانے کی غرض سے عیسائیت کو متعارف کرایا تھا۔جس کی شروعات وہاں کوئی ڈیڑھ سو برس پہلے جرمنی کے چار پادریوں نے اپنا گرجا گھر قائم کر کے کی تھی۔ رفتہ رفتہ دوسرے اعتقادات کے گرجے بھی جن میں 'اینگلی کنز' اور 'رومن کیتھولک' شامل تھے اپنے قدم جمانے لگے۔اور یہاں کے باشندوں میں اکثر کے معبد جو 'سارانا' کہلاتے تھے۔گرجا کہلانے لگے کہ پادری بپتسمہ کے وقت ان کے نام کی طرز ہی بدلتے تھے، نہ رہن سہن کے طور طریقوں کو تبدیل کرنے پر زور دیتے تھے۔اس لئے بظاہر تبدیلی کچھ ایسی نمایاں اور اچانک معلوم نہیں ہوتی تھی۔ روزگار کا واحد ذریعہ زمینیں تھیں جو انگریزی قانون کے تحت سرکار کی ہوگئی تھیں۔اس لئے روزگار کے متبادل وسیلے پیدا کرنے والی سرکار کے مذہب کو اپنالینا رعایتوں کا باعث ہونے سے رجحان بھی بڑھا۔

ان سب باتوں کو سمجھنے والوں کی بھی کچھ ایسی کمی نہیں تھی بلکہ برسامنڈا نے جسے قبائلی عقیدت سے برسا بھگوان کہتے تھے، عیسائیت کے اس طرح اطلاق کے خلاف آواز بھی اٹھائی تھی جو بعد میں وہاں قومی آزادی کے لئے بغاوت کے دوران نعرے کے طور پر ابھری۔آگے چل کر کچھ حد تک تعلیم و تربیت کی طرف بھی رجوع کیا گیا۔جو اہم بات تھی۔

باورچی خانے سے کچھ گرنے کی آواز آئی تو عاصمہ بیگم کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

سندری کام سنجیدگی سے کرتی تھی۔مگر غلطیوں کی تعداد کام سے زیادہ ہو جاتی۔اس کے الٹے سیدھے کاموں سے عاجز عاصمہ بیگم کمل کو بلاتی تو سندری برتن دھونے والے صابن سے لتھڑے ہاتھ لئے حاضر ہو جاتی۔

''کمل بھیا باجار گئی۔۔ے برتن دھوتا ہوں۔''

''اچھا۔۔جا۔۔دھو برتن۔۔دھو چکے تو یہاں آجانا۔''

عاصمہ بیگم سرخم کرکے اسے دیکھتیں۔

''کیا توڑا سندری۔۔''

عاصمہ بیگم ٹوٹ پھوٹ کی صدا پر چونک کر کہیں سے پکار اٹھتیں۔

''او اِکلا گلاس چھ میں سے بچا تھانا۔۔او اِی ٹوٹا۔۔''

سندری عاصمہ بیگم کے باورچی خانے میں پہنچ جانے پر ٹوٹے گلاس کا پیندا حاضر کرتی ہوئی

اطلاع دینے کے انداز میں کہتی کوڑے دان کی جانب لپکتی۔

''کیوں سندری۔۔ تیرے ہاتھ کیا کانپتے ہیں۔۔ کچھ نہ کچھ توڑتی رہتی ہے۔''

''وہ مین صاب۔۔ میرے کو چھوٹے میں پولیو ہوگئی تھی نا۔۔ میں چلتا نہی تھا ایک دم۔۔ پھر دوائی کھایا۔۔تب ٹھیک ہوا۔۔''

''اوہ ہاں۔۔ پولیو ہوا تھا۔۔اب تو ٹھیک ہونا۔۔؟''

عاصمہ بیگم ٹھنڈی سانس لے کر رہ جاتیں۔

''ٹھیک اے ہوں۔۔نیکل (لیکن) کبھی کبھی۔۔''

''اور۔۔یہ۔۔یہ کیا ہے۔۔؟''

عاصمہ بیگم نے برتنوں کی الماری کے قریب اپنی پسندیدہ نیلے گلابی پھولوں والی نہایت باریک چینی کی رکابی کے بیل کی ساخت میں ترشے سنہرے کنارے کا کونا ٹوٹا دیکھ کر حسرت سے پوچھا۔

''او۔۔یہ۔۔جانتا نہی۔۔کمل بھیا توڑی ہوگی۔۔مے نہی کیا۔۔''

اس نے برتن دھوتے گردن موڑ کر بڑے بھول پن سے جواب دیا تو ہاتھ میں پکڑے دھل رہے گلاس کا کنارہ نل سے ٹکرایا۔

''اوہ۔۔سنبھل کے۔۔''

عاصمہ بیگم ہاتھ ہلا کر رہ گئیں۔

''سوری مین صاب۔۔میں آپ کو ایک بات بتانا بھول گیا تھا۔۔''

اس نے بڑی شرمندگی سے سر جھکا کر ٹوٹے کنارے پر انگلی پھیری۔

''نہیں نہیں۔۔ہاتھ کٹ جائے گا۔۔''

عاصمہ بیگم نے گلاس اس سے لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔اس کی زبان سے 'سوری' سن کر ان کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔وہ کمرے میں لوٹ آئیں۔

''سندری کتنی بار سکھایا ہے۔۔چادر سیدھی بچھایا کر۔۔''

''سیدھے اِی ہے نا مین صاب۔۔اے دیکھو۔آپ اُدھر سے ذرا سا۔۔''

وہ بڑے یقین سے کہتی اور چادر کا کنارہ ہلکے سے کھینچتی۔

اس کی خود اعتمادی سے عاصمہ بیگم کو مسرت سی ہوتی۔

ملک کے آزاد ہوتے وہاں کے مختلف گرجا گھروں میں الگ الگ قبائل کے مقامی پادری بھی چن لئے گئے تھے۔ اور ۱۹۴۹ء میں علیحدہ جھارکھنڈ ریاست کی مانگ کرنے والے تقریباً سبھی لیڈر مقامی عیسائی تھے۔

۲۰۰۰ء میں اسے بہار سے علیحدہ کر دیا گیا۔

سوائے حق رائے دہی کے عام طور سے یہاں کے باشندوں کے لئے حالات کچھ زیادہ نہیں بدلے۔ مختلف سیاستیں کبھی مذہب کا رنگ چڑھانے کے نعرے سے وفاداری طلب کرتی رہیں، تو کبھی مذہب کا رنگ اتارنے کی اہمیت پر زور دیکر ساتھ مانگتیں۔ اور روزگار کا مسئلہ وہیں کا وہیں۔

اس مسئلے سے سندری جیسے لوگ بھی دوچار تھے۔

سلمان صاحب نے بتایا تھا۔

سندری کمرے سے جا چکی تھی مگر عاصمہ بیگم کی آنکھوں میں اس کا چہرہ گھومتا رہا۔ اچھی غذا سے اس کے رخساروں میں چربی بڑھ گئی تھی جس کے سبب چہرے کی جلد کچھ کھچ جانے سے اس کا رنگ ذرا صاف نظر آنے لگا تھا۔ ہنستے ہوئے اس کے صاف ستھرے دانت اب بھرے سے چہرے کے تناسب میں زیادہ بڑے نظر نہیں آتے تھے۔ دو زاویوں سے دیکھتی ہوئی آنکھیں جیسے کہ اس کے نادانی کی حد تک پہنچے بھول پن میں اضافہ کرتی معلوم ہوتیں۔ عاصمہ بیگم باورچی خانے میں چلی جاتیں۔

''ہم تم کو آنکھوں کی کثرت سکھائیں گے۔۔''

انہوں نے سندری کی آنکھوں کی طرف دیکھا۔

''آنکھ کو کیا ہوگا مین صاب۔۔''

''آنکھیں سندر ہو جائیں گی۔۔بس جب بیٹھا کرو تو۔۔ ہاتھ کی پہلی انگلی کے ناخن کو دیکھتے ہوئے ناک کی سیدھ میں آنکھ کے قریب لانا اور دور لے جانا۔''

''مین صاب ے آپ کو ایک بات۔۔ بتانا تھا۔۔''

''ہاں۔۔کون سا بات۔''

''میں جب چھوٹا تھا نا۔۔تو اندھی ہو گیا تھا۔۔''

وہ خوش خبری سنانے والے انداز میں ہنستی ہوئی بولی۔ میرا موسا جی بولا باجا (ریڈیو) ادھر

دو۔۔تو میں ان کے اوپر گر گیا۔۔وہ میرے کو ڈانتا کہ دیکھتا نہی۔۔''

وہ کچھ سنجیدگی سے بولی۔

''دیکھو نا مین صاب۔۔وہ مجھے کیوں نہیں بتایا کہ مے گلتی چل رہا تھا۔۔ مے تو اندھا ہو گیا تھا۔۔اس کو تو بولنا تھا نا کہ تو اندھی ہو گیا ہے۔۔میرے کو ای بولتا رہا۔۔میرا گلتی تو نہیں تھا۔۔میرے کو تو پتہ ای نی تھا کہ میں اندھی ہو گیا ہے۔''

وہ عاصمہ بیگم کے چہرے پر اپنی بات کا ردِعمل تلاش کرنے کی غرض سے مزید سنجیدگی سے انہیں دیکھنے لگی تو عاصمہ بیگم کا مارے ہنسی کے برا حال ہو گیا۔اور انہیں ہنستا دیکھ کر وہ بھی ہنسی میں شامل ہو گئی۔

''تجھے بھی تو پتہ چلا ہو گا نا کہ تو اندھی۔۔''

عاصمہ بیگم نے ہنسی روک کر ذرا دیر کو سانس لی۔

''اچھا پھر۔۔ٹھیک کیسے ہوئی۔۔؟''

انہوں نے قہقہے کو بمشکل تمام روک کر پوچھا۔

''پھر؟ پھر ٹامن (وائٹامن) دوائی دیا ادھر دور کا گاؤں میں دوائی والا (سرکاری دواخانہ) **بیٹھتا** ہے نا۔۔اوای دیا۔۔ایک ہی مہینہ کھایا۔۔مے ٹھیک ہو گیا۔۔''

کمل کے گھر سے فون آیا کہ اس کے ہاں بچہ ہوا ہے۔حالانکہ وہ اپنی اس سال کی چھٹیاں گزار آیا تھا۔مگر اسے چھٹی دینا پڑی۔بلکہ اس کے لوٹنے کے بارے میں بھی کچھ غیر یقینی والی صورتِ حال تھی کہ پچھلے سال اس کا پہلا بچہ بچ نہیں پایا تھا۔دوسرے ملازم کا انتظام کیا جانے لگا۔سندری تنِ تنہا سارا کام سنبھالنے کی بھرپور کوشش کرتی رہی۔

عاصمہ بیگم نے دیکھا اس کا چہرہ اتر گیا تھا۔انہوں نے اس کی کلائی ٹٹولی۔

''بخار تو نہیں ہے تجھے۔۔پیلی پڑ گئی ہے۔۔کیوں؟ کام زیادہ ہو گیا نا تیرے ذمے۔۔''

انہوں نے نرمی سے کہا۔

''کام تو ٹھیک اے ہی ہے مین صاب۔۔نِکل۔۔جب سے شام بھیا گئی ہے۔۔مے۔۔کچو کھانے نہی سکتا۔۔''

وہ اداس سی آواز میں بولتی کام میں مصروف رہی۔

کچھ دن بعد بڑے چوڑے جبڑوں، پھیلی ناک، بھدی آواز اور چہرے پر بے شمار دانے لئے ایک اور آدی واسی ملازم آیا، کوئی بیس بائیس سال کا۔ اس کا نام فلتوش تھا اور وہ بھی شہر پہلی بار وارد ہوا تھا۔ سندری بڑے اعتماد سے اس پر حکم چلانے لگی۔ اس نے سندری سے سندری کی طرح کام کرنا اور بولنا سیکھا۔

سندری کے مصروف ہونے کی صورت میں وہ بڑی چستی سے حاضر ہو جاتا۔

''میں ابھی کرتی ہوں جی۔۔''

وہ پلکیں تیزی سے جھپک کر کہا کرتا۔

وہ بھی ادارے کی طرف سے گیارہ ماہ کے معاہدے پر آیا تھا۔ کام بھی سمجھ جاتا تھا مگر ایک دن دوپہر کے بعد جب وہ کافی دیر کمرے سے نہیں آیا تو سندری اسے بلانے گئی۔

''مین صاب وہ میرے کو بولتی ہے۔۔ تیرے کو کاٹ دوں گا۔۔''

سندری فوراً لوٹ آئی۔

''کیا۔۔کون؟''

''مجھ سے بولا ہے فلتوش بھیا۔۔؟''

''۔۔کیوں۔۔؟''

عاصمہ بیگم حیرت سے اس کا منہ تکتی رہ گئیں۔

''ے کچھ نہی بولا تھا مین صاب۔۔ وہ کپڑا کا رسی کاٹنے کو چاقو لے گیا تھا نااو۔۔ ہاتھ میں تھی۔۔ چاقو آگے کیا میرا منہ پاس۔۔ بولی چپ کر کاٹ دوں گا۔۔ وہ بوت گوصہ والا ہے۔۔''

''تجھے لگتا ہے وہ ایسا کر سکتا ہے۔۔''

عاصمہ بیگم آئے دن اخباروں میں نوکروں کے حملوں کی خبروں کو یاد کرنے لگیں۔

''مالوم نہی مین صاب۔۔ نکل۔۔ وہ بوت گوصہ والا ہے۔۔ میرے کو آج پتہ چلی کہ اس کے اندر بوت ہئی گوصہ ہے۔۔''

فلتوش کو چھ ماہ ہوئے تھے۔ عاصمہ بیگم نے شوہر کو رُوداد سنائی۔ وہ قانون کی عزت کرنے والے قانون دان اور راست باز سے آدمی تھے۔ مسئلے حل کرنے کے معاملے میں جلد باز بھی واقع ہوئے تھے۔

''ہم نہ کہتے تھے نالائق ہے۔ فوراً اسے نکال باہر کیجئے۔۔ خطرناک مجرم ہو سکتا ہے۔ فون کیجئے پلیسمینٹ والوں کو۔ کسی کو بھی پکڑ لائیں گے گیا۔ ہونہہ۔۔''

وہ ایک ہاتھ میں ذیابیطس کی گولی اور دوسرے میں پانی کا گلاس لئے عاصمہ بیگم کو دیکھتے رہے۔ عاصمہ بیگم نے ان سے جیسے جواب کی توقع کی تھی ویسا ہی پایا۔ سلمان صاحب نے بیگم سے نظریں ہٹا کر گلاس کی طرف دیکھا اور ٹکیا نگل لی۔ اس کے بعد باہر جانے کی بجائے صوفے پر بیٹھ گئے اور ڈرائیور کو اندر کے دروازے تک بلوایا۔

''پہلے اسے پلیسمنٹ چھوڑ آئے۔۔ کہہ دیجئے۔۔ ہم بعد میں جائیں گے۔''

کچھ روز پھر سندری کو اکیلے کام چلانا پڑا۔ ضرورت پوری ہو جاتی تھی لیکن سلیقہ ناپید رہا۔ مگر جلد ہی نیا ملازم آ گیا۔

بھولی سی صورت والا اٹھارہ انیس برس کا لڑکا جو سریلا گاتا تھا اور فلمی اداکاروں کی نقل کرتا تھا۔ یہ اطلاعات سندری نے عاصمہ بیگم کو بہم پہنچائی تھیں۔

''اچھا ہے۔۔ نیکل۔۔ میرے سے چھوٹا ہے۔۔ میرے کو دیدی کہتا ہے۔۔''

سندری نے سنجیدگی سے کہا تو عاصمہ بیگم نے اسے چونک کر دیکھا۔

''تو کیا ہوا۔۔ تم اس سے بڑی ہو تو دیدی بلائے گا نا۔۔''

''ہاں عمر تو میرا جادہ ہے۔۔ دوائی سے بال بھی پک گیا ہے۔۔۔ نیکل مے کلر کرتی ہے نا۔۔ تو میرا بال اچھی لگتی ہے۔۔ میرے کو پسند نہیں دیدی بولنا۔۔ مے اس کو بولے گی میرے کو نام سے بلائے۔۔''

عاصمہ بیگم نے اس کی بات کو سمجھنے کی جیسے کہ کچھ کوشش سی کی۔

اچھا۔۔ جو تیرا جی چاہے کر۔۔''

انہوں نے سر جھٹک کر کہا اور اندر کی طرف گئیں۔

اب کام کچھ بہتر طرح ہونے لگا تھا۔ سندری سے اس کے نئے شاگرد چمن نے خاصی تربیت حاصل کر لی تھی۔ چمن کام خوش اسلوبی سے کرتا۔ اور اس کا فی الحال چھٹی لینے کا بھی کوئی ارادہ نہیں تھا۔ عاصمہ بیگم اس خوش انتظامی سے مطمئن ہوا ہی چاہتی تھیں کہ ایک صبح سندری حواس باختہ سی تھکے تھکے چہرے پر پریشان سی آنکھیں لئے ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

''مین صاب۔۔ میرے کو۔۔ میرے کو مہینہ نہیں ہوئی۔''

اس نے عاصمہ بیگم کے چہرے کی جانب نظر ڈال کر سر جھکالیا اور مسہری کے پاس فرش پر دھپ سے بیٹھ گئی۔

''تو اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ ہو جائے گا۔۔ ایک دو دن ادھر اُدھر ہو جاتے ہیں۔''

''نہی مین صاب کل چار دن ہو گیا۔۔ آج بھی نہیں ہوا۔۔ پانچ دن ہو گیا۔۔''

اس نے ہاتھ کی انگلیاں پھیلا کر دکھائیں۔ اس کے چہرے پر گہری تشویش صاف عیاں تھی۔

''کیا۔۔ کیا مطلب۔۔ تو نے۔۔ تو نے کچھ۔۔''

عاصمہ بیگم فوراً بولیں۔

''جانتی ہے نا تو۔۔ غلطی کرنے سے مہینہ نہیں ہوتا بچہ ہو جاتا ہے۔۔ تو کہیں ماں۔۔''

مین صاب۔۔ او چمن میرے کو پکڑ لیا تھا۔۔''

اس نے ایک نظر اوپر دیکھا اور سر جھکالیا۔

''کیا بک رہی ہے۔۔ کب۔۔؟''

''پچھلے ہفتے۔۔''

''تو؟ تو نے مجھے بتایا ہی نہیں اتنے دن۔۔ اس بدتمیز کو میں۔۔ میں پولیس میں۔۔''

عاصمہ بیگم کچھ کہتے کہتے رکیں۔

''کتنی بار پکڑا تھا اس نے تجھے۔''

''تین بار۔۔ میرا مرجی نہیں تھا۔۔''

''اوہ۔۔ اچھا۔۔ تیرا مرجی نہیں تھا۔''

عاصمہ بیگم نے گہری سانس لی۔

''اس فلتوش نے بھی ایسا کیا تھا۔۔''

عاصمہ بیگم نے کچھ حیرت اور بے یقینی سے پوچھا۔

''ہاں جی بہت بار۔۔ میرے کو ایسے ہی بوت چنتا لگتا تھا۔۔ مگر وہ کہتا تھا میرے کو پتہ ہے کچھ نہی ہوگا۔۔ نکل پھر مہینہ ہو جاتی تھی۔۔''

''اور کمل نے۔۔''

عاصمہ بیگم ہکا بکا سی ہو کر بولیں۔

''ہاں جی اور کیا۔۔ مگر وہ سمجھدار تھا۔۔ اس کو پتہ تھی کہ کیسے کیا کرنا ہے۔۔ باجار میں کدھر کیا

ملتا ہے۔۔لاتا تھا۔۔، میرے کو ایک دم چنتا نہیں ہوتا تھا۔۔''

''بدتمیز۔۔''

عاصمہ بیگم کا ہاتھ بے اختیار اس کے چہرے کی طرف اٹھا مگر انہوں نے اسے تھپڑ نہیں لگایا اور دانت پیس کر رہ گئیں۔

تُو۔۔تُو تو بھیا بلاتی تھی اُسے۔۔اور۔۔اور وہ کمبخت کہتا تھا کہ بال بناتے وقت تو۔۔ ایکدم۔۔ایکدم۔۔''

عاصمہ بیگم کا سانس بے ترتیب سا ہو گیا۔

تو میری پرہیز گار ماں کو۔۔ناپاک۔۔''

عاصمہ بیگم کانپتی آواز میں بولیں۔

''نہی مین صاب مے نہاتا تھا۔۔''

وہ جلدی سے بولی۔

عاصمہ بیگم کا سر چکرا گیا۔انہوں نے انگلیوں کے پوروں سے کنپٹیاں تھام لیں۔کئی پل ایسے ہی گزر گئے۔

''اچھا۔۔وہ۔۔فلتوش نے تجھے پھر کیوں کہا تھا مار ڈالے گا؟''

''میرے کو مہینہ نہیں ہوئی تھی نا۔۔مے اس کو بولی نہی ہوئی تو مے مین صاب کو بولے گا تو میرا شریر کو چھوا ہے۔۔اسے گوصہ آ گیا تھا۔۔''

عاصمہ بیگم کچھ لمحے سن سی اسے تکتی رہ گئیں۔

''پچھلی دفعہ کب ہوا تھا۔۔''

''جس دن آپ صاب اور بھیا لوگ کھانے پر گیا تھا نا باہر۔۔مے چوڑی دار پہنی تھی۔۔جو آپ لوگ انمیسر ی (اینیورسیری) کے دن ’ٹپ‘ دیا تھا نا۔۔تو میں منگل باجار سے۔۔''

''بکواس بند کر۔۔''

عاصمہ بیگم کی آواز اچانک اونچی ہو گئی۔

''مہینہ کب ہوا تھا۔۔تاریخ بتا۔''

انہوں نے آواز کو دھیما کرنے کی شعوری کوشش کی۔

''او۔۔مہینہ۔۔جس دن مین صاب آپ سے بولی تھی نا۔۔آج باجار سے سودا مے لائے

گی۔۔میرے کو نیپکی (نیپکن) لانا ہے۔۔اس کا دوسرا دن ہوئی تھی۔۔''

''تاریخ بھی تو ہوگی نا کچھ۔۔''

''میرے کو یاد نہیں مگر بہت دن ہو گیا۔۔''

عاصمہ بیگم نے ذہن پر زور دیا۔وہ اس دن اپنے بڑے بیٹے کی دوست کو دوپہر کا کھانا کھلانے شیریٹن لے گئی تھیں۔لوٹنے پر غالباً اسی دن سندری نے نیپکن لانے کی بات کہی تھی۔مگر وہ اسے دوبارہ لے گئی تھی۔ایک بار بیٹے کے کہنے سے دوسری دفعہ خود عاصمہ بیگم کا دل اس سے ملنے کو چاہا تھا کہ اس کے گھر میں بیٹی کی کمی کے احساس نے اس کے دل میں ہمیشہ کسی بیٹی جیسے تعلق کی خواہش کو سیراب کیا تھا۔

جب انہوں نے دیبا کے لئے اپنے سنگھاردان سے نازک سی زنجیر والا پینڈنٹ اور اس سے ملتے جلتے کرن پھول ڈھونڈ کر پرس میں رکھے تھے۔عاصمہ بیگم کو دیبا کا نازک سا گلا یاد آ گیا جس پر ہوٹیل شیریٹن کے ریستوراں میں سولہ سے بھی کم سیلسیس پر ٹھہرے ہوئے درجۂ حرارت میں پسینے کی بوندیں چمک اٹھی تھیں۔

بے سبب ہی۔۔اسے کیا معلوم کہ۔۔

عاصمہ بیگم کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیلی ہی تھی کہ انہیں موجودہ حالات کی نزاکت کا تیزی اور شدت سے احساس ہوا۔

انہوں نے سر جھٹک کر سندری کو دیکھا۔

''کیا کروں اب بتا۔۔سوائے اس کے کہ تمہیں تمہارے گھر بھیج دوں۔۔''

کچھ دیر فضا پر خاموشی طاری رہی۔

''مگر تم پریگنینٹ ہو بھی یا۔۔۔''

''کیا مین صاب۔۔''

''کچھ نہیں۔۔تم۔۔تم دفع ہو جاؤ یہاں سے۔۔''

عاصمہ بیگم فرش کی طرف دیکھتی رہیں، اسی مقام پر بیٹھی بیٹھی، کتنی ہی دیر تک۔

بڑا بیٹا جوان ہو گیا تھا۔۔دوسرے کا قد بھی نکل آیا تھا۔۔شوہر بھی خیر سے جوان لگتے ہیں۔۔ سچ مچ امید سے ہوئی کمبخت تو۔۔لوگ۔۔جانے کیا سوچیں گے۔۔چمن کل چھٹی مانگ رہا تھا۔۔اور دو مہینے کی تنخواہ بھی۔۔ایک مہینے کی تنخواہ پلیسمنٹ والا لے گیا۔۔

سرخ کنارے اور قوسِ قزح جیسے رنگوں کے مہین پھولوں والے کشمیری ریشمی قالین کے درمیان سمندر ایسے نیلے رنگ کی زمین پر بنی گہری سبز بیل پر بیٹھی خوش رنگ بلبل کے تاج سے نظریں ہٹا کر عاصمہ بیگم نے دریچے سے باہر نظریں گاڑ دیں۔ ہرے ہرے درخت کے گھنے پتوں میں انکی ایک پھٹی ہوئی پتنگ بہت بری لگ رہی تھی۔

۔۔بھاگ ہی نہ جائے کہیں مردود پیسے ملتے ہی۔۔اور۔۔یہ لڑکی۔۔بھاڑ میں جائے بے شرم۔۔دفع کر دوں گی اس کو بھی۔۔کیا کیا گل کھلاتی رہی اور ہم۔۔ ہم ہیں کہ۔۔ بے وقوف بنتے رہے۔۔گاؤں میں کرے ان کالی کرتوتوں کی نمائش۔۔ بے حیا کہیں کی۔۔سلمان صاحب سے سب کہنا پڑے گا۔۔ہاں۔

عاصمہ بیگم نے کچھ مطمئن ہو کر کھڑکی سے نظریں ہٹا لیں۔اور دو صوفوں کے درمیان شیر کے پاؤں کی ساخت کے پایوں والی پتھر کی میز پر رکھا کرسٹل کے شفاف کانچ کا بنا چوکڑیاں بھرتا ہرن ہاتھ میں لے لیا۔

۔۔مگر سوتیلی ماں۔۔اس کا جینا اور مشکل کر دے گی۔اسے سارے گاؤں میں بدنام کرے گی۔۔اسے کسی نے سمجھایا ہی نہ ہوگا۔اچھا برا کیا ہے۔۔ماں ہی جب۔۔اور سوتیلی ماں کھانا اپنی مرضی سے نکالنے پر کڑچھی سے مارنے والی، اسے کھلے عام مارنے کا جواز حاصل کر لے گی۔۔اسے اس کے باپ کے سامنے ذلیل کرے گی۔۔گاؤں میں جانے کیسے اس کا ایبارشن کرایا جائے گا۔۔ سوتیلی بیٹی کا۔۔کسی بھی سستی سی ناتجربہ کاردائی سے۔۔اس کا جانے کتنا خون بہہ جائے گا۔لاپرواہی ہو جائے گی۔۔زیادہ بہہ گیا تو۔۔

شادی کے دو ماہ بعد خود اس کے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔اسے مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا اس کی ڈاکٹر نے کہ شاید اس سے اس کی امید ٹوٹنے سے بچ جائے۔۔اور وہ کم عمری کے باعث ناداں اور بلاوجہ شرم کے سبب خاموش بستر پر پڑی رہی۔امید تو جاتی رہی، نسوں سے بھی خون نچڑتا گیا۔ربر کے بیس انچی دبیز گدے سے ہوتا جب پلنگ کے تختے کو نم کر چکا تو اسے اچانک محسوس ہوا تھا کہ اس کے ہاتھ برف ہو گئے ہیں۔امید کے دنوں میں اس کے پیر ٹھنڈے رہا ہی کرتے تھے۔معاً اسے خیال آیا تھا کہ کچھ غلط ہو رہا ہے۔ہسپتال پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ اللہ کو پیاری ہونے ہی والی تھی۔

جب اس پر خود، شہر کی سب سے مشہور ڈاکٹر کی نگرانی میں یہ ستم ہو سکتا تھا تو۔۔کہ امید ٹوٹنے

کے ساتھ جینے کی امید بھی ختم ہونے کو تھی۔۔تو۔۔اس۔۔اس غریب کا کیا ہوگا۔۔اسے تو نجات مطلوب ہے اس سے۔۔جانے کتنا خون بہہ جانے کے بعد یا جب بھی اس کے جسم سے الگ نہ ہوا تو۔۔جب تک، کہ ماہر ہاتھوں سے اُسے الگ نہ کیا جائے۔۔اور ماہر ہاتھ۔۔اس کے نصیب میں۔۔؟

باورچی خانے سے زور زور سے برتن دھوئے جانے کی آواز آ رہی تھی۔

عاصمہ بیگم باورچی خانے کی طرف گئیں۔

''سندری۔۔میں نے سوچ لیا ہے۔۔''

''جی مین صاب۔۔''

اس کی تشویش ناک سی اداس آواز ابھری۔اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔

''اوہ۔۔ادھر تو دیکھ۔۔رو رہی ہے تُو کیا۔۔''

''ے کیا کروں گا جی۔۔میرے کو گاؤں والا لوگ۔۔''

وہ ہچکیاں لینے لگی۔

''ارے پاگل میں تھوڑے ہی بھیجوں گی اس حال میں تجھے گاؤں۔۔جو ہوگا دیکھیں گے۔۔تم فکر نہ کرو۔۔میں خود دیکھتی ہوں۔۔ابھی تو تمہیں دنوں کے بارے میں ہی کنفیوژن ہے۔۔''

عاصمہ بیگم نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرنا چاہا تھا مگر ایسا نہیں کیا۔

''چار دن اور نہیں ہوا تو میں ہسپتال لے جا کر تمہارا یورین ٹیسٹ کرواؤں گی۔میرے خیال سے ابھی ایک مہینہ بھی نہیں ہوا ہے۔۔بھوک تو لگتی ہے نا اچھے سے۔۔''

''ہاجی۔۔لگتا ہے۔۔''

''اور متلی وغیرہ۔۔ابکائی۔۔؟''

''ناجی۔۔''

''بس باقی اوپر والے پہ چھوڑ دو۔۔اور مجھ پر بھروسہ رکھو۔۔اب جو ہونا تھا ہو چکا۔۔اس۔۔اس مصیبت میں تمہیں۔۔''

وہ اسے دیکھتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے بولیں۔

''اکیلے نہیں چھوڑیں گے تجھ کو۔۔''

سندری نے رضامندی میں گردن کو خم دیا۔

عاصمہ بیگم کمرے میں لوٹ آئیں۔

لے کر کیسے جاؤں گی ہسپتال اسے۔۔ سکینڈل بن سکتا ہے۔۔اس بات کا۔۔اکیلے بھیجوں۔۔ راستے کہاں آتے ہیں اسے۔۔ ڈرائیور کے ساتھ بھیج دوں اسے۔۔کوئی جرم تو رہا نہیں اب۔۔اب۔۔اب تو لڑکیوں سے شادی کے بارے میں ہی پوچھتے ہیں نہ فی ٹس (foetus) کے باپ کے بارے میں۔۔قانوناً جائز قرار دے دیا گیا ہے ابارشن۔۔

سلمان صاحب تھکے ہوئے لوٹے تھے۔

ان سے بات کرنا مناسب بھی نہ تھا۔

پریشان ہو جائیں گے۔۔

ان سے بات کرنا مناسب تھا بھی۔۔؟

پریشان کر دیں گے۔۔

اپنے بیتابانہ ردِ عمل سے۔۔اس کی پریشانی میں بھی اضافہ کر دیں گے۔

عاصمہ بیگم انہیں بے خیالی میں دیکھتی رہ گئی۔

رات عاصمہ بیگم سو تو گئیں مگر پریشان کن خوابوں نے انہیں اپنے نرغے میں لئے رکھا۔اور صبح کے تازہ خواب نے انہیں اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا کر دیا تھا۔

برآمدے میں پہنچ کر انہوں نے پلٹ کر سندری کی طرف دیکھا۔

وہ۔۔وہ دیکھ۔۔اِس گلی کے اُس طرف۔۔ جہاں سڑک نظر آ رہی ہے نا۔۔؟ مدر ڈیری تک تو تُو جاتی ہی ہے۔۔ادھر سے داہنی جانب جا کر چھوٹی سی سڑک سے بائیں اور مڑ جانا۔۔سامنے بالا جی ٹینٹ والے کا بڑا سا بورڈ لگا نظر آئے گا۔۔اس کے سامنے جہاں ننھے سے بچے کے منہ میں ڈاکٹر دوائی کی بوند ٹپکا رہا ہے نا۔۔ایک دم ادھر ہی۔۔بس سیدھی چلی جانا۔۔وہی سرکاری ہسپتال ہے۔۔دس منٹ کا ہی تو راستہ ہے۔۔گھبرانا بالکل نہیں۔۔میں۔۔"

عاصمہ بیگم نے رخ اس کی طرف موڑا تو سندری ادھ کھلا منہ لئے ان سے کچھ کہنے کو بے قرار سی نظر آئی۔

"ہو گئی میرے کو مین صاب۔۔"

وہ سر ہلا کر مسکرائی۔

''مطلب۔۔تو۔۔تیرا مطلب ہے کہ تُو۔۔''

عاصمہ بیگم کے چہرے پر بے قراری مسکرانے لگی۔

''ہاجی۔۔مین صاب۔۔مہینہ ہوگئی میرے کو۔۔''

''کب۔۔؟''

انہوں نے اس کے شانے تھام لئے۔

''رات ہئی کو۔۔''

''سچ۔۔؟ شکر ہے۔ عاصمہ بیگم نے آسمان کی طرف نظر ڈال کر واپس اس کی طرف دیکھا پھر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھے رکھے اسے اپنے سے ذرا دور کھڑا کیا اور اس کے چہرے پر نظریں ٹھہرا دیں۔

''اب دوبارہ ایسی غلطی مت کرنا۔ نہیں تو میں تجھے سچ مچ ہی گاؤں بھیج دونگی۔۔''

''کسم کھاتا ہوں مین صاب۔۔اب نہی کروں گا۔۔''

وہ مسکرائی۔

''مین صاب چمن چلا گیا۔۔''

''ہاں۔۔کب۔۔؟''

''معلوم نہی۔۔۔ے سویرے جاگا تو کمرے میں نہیں تھا۔''

''تُو اس کے کمرے میں کیا لینے گئی تھی۔۔''

''گئی نہیں تھی۔۔کمرہ کھلا تھی تو۔۔نجر پڑ گیا۔۔سب سامان لے گیا۔۔''

وہ بغیر کسی تاثر کے بولی۔

''ابی سارا کام کھدا ای کرنا پڑے گا۔۔''

''چلو۔۔بھاڑ میں جائے۔۔بدتمیز کہیں کا۔۔دوسرا آجائے گا۔۔تجھے کیوں کرنا پڑے گا۔۔ ایک دو دن کی بات ہے۔۔سارا کام تیرے بس کا نہیں اور بچوں کے زیادہ تر کام کے لئے لڑکا ہے بھی ضروری۔۔خیر۔۔تُو ذرا۔۔اُن لوگوں سے کہوں گی کوئی سمجھدار سا لڑکا بھیجیں اور۔۔تُو بھی۔۔''

اور دوسرے دن سمجھدار لڑکا آ گیا۔

''مین صاب وہ آ گیا۔۔''

دروازے کی گھنٹی سن کر سندری نے اسے گھریلو ملازمین مہیا کرنے والے شخص کے ساتھ

دیکھا تو دوڑتی ہوئی آئی۔

''درواجا کھول دوں مین صاب۔۔؟''

''ہاں۔۔ہاں کھول دے نا۔۔''

لڑکا دیکھنے میں پہلے تینوں سے بہتر تھا۔فیشن کے مطابق اس نے بال بھی بڑھا رکھے تھے۔ عاصمہ بیگم نے لڑکے کی طرف سے نظر ہٹا کر سندری کی جانب دیکھا جو مبہوت اسے دیکھ رہی تھی۔وہ سامان رکھنے پچھواڑے کی طرف گیا تو سندری مسکراتی ہوئی باورچی خانے کو پلٹی۔اور عاصمہ بیگم اس کے پیچھے پیچھے اندر گئیں۔

''کام کرنے والا نہیں لگتا نا مین صاب۔۔؟ بھیا لوگ اور ان کا دوست جیسا لگتا ہے نا۔۔''

وہ فریج سے پانی کی بوتل نکالتے ہوئے بولی۔

''اب جو بھی ہے سندری۔۔تُو خدا کے لئے باز آجا۔۔اس کو بخش دے۔۔ورنہ سچ مچ میں اب کے تجھے۔۔''

عاصمہ بیگم سمجھانے کے انداز میں بولیں تو سندری ہنسنے لگی اور اپنے دونوں کان پکڑ لئے۔

''کان پکڑتا ہوں مین صاب۔۔۔''

اس نے سنجیدگی سے کہا اور زور سے کان کھینچے۔عاصمہ بیگم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

وہ کان پکڑے پکڑے ہنسی۔عاصمہ بیگم اس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہیں۔

اس کی معصوم سی ہنسی۔۔نادان سی ہنسی۔۔۔پرسکون سی۔۔بے خبر سی ہنسی۔۔

''نہیں سمجھی نا تُو۔۔دیکھ سندری۔۔ادھر دیکھ۔۔اب پلیز تُو۔۔کچھ مت کرنا۔۔''

عاصمہ بیگم کے چہرے پر التجا ہی التجا تھی۔

''ہاتھ جوڑوں کیا۔۔؟''

عاصمہ بیگم نے ہاتھ جوڑ دئے۔

''نہ نہ مین صاب۔۔میں کسم کھاتا ہوں۔۔جس کا قسم مرجی لے لو۔۔''

وہ کان پکڑے بولتی رہی۔۔اور ہنستی رہی۔عاصمہ بیگم کے جڑے ہاتھ دیکھ کر بھی اس کی ہنسی نہیں رکی تھی مگر آنکھیں کچھ پھیل گئی تھیں۔

ایک آنکھ کا رخ داہنی جانب تھا اور دوسری کا بائیں اور۔

''نہ نہ مین صاب ۔۔ایسامت کرو۔۔ مے سچ مچ سے کسم کھاتا ہوں۔۔''
وہ عاصمہ بیگم کے ہاتھوں کو دیکھتی ہوئی بولی۔
''میں بھگوان کا کسم کھاتا ہوں مین صاب۔۔ میں اپنا مرا ہوا ماں کا کسم کھاتا ہوں مین صاب۔۔اب ایسا نہی کروں گا۔۔''
اس نے قہقہوں کے درمیان رک رک کر کہا۔اور بڑے ہی خلوص سے عاصمہ بیگم کو دیکھتے ہوئے اس نے نہایت عاجزی سے گردن کو خم دیا اور ایک قدم ان کی طرف بڑھی۔
''مے۔۔مے۔۔آپ کا کسم کھاتا ہوں مین صاب۔۔آپ میرے کو ماف کردو۔۔''
اس نے دھیمی سی آواز میں کہا اور مسکراتی رہی۔ عاصمہ بیگم نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔

◆✥◆

ساحلوں کے اُس طرف

شیری نے اخبار سامنے سے سرکا دیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ کھڑکی کی چوکھٹ کے قریب اس کے والدین کی اچھے دنوں میں اُتاری گئی ایک تصویر میں اس کے والد اپنے سے کوئی پندرہ برس بڑی بیوی کے کمر میں ہاتھ ڈالے مسکرا رہے ہیں۔ گھنگھریالے کھچڑی بالوں اور بھرے بھرے چہرے والے اس کے چالیس سالہ والد بھورے رنگے بالوں والی اس کی پچپن سالہ چاق و چوبند والدہ سے عمر میں کسی طرح کم نہیں لگ رہے تھے۔

''تمہیں پانے کے لئے شادی کی تھی میں نے۔۔ ورنہ۔۔ ورنہ۔۔''

پاپا سے ڈیوورس لینے کے بعد ہمیشہ ماما نے اس کے سوالوں کا یہ ہی جواب دیا تھا اور گردن کچھ ایسے خم کی تھی جیسے سارا قصور شیری کا ہی ہو۔

''یو کڈ ہیو ایڈاپٹڈ اے چائلڈ ماما۔ نو۔۔؟''

وہ بھی ماما کے ہی انداز میں گردن کو ہلکا سا جھٹکتی۔

''نو۔۔''

ماما سختی سی کہتیں۔

''یا۔۔یو کڈ ہیو اے۔۔اے ٹیسٹ ٹیوب بے بی۔''

ٹین ایج سے تازہ تازہ باہر آئی شیری دھیرے سے کہتی۔

''یو مائنڈ یوئر اون بزنیس او کے۔۔؟''

ماما سر اٹھا کر اسے سیکنڈ بھر کو حیرت سے دیکھتیں۔ پھر ہونٹ ایسے بھینچ لیتیں جس سے شیری سمجھ جاتی کہ اب ماما کچھ دیر بات نہیں کریں گی۔

مگر یہ سب کسی تناؤ بھرے ماحول میں نہیں ہوتا تھا۔ نہ ہی اس سے کوئی تناؤ پیدا ہوا کرتا۔ بس ایسے ہی گویا معلوماتی قسم کی بحث ہو رہی ہو۔

۔۔پوئر پاپا۔۔

شیری کی نظریں چوکھٹ کے پاس سے اٹھ کر باہر چلی جاتیں۔

۔۔اے وِکٹم اوف فیمینزم۔۔اور اگر ان دنوں یہ دریافت۔۔یا ایجاد۔۔وٹ ایور۔۔ہوئی ہوتی تو۔۔دِس۔۔دِس مائی ہاڈ کور فیمینسٹ مام۔۔

شیری نے سر جھکا کر دوبارہ اخبار کے اس صفحے پر نظریں مرکوز کر لیں جو کچھ دیر پہلے خاصی دیر تک اس کی نظروں کے سامنے رہا تھا۔

کیا معلوم ایسا ہوا ہو کبھی۔۔آخر کروڑوں برس بوڑھی یہ دنیا کون جانے کس کس خطے میں کتنی کتنی بار اجڑی اور بسی ہے۔ ایسا ہو تو سکتا تھا نا۔۔یا۔۔میں کچھ صدی بعد دنیا میں آئی ہوتی۔۔یا آنے والے وقتوں میں کبھی ایسا ہونا ہوتا۔۔میں بہت بعد میں جنم لیتی اور۔۔پھر۔۔کبھی اپنے پاپا کی بیٹی میں۔۔اُس وقت صرف ماما کی رہ گئی ہوتی۔۔اور پھر دوبارہ ایک نئی طرح کی یعنی اصل میں پرانی طرح کی دنیا بساتی۔۔اور مجھے اس کے صلے میں۔۔اتنی بڑی کامیابی کے بدلے۔۔میری ان باہوں کو ٹیٹو کیا جاتا اور میرا اچیومینٹ ان پر درج ہوتا اور۔۔اور۔۔پھر۔۔اور میرے فوسلز کسی گلیشئر میں جوں کے توں حالت میں صدیوں بعد پائے جاتے۔۔یعنی ماما کی بیٹی اور نانی کی نواسی۔۔اور پرنانی کی۔۔(اب جو بھی تھا) کسی مہم کے دوران اگر کسی گلیشئر میں دب جاتی۔۔پھر پتہ چلتا۔۔کہ میں نے اتنا بڑا کارنامہ کیا تھا۔

کوئی غلط تو نہ ہوتا یہ۔۔ایسا ہونا ممکن بھی تو ہے۔۔

شیری اٹھ کر کھڑکی کے قریب آ گئی اور تصویر میں اپنے والد کے چہرے کو ہاتھ سے چھوا ایسے

کہ والدہ کے چہرے سے انگلی تک چھو نہ سکے۔

مگر کیا معلوم مجھے ایسا کرنے دیا جاتا۔۔یا کرنے دیا جائے۔۔یا۔۔یا۔۔یا پھر ایسا کرنے کو ایک گناہ یا جرم یا بغاوت گردان کر۔۔مجھے مجھے۔۔نہیں۔۔پاپا پچھلے مہینے ہاسٹل آئے تھے تو سمجھایا تھا کہ منفی خیالات دل میں نہیں لانے چاہئیں۔۔

۔۔ہے نا پاپا۔۔اِٹ از نٹ رونگ۔۔نو۔۔؟ اگر مجھے یہ موقعہ ملتا تو آپ تو جانتے ہیں نا اپنی ایڈوینچرس بیٹی کو۔۔

شیری کہیں دور دیکھنے لگی۔

مگر پھر سچ مچ وہی ہوا جو شیری نے تصور کیا تھا۔کہ برسہا برس بیت گئے اور کسی کو وقت کی اس تیزی کا اندازہ ہی نہ ہوا۔

بنی نوع انسان وقت کے تعین کو عشروں، صدیوں اور ہزاروں سے تعبیر کر کے لاکھوں کروڑوں برس کا حساب لگا کر خوش ہو جاتا ہے۔اور وہاں کائنات میں ایسی باتیں پلک جھپکنے سے زیادہ کی اہمیت نہیں رکھتیں۔

اور پلک جھپکنے میں سینکڑوں برس بیت جاتے ہیں۔

اور پلک جھپکنے میں سینکڑوں برس بیت گئے تھے۔

شیری کا تصور سچ کے اس درجہ قریب ہو جائے گا، اس نے کبھی سوچا تک نہ تھا۔

شیری کے کانوں میں کسی پرندے کی چہچہاہٹ پڑی تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ایک ریت کا ذرہ اس کی آنکھ میں گھس آیا۔

وہ دونوں ہاتھوں سے آنکھوں کو مسلنے لگی اور کافی دیر اس عمل میں مصروف رہنے کے بعد اس نے آنکھیں پوری طرح وا کیں۔نیلاہٹ مائل سرمئی سے آسمان پر بطخ کے رنگ اور ساخت کا ایک پرندہ اُڑ رہا تھا مگر اس کی چونچ بطخ سے کچھ کم چپٹی تھی اور سرے تک پہنچتے نوکیلی اور خمدار ہو جاتی تھی۔آسمان بھی الگ سا لگ رہا تھا، جیسے ہر چیز پر ہلکے ہلکے بادلوں کا سایہ ہو مگر پھر بھی ہر شے حسین اور روشن ہو۔اور اس پرندے کی آواز بھی بطخ ایسی نہیں تھی کہ جیسے آرے سے کوئی لکڑی چیر رہا ہو، بلکہ بڑی سریلی تھی۔جیسے بچوں کے لئے بنائی گئی پلاسٹک کی سیٹیاں ہوتی ہیں۔شیری کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔وہ اٹھ بیٹھی۔اس

نے اتنا بڑا پرندہ پہلے کبھی اتنی لمبی اڑان بھرتے نہیں دیکھا تھا۔ پرندہ اڑتے اڑتے اُس کی داہنی جانب اونچے اونچے بے شمار درختوں کی طرف چلا گیا تو وہ چونک کر ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ سامنے دور دور تک ریت ہی ریت تھی۔ اور بائیں جانب نیلا نیلا وسیع سمندر سکون سے کہیں جا رہا تھا۔ اس نے سر جھکا کر خود کو دیکھا۔ اس کا لباس تار تار تھا اور بدن ریت اور کیچڑ سے لت پت تھا۔ یہ سب اس نے ایک سیکنڈ کے کسی حصے میں دیکھا۔ اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ اسے یاد آیا کہ وہ سمندر کے اوپر اُڑ رہی تھی جب اس کے چھوٹے سے جہاز میں تکنیکی خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ اسے جہاز کو کریش لینڈ کرنا پڑ رہا تھا۔ کنارا بہت دور تھا مگر وہ اچھی پیراک تھی۔ اس نے بڑی خود اعتمادی سے ایک ہی سیکنڈ میں یہ فیصلہ لیا تھا کہ وہ جہاز کا رخ کنارے کی طرف موڑ کر پانی میں کود جائے گی اور اس نے ایک سیکنڈ سے کم وقت میں ایسا ہی کیا تھا۔ مگر یہ وہ ساحل ہی تھا اور نہ یہ جگہ اس کی پہچان کی۔ ملبے کا بھی کوئی نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔

اس نے جلدی سے اپنی کلائی کی طرف دیکھا۔ کلائی پر ایک گہرا زخم تھا اور سنہری کلائی کی نازک جلد کے اندر لگا رابطے والا آلہ چوٹ لگنے سے خراب ہو کر بند پڑا تھا۔ لباس اور جسم میں کوئی ٹرانسمیٹر سلامت نہیں تھا۔ مگر سر کے اندر کچھ شور سا سنائی دے رہا تھا۔ شاید دماغ کے اطراف نسب آلات کام کر رہے ہوں اور اس کی ماما کو اس کے کریش اور ڈائریکشن کا پتہ چل جائے اور اسے وہ ڈھونڈ نکالیں۔

یہ سب سوچنے میں شیری کو مزید ایک سیکنڈ لگا تھا اور تیسرے سیکنڈ اس نے اپنے سامنے ایک ایسی شے دیکھی جسے دیکھ کر اس کی چیخ تک اس کے حلق میں اٹک گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے ہونٹ داب رکھے تھے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے سامنے دیکھ رہی تھی۔ اپنی بیس سالہ زندگی میں دنیا کے سارے ممالک کا دورہ کرنے کے باوجود شیری کی نظروں سے ایسی شے کبھی نہیں گزری تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور مارے خوف کے آنسو بہہ نکلے تھے۔ وہ منہ پر ہاتھ دھرے دھیرے دھیرے سسکنے لگی۔ اسے گھر کی بے تحاشا یاد آنے لگی۔

۔۔ ماما۔۔ میں کہاں ہوں۔۔ آپ کہاں ہیں ماما۔۔ یہ کیا چیز ہے۔۔ ماما۔۔

اس نے آنکھیں بھینچ لیں۔ اور دماغ میں خیال اٹھتے ہی شور ختم ہوا اور سب صاف سنائی دینے لگا۔

''ہم تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں بیٹا۔۔ جلدی تمہارے پاس ہونگے۔۔''

دماغ میں ماما کی آواز گونجی۔

۔۔ مگر میں کہاں ہوں۔۔ ساری ڈائریکشن لُوز کر چکی ہوں۔۔ آپ لوگ نظر نہیں آ رہے۔۔

برین کے اندر لگا کوئی ویڈیو کام نہیں کر رہا۔۔اور یہ۔۔یہ میرے سامنے کیا ہے۔۔

شیری نے پھر آنکھیں بھینچ کر کھولیں تو دماغ نے واپس سگنل دیا۔اس نے سامنے کھڑی مخلوق کو ایک بار پھر بغور دیکھا۔

''تھوڑی دیر پہلے تک تمہارے آئی لڈس کے اوپر لگے مائکرو کیمراز ،ڈیمج ہونے کے باوجود سامنے کا منظر کچھ دھندلا سا دے تو رہے تھے۔۔مگر تم نے دونوں آنکھوں کو بچوں کی طرح مسل ڈالا اور پہلے سے ہی ٹینڈر ہو چکے اور پانی سے بھرے کیمراز میں سے ایک بھی نہ بچا۔تم کہیں نارتھ کی طرف گری تھیں۔۔پلین اور تم دونوں سمندر کے اندر گرے تھے۔۔بٹ تھینک فلی یو آر سیف۔۔ہم آ چکے ہوتے مگر تمہاری ڈائریکشن کا کچھ پتہ نہیں چل رہا۔تمہارے سامنے ایک ساحل تھا۔۔ہم تمہیں ڈھونڈتے جہاں تک آئے ہیں یہ وہی ڈائریکشن ہے مگر ادھر کوئی ساحل نہیں ہے۔۔بٹ یو ڈونا ٹ وری۔۔ہم ڈھونڈ لیں گے۔مجھے حیرت ہے کہ دنیا کا چپہ چپہ ہمارے سب کاغذی اور برقی نقشوں میں ہے۔۔مگر یہ کون سی جگہ ہے۔۔خیر تم فکر نہ کرو اور زیادہ مت سوچو۔تمہارے مائنڈ کے رے ڈاراوورلوڈ ہونے سے ہم کونٹیکٹ لُوز کر سکتے ہے کیونکہ جہاں تم ہو وہاں کوئی آرٹیفیشل میگنٹک فیلڈ نہیں مل رہا۔کوئی ریڈیو ویوز ڈیٹیکٹ نہیں ہور ہیں اور ان کا چارج ہونا ناممکن ہو سکتا ہے۔۔ڈونوٹ اوور برڈن یوئر سیلف۔۔ہم ڈھونڈ رہے ہیں۔۔ہیو سم فش ٹو ایٹ۔۔یو ہیو ٹو سروایئو۔۔اینڈ ریمیمبر یو آر اے بریو پرسن۔۔مچھلی پکڑتی رہو اور زندہ رہو۔۔ہم تمہیں جلد ہی۔۔''

ماما کی آواز کچھ رک رک کر آنے لگی۔

۔۔ماما۔۔

شیری کی آواز میں آنسو گھل گئے۔

دماغ میں لگے آلے نے اداسی کی لہروں سے چھوتے ہی اپنی ریزروانیرجی استعمال کر ڈالی اور ماما کی آواز پھر ابھری۔

''۔۔نو بے بی۔۔نو۔۔یو ہیو۔۔''

ماما کی اداس بھاری آواز ڈوبی ابھری اور بات ادھوری رہ گئی اور شیری کے دماغ میں اٹھنے والی آوازیں اچانک بند ہو گئیں۔

ایسا کیوں ہوا۔۔میں نے تو سوچا کچھ نہیں تھا جو چارج ختم ہو گیا۔۔

وہ سامنے ایستادہ شے پر نظریں گاڑے سوچتی رہی۔

اوہ۔۔مگر میں تو مسلسل سوچ ہی رہی ہوں۔۔کیا کروں۔۔اب میں کیا کروں۔۔

ماما سے رابطہ ٹوٹتے ہی وہ اور خوف زدہ ہوگئی اور اس کا جی چاہا کہ چیخ چیخ کر رو دے مگر خوف کے حملے نے اسے چیخنے بھی نہ دیا کہ یہ انجان مخلوق جانے کیا کرے گی۔

مگر انجان مخلوق نے کچھ نہ کیا۔بس کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ یہ مخلوق حیرت انگیز طور پر شیری سے مشابہ تھی۔مگر حیرت انگیز طریقے سے اس سے جدا بھی تھی۔

یہ کیا ہے۔۔

شاید کہیں دیکھی ہے اس نے پہلے ایسی کوئی شے۔۔مگر کہاں۔۔ہاں۔۔شاید کسی عجائب گھر میں۔۔تین سو سال سے قائم ایک عجائب گھر میں۔۔جہاں اس زمانے کی اور اس سے اور پہلے کی ناپید ہو چکی مخلوقات موجود ہیں۔۔ہاں وہیں۔۔وہیں دیکھا ہے اس نے اس مخلوق کو۔۔اس کی حنوط شدہ شکل کو۔۔حنوط شدہ مخلوق کے برابر اسی کا ایک بڑا مرمری مجسمہ بھی رکھا گیا ہے۔۔سفید پتھر کے دو زینوں والے سٹینڈ پر ایستادہ۔۔مجسمے کا قد اس سے ملتی جلتی سامنے موجود مخلوق کی طرح لمبا ہے اور اس کی دو آنکھیں اور دو دو ہاتھ پیر ہیں جن کے پٹھے خاصے نمایاں ہیں۔۔اس کے سر پر گھنے اور کچھ لمبے بال ہیں اور چہرے پر ناک کے نیچے چھوٹے چھوٹے گھنے بال ہیں۔اس کی ٹھوڑی پر بھی گھنے اور کچھ زیادہ لمبے بال ہیں۔جسم پر بھی چھوٹے چھوٹے بال ہیں۔اس نے ایک پیر پہلے زینے پر رکھا ہے اور دوسرا گھٹنا موڑ کر وہ پاؤں دوسرے زینے پر رکھا ہے۔مجسمے کے نیچے کی عبارت شیری کا دِل دہلا دیتی تھی۔

''یہ ذی روح اب نہیں پایا جاتا۔تقریباً ڈیڑھ سو سال سے بالکل ہی ناپید ہو چکی یہ پتھر سی مخلوق آج کی موجودہ قوم انسان کی جانی دشمن تھی جس کے تئیں اُس میں حسد کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔یہ جاندار اس قوم کی ترقی میں طرح طرح سے رکاوٹیں ڈالتا اور اس کو اذیتیں دیا کرتا تھا۔ یہ جاندار جنگ و جدل میں یقین رکھتا تھا اور اس پر فخر کرتا تھا۔اپنی خوشی کے لئے کسی بھی حد تک جا سکتا تھا۔''

یہ اس زمانے کی بات ہے جب سائنس کی ایک حیرت انگیز دریافت نے دنیا کو چونکا دیا تھا۔

شیری نے اس کی تفصیل کہیں پڑھی تھی۔ گو کہ یہ اس کا موضوع نہ تھا مگر چونکہ نصاب میں اس کی ایک خاص اہمیت تھی اس لئے سکول کے آخری درجے تک کم از کم اس کی تعلیم ضروری تھی۔اس کے علاوہ اس موضوع میں تحقیق و تنقید، اقتصادیات اور سائنس کے مضمون کی طرح اہمیت کی حامل مانی جاتی تھی۔

حیران کن دریافت یہ تھی کہ عورت اب مرد کے تعاون کے بغیر اولاد پیدا کر سکتی تھی۔اپنے ہی جسم

کے ایک خلئے کے ذریعے۔ مگر اولادِ زینہ کے لئے پھر مرد کا تعاون ہی ضروری تھا۔ اس خبر سے عورت ذات کی تانیثی تنظیموں کی کچھ اہم ارکان نے ایک خفیہ منصوبہ بنایا اور ایک ایسی تنظیم تشکیل دی جس کی ہر رکن کے پاس ایک ایسا تجربہ ہونا لازمی تھا جسے وہ وقتِ ضرورت عام کر کے اپنے مشن میں کامیابی حاصل کر سکے۔ اس تنظیم میں بڑے اہم نام تھے۔ جو بعد کو صدیوں تک زبان زد رہے تھے۔

پہلا نام قارا تاز کا تھا۔ اس نے ساری عمر مردوں سے نفرت کی تھی اور ان کے خلاف لکھی اپنی کتابوں میں انہیں بیوقوف ثابت کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی مگر پچپن سال کی عمر میں اپنے سے بیس سال کم عمر کے مرد سے شادی کر لی۔ پھر اُسے ایک نوعمر لڑکی سے عشق میں مبتلا دیکھ کر گوشہ نشین ہو گئی۔ شرمندہ سی قارہ تاز نے تنظیم میں شامل ہونے کے لئے فوراً ہاں کر لی تھی۔

دوسری رکن کا نام کمہ ساطی تھا۔ وہ کسی زمانے میں ایک فعال تانیثہ بن کر ابھرنے ہی والی تھی کہ اسے محبت ہو گئی اور شادی کر بیٹھی۔ اس کے شوہر کا ایک پاؤں نقلی نکلا جو اس نے شادی سے پہلے کمہ ساطی سے چھپائے رکھا تھا۔ اور کمہ ساطی اسے چھوڑ کر پھر سے فیمنسٹ گروپ میں جا ملی۔ وہ بھی نئے آئڈیا کو اپنے گناہوں کا کفارہ سمجھ کر تنظیم میں شامل ہو گئی۔ تنظیم میں شامل ہونے والی ایک اور اہم رکن ڈاکٹر بدنی تھی جو غیر شادی شدہ تھی اور جانے کس سبب سے خواتین کی کچھ ایسی حامی تھی کہ مرد ذات کی دشمن جانی جاتی تھی اور یہ ثابت کرنے پر تیار رہتی کہ مرد آپس میں ہی ہر طرح کی محبت کرنے میں خوش ہیں اور آئے دن یہ معاملے سامنے آتے ہیں بلکہ اب یہ معاملے اتنے عام ہیں کہ سامنے ہی رہتے ہیں۔ اور یہ عورت کو اپنا دشمن خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ دیکھنے میں ڈاکٹر بدنی کسی مرد سے کم نہیں نظر آتی تھی۔ اس کے میٹرنٹی اینڈ فرٹیلیٹی ہوسپٹل میں ایک بھی مرد ملازم نہیں تھا۔ اپنی ہم مزاج خواتین کا عملہ اسے آسانی سے مل گیا تھا۔

چوتھی رکن ایڈووکیٹ زازی رِڈ نے اپنے بچپن کے ہم جماعت اور ہم پیشہ سے شادی کی تھی جو اسے بہت چاہتا تھا مگر اس کی ذہانت سے عدم تحفظ کا شکار ہو کر اسے بہانے بہانے سے بہت مارتا بھی تھا۔ زازی رِڈ نے اس سے رشتہ توڑ لیا۔ اور میڈیا کے ذریعے عورتوں پر بالواسطہ یا بلاواسطہ تشدد کے خلاف مہم چلائی تھی۔

اور پانچویں رکن سوشل سائنٹسٹ ریز ایَر نے میڈیا کے ذریعے کئی ٹھوس تجربے عام کر کے یہ ثابت کرنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی کہ جنگ اور خونریزی کا واحد ذمہ دار مرد ہے جو لالچ یا انا کی تسکین کے لئے کسی ملک پر بم برسا سکتا ہے۔ اور یہ کہ لڑکے ہی بڑے ہو کر تشدد کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ اور بچپن

سے ہی پُر تشدد کھیلوں کو اپنا کر خوش ہوتے ہیں۔ اگر ان میں کوئی اتفاق سے عورت جیسا دل لے کر پیدا ہوتا بھی ہے تو وہ بھی اکثر حالات میں باقی برے مردوں کا اثر لے لیتا ہے اور ان جیسا ہی بن جاتا ہے۔ اس لئے اس صنف کی موجودگی کو غیر ضروری سمجھا جانا دُنیا کے منظر نامے کی موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر، نہایت ضروری ہوگیا ہے کہ اسی سے انسانیت کا مستقبل محفوظ رہ سکتا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ اب اور بھی کئی طریقوں سے دنیا کو نیست و نابود کرنے پر تلے ہیں۔ کہیں پورے کے پورے برِاعظم کو ایک ہی بم سے اڑانے کے تجربوں کی کوشش میں ہیں۔ اور کہیں بگ بینگ تھیوری کو ایک کھیل کی طرح مصنوعی طریقے سے کھیلنے کا منصوبہ بنا کر، جس میں دنیا کے عالمِ وجود میں آنے کی اصل صورتِ حال سے آشنا ہونے کے ان کے دیوانے شوق کی تکمیل کا کم، اور کُل عالم کے نیست و نابود ہونے کا کئی درجے زیادہ خطرہ ہے کہ اب یہ سائنس کے نام پر انسانوں اور حیوانوں کو ملانے لگے ہیں۔ نئے ذی روحوں کے ڈھانچے تشکیل کرنے لگے ہیں۔

یہ لوگ دوسروں کو اپنا شکار سمجھتے ہیں۔ انہیں اپنی تفریح کا سامان سمجھتے ہیں۔ سائنس کے نام پر ان سے جیسے چاہے کھیلتے ہیں اور جیسے چاہیں گے کھیلا کریں گے۔ اب یہ کسی کے بھی جذبات اُن کی فطرت سے زیادہ کر دیں گے۔ اور کہیں ان کی اصلیت سے ان کے جسم کم بنا دیں گے۔ اب یہ تماشہ گر دنیا کو تماشا گاہ بنانے پر تُل گئے ہیں۔ جس میں بہت سے سرمایہ دار نما سیاستدان اور بہت سے سائنسدان رہ جائیں گے اور باقی ذی روح ان کے تجربے کا خام مال، کہ ان کے جینے کی طرز اور مرنے کے اسباب کے وہی مختار ہوں گے۔

یہ ساری تقریر براہِ راست برقی رابطوں کے ذریعے بیک وقت تمام ممالک میں عام کی گئی۔

ایسی باتیں عقل کو لگتی تھیں۔ اور عام اذہان کے جذبہ بغاوت کی تسکین کا سامان کرتی تھیں اور اس طرح شدت پسند تانیثاؤں کا کام آسان بھی۔

ان سب محترماؤں نے فرداً فرداً منظم طریقے سے مسلسل دو دہائیوں تک عالم بھر میں مردوں کے خلاف مہم چلائی اور پھر سب نے ایک جگہ جمع ہو کر ایک لائیو پریس کانفرنس میں دنیا بھر کی خواتین سے اپیل کی کہ وہ مردوں کا مکمل بائیکاٹ کر دیں کہ اس صنف کی اب دنیا میں قطعی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ اگر یہ ناپید نہ ہوئے تو پوری دنیا کو ختم کرنے سے پہلے یہ عورت ذات کو ضرور ختم کر دیں گے کہ عورت کے قدرتی تخلیق کار ہونے کے سبب اور اولاد پر مالکانہ حقوق جتاتے وقت یہ ویسے ہی عدم تحفظ کا شکار رہتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کل کو کوئی ایسی ایجاد کر دیں کہ نسل بڑھانے کے لئے انہیں ہی عورت کی ضرورت نہ پڑے۔ اس

لئے بہتر یہ ہے کہ ان کی ہی نسل روک دی جائے۔

ایسی باتوں کا اثر عورتوں کی نفسیات پر ہوتا دکھائی دے رہا تھا جس کا ثبوت میڈیا کے ذریعے سوال جواب یا لائیو مباحثے تھا۔ اور اگلے دن اخباروں میں اس پریس کانفرنس کے خوب چرچے تھے کہ ہر شعبے میں خواتین کی ایک خاصی تعداد موجود تھی جن میں اُن کی ہم خیال خواتین بھی اچھی خاصی تھیں جنہوں نے اس معاملے کی ہر طرح تشہیر کی۔

وقت تیزی سے بدل رہا تھا اور خیالات بھی مگر اس کے باوجود تنظیم کی ان پانچ اراکین کی حیات میں مردم شماری میں مردوں اور عورتوں کے تناسب میں کچھ نمایاں تبدیلی محسوس نہ ہوئی۔ لیکن دنیا کے ہر کونے میں ان کی ہزاروں پیروکار ضرور پیدا ہو گئی تھیں جو اُس صدی کے اختتام تک لاکھوں میں بدلتی گئیں اور پھر مردوں کی گنتی میں حیرت انگیز طور پر کمی واقع ہونے لگی کہ جس رفتار سے عورتوں کی تعداد بڑھی تھی، اسی رفتار سے مردوں کی تعداد گھٹ گئی تھی۔ گو کہ کہیں کہیں کچھ فکر مند سائنسدانوں نے کچھ 'وائی' کروموزومز، محفوظ کر لئے تھے اور وہ اپنی زندگی جی کر اور مستقبل کے لئے بھی کچھ حفاظتی اقدامات کر کے ہی دنیا سے گئے تھے۔ مگر مخالفین کا غلبہ ایسا تھا کہ تعداد گھٹتی ہی گئی اور اُس سے اگلی صدی کے اختتام تک دنیا ایسی بدلی کہ اطفال میں سب بچیاں ہی تھیں اور مرد ذات کا کہیں نام و نشان تک پایا نہیں جاتا تھا۔ آرکائیوز میں سے ایسی فلمیں تک ضائع کر دی گئیں جن میں محبتوں کا ذکر تھا۔ اور وہ بھی جن میں جنگ و جدل کے قصے تھے کہ گھروں سے ویسے ہی تصاویر اور نشانیاں مٹ گئی تھیں کہ تیسری چوتھی نسل کے بعد آنکھ سے اوجھل لوگوں کے تئیں جذباتی لگاؤ کے فقدان کے سبب کوئی محفوظ نہیں رکھ پاتا ہے یادوں کو۔ اور اس کے ساتھ ہی مثبت سائنسی رجحان اور نئی ٹیکنالوجی سے ممالک خود کفیل تھے اور جنگیں نہیں ہوتی تھیں۔ زمانہ اپنی رفتار سے ہمیشہ کی طرح انجان منزلوں کی جانب گامزن تھا۔

اب عجائب خانوں میں مردوں کے مجسمے اور تصاویر نظر آتیں۔ بڑی بوڑھیاں مردوں کی کہانی سنایا کرتیں جو انہوں نے اپنی بوڑھیوں سے سنی تھیں کہ ان میں سے کسی نے مرد ذات کو نہیں دیکھا تھا۔

شیری کی نانی نے بھی اپنی نانی سے سنی تھی کہ اُس نانی نے اس کی اپنی نانی کے حوالے سے سنی تھی۔ اور سینہ در سینہ چل رہی داستانیں بڑی خوفناک اور دلچسپ ہوا کرتی۔ اونگھ رہی بچیاں ڈر کر دبکنے لگتیں مگر تجسس کے مارے پھر سر نکال کر پوچھتیں کہ نانی پھر کیا ہوتا تھا۔

شیری بھی پوچھا کرتی تھی۔ اور نانی پھر اپنی نانی کی نانی کی اطلاعات کے مطابق کہتیں کہ اس کی نانی نے کیا سنا تھا۔

''وہ بالکل ہمارے جیسے نظر آتے تھے۔ مگر ہم سے کچھ بڑے ہوتے تھے۔ اور ہم جیسی سب کی سوچ کو کچلنے پر تیار اور جسم کو نگلنے پر آمادہ۔۔ ہم لوگوں کو پریشان کرنا اپنا حق سمجھتے تھے۔۔''

نئی ایجادات اور مصنوعات سے صحت مند نظر آنے والی نانی کہیں سے روایتی نانی ایسی نہ تھیں۔ ماسوائے اس کے کہ ممتا کی فطری روایت سائنس کی ترقی کے باوجود بدلی نہیں جا سکی تھی۔ نانی ٹیلی وژن کے سکرین جیسی کسی شے پر نظریں جماتیں ہوئی جمائی لیتیں۔

''پھر۔۔؟''

شیری ان کے چہرے پر اپنی ملائم انگلیاں رکھ کر ان کا منہ اپنی طرف موڑتی۔

''اور کیا کرتے تھے نانی۔۔؟''

''ہم لوگوں کو تکلیف دیتے تھے۔۔ عجیب عجیب طرح سے۔۔ ذہنی اور جسمانی۔۔ اور ہاں ان کی ناک کے نیچے بال اگتے تھے۔ جنہیں ان میں سے اکثر بڑھا کر بڑے سٹائل سے تراشا کرتے تھے اور یہ بال کھاتے پیتے ان کے منہ میں گھس جاتے تھے۔

''اوہ۔۔ چھی۔۔ گندے۔۔''

شیری اپنی ناک پر انگلی رکھ کر سر ہلاتی۔

''ان کی آواز بالکل الگ تھی۔۔ شیر کی دھاڑ جیسی۔۔ اور ہنسی ایسی کہ جیسے سمندر طوفان کے وقت چنگھاڑتا ہے۔۔ بس یہ سمجھو کہ وہ کہیں سے انسان نہیں تھے، بھلے ہی انسان سے نظر آتے ہوں۔۔''

اس دن نانی ماں بات کرتے، گاہے گاہے ٹیلیوژن جیسی چیز پر نظر ڈالتے اونگھ گئیں تھیں۔ اور شیری سوچوں میں کھوئی جاگتی رہی تھی۔

اس وقت انجان ساحل پر کھڑی پھٹی آنکھوں سے سامنے ایستادہ مخلوق کو ہونٹوں پر ہاتھ دھرے دیکھتی شیری نے جھرجھری سی لی۔

اب تک وہ خاموش اسے دیکھتا رہا تھا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر بائیں جانب ایک خم سا نمودار ہوا جسے دیکھتے ہی شیری ایک قدم پیچھے ہٹی۔

اس شے کے ہونٹوں کے نیچے بھی گھنے گھنے سیاہ بال ہیں اور اس کا قد شیری سے لمبا ہے اور

شانے چوڑے ہیں۔ اس کی ٹھوڑی پر بھی گھنے گھنے بال ہیں۔ اس کی آنکھیں کیسی کالی کالی ہیں۔ چمکیلی سی (نانی نے یہ کبھی نہیں بتایا تھا)۔ اور اس کے ہونٹ کا خم۔۔ مسکراہٹ پر مائل سا نظر آنے والا خم۔۔ کیسا جاذب سا ہے (جب کہ قاعدے سے ایسا ہونا نہیں چاہئے)۔ اس کی کسی ساتھی کی مسکراہٹ ایسی نہیں تھی۔ اور نہ گھر میں کسی کی۔۔ تو یہ ہی ہے مرد۔۔ مگر کون جانے بلا سبب پر کشش نظر آنے والا یہ خم، غصے میں آنے اور حملہ کرنے کا پہلا قدم ہو۔

جانے اب وہ اس پر کس طرح حملہ آور ہونے والا ہوگا۔

اس خیال کے آتے ہی شیری اپنا توازن کھو کر پھر ریت اور کیچڑ میں گر گئی۔ مرد پر اس کی نظریں جمی رہیں۔

اب۔۔ اب یہ شیر کی طرح دھاڑے گا اور اسے اذیت دے گا۔۔ اسے وہاں سے بھاگ جانا چاہئے۔۔ کہیں بھی۔۔ بھلے ہی واپس پانی کے اندر۔۔

شیری حملے کا اندازہ لگانے کے لئے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ مرد اسے دیکھتا رہا اور مسکرا دیا۔ پھر اس نے جھک کر اپنا ہاتھ شیری کی طرف بڑھایا کہ وہ اس کے ہاتھ کے سہارے اٹھ سکے۔ شیری نے اس کا ہاتھ نہیں تھاما اور سر اوپر کئے اسے دیکھتی رہی۔ کئی لمحے جب وہ اس کے اٹھنے کے انتظار میں جھکا رہا اور وہ نہیں اٹھی تو یکلخت اس نے اس کا بازو پکڑ کر اوپر اٹھالیا۔ شیری کے ہونٹوں سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکلی تو مرد مسکراتے ہوئے کچھ بولا بھی تھا۔ شیری کی گھبرائی نظروں میں حیرت شامل ہوگئی۔ اس کی آواز شیر کی دہاڑ جیسی نہیں تھی۔ برستی ہوئی بارش جیسی لگی تھی۔ اور جب اس نے اس کا بازو پکڑ کر اٹھایا تھا تو اس کی گرفت بھی کسی پنجے یا شکنجے سی نہیں تھی بلکہ ایسی ہی دوستانہ تھی جیسی نانی اور اس کی ماما دونوں نے اسے تھام رکھا ہو۔ یا جیسے انسٹیٹیوٹ میں ساتھیوں کی تھی۔ مگر اکثر اس کے ساتھ رہنے والی کچھ بھاری جثے کی ساتا جیسی کہیں سے نہ تھی۔ ساتا کی دبلی انگلیاں اس کے بازو میں پیوست سی ہو جاتیں تھی۔ مگر مرد کے ہاتھوں کی انگلیوں کی مضبوطی کے سہارے اٹھتے وقت شیری کی ذرا بھی طاقت نہیں لگی تھی۔

مرد حیرتوں میں ڈوبی شیری کا شانہ تھامے کچھ دور تک اسے اپنے ساتھ چلاتا رہا پھر آگے بڑھ گیا۔ شیری دو ایک پل رک کر سنسان، اجنبی اور کچھ عجب سی روشنی میں ڈوبے ریگزاروں کو دیکھا کی۔ یہ روشنی ہلکی تھی نہ تیز۔ مگر خاصی واضح تھی۔ اور آسمان بھی بہت اونچا نہ تھا۔ بلکہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آسمان کے بعد بھی کوئی چیز ہلکے رنگوں کے شامیانے کی طرح تنی ہے۔ شیری نے سر ہلکے سے جھٹکا اور اس کے پیچھے پیچھے زمین کی طرف دیکھتی چلنے لگی کہ وہ خطرناک معلوم نہیں ہوتا تھا اور شیری کے پاس دوسرا کوئی

راستہ بھی نہ تھا۔ اُن کا رُخ جنگل کی طرف تھا۔ کچھ دیر تک آہستہ چلنے کے بعد مرد کی رفتار تیز ہوگئی۔ وہ دوڑتا تو شیری بھی دوڑنے لگتی تھی۔ دور دور تک اور کوئی نہیں تھا۔

یہ جنگل ایک دیو قامت چٹان پر تھا اور بہت سا چلنے کے بعد اچانک ایسے راستے کی اور مڑتا تھا جہاں صرف داہنی اور بائیں جانب سے سورج کی روشنی آتی تھی گویا پہاڑ کی قوی ہیکل چھت تلے ایک اور دنیا آباد تھی جو مکمل روشن تھی مگر جنگلوں کی بہتات اور کئی میلوں تک اٹھی آڑی چٹان کے سبب اوجھل بھی تھی۔ آڑی چٹان پر دیوہیکل درختوں کا ایک لامنتہا سلسلہ تھا اور یہ چٹان جیسے دونوں جانب سے جھبے والی ٹوپیاں پہنے ایستادہ تھی اور ساحل ایسے ڈھکا تھا کہ چٹان کے نیچے سے گزرے بغیر ساحل کا نظر آنا ممکن نہ تھا۔ مگر سارے منظر میں روشنی بھی تھی اور سورج کی کرنیں بھی ادھر اُدھر رقص کرتی پھرتی تھیں۔

جس راستے سے وہ گزر رہے تھے وہ راستہ کچا تھا۔ اطراف اونچے اونچے درختوں پر پرندے ادھر اُدھر شور مچاتے پھرتے تھے۔ کچھ پرندوں کو وہ پہچانتی تھی۔ کچھ اس نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو اس نے عجائب گھر میں عنقا ہو چکے پرندوں کی حنوط شدہ شکل میں دیکھے تھے۔ مگر سب کی بولیاں بڑی سریلی تھیں۔ کچے راستے سے نکلنے والے اور راستے پھولوں اور پھلوں سے بھرے نظر آرہے تھے۔ اب وہ کسی وادی میں آگئے تھے۔ دور دور تک پکے اناج والے سنہرے کھیت تھے۔ لکڑی اور گھاس کی گول، چکور، آڑی اور سیدھی چھتوں اور بڑے بڑے باغیچوں والے گھر تھے۔ سواری کے جانور تھے مگر گاڑی قسم کی کوئی چیز نہیں تھی۔

آگے چلتا ہوا مرد اسے پلٹ کر دیکھ لیتا تھا اور جہاں راستہ تنگ یا پانی سے بھرا ہو تو اس کے لئے جگہ چھوڑ کر رک جاتا اور اس کے گزرنے کے بعد خود گزرتا۔

کچھ دیر بعد وہ ایک بڑے سے باغ میں پہنچ گئے تھے جہاں شیری نے اپنے جیسی بہت سی لڑکیاں اور اس مرد جیسے بہت سے مردوں کے علاوہ ہر عمر کے مرد عورت دیکھے۔ یہاں عورتوں کے چہرے اس کی دنیا کی نسبت پرسکون معلوم ہوتے تھے۔ مرد نے شیری کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے ایک اور ہم عمر مرد سے دھیرے سے کچھ کہا۔ دھیمے لہجے میں اس کی آواز گٹار کے نچلے سروں سی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی بات پر اس کا ساتھی قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ اس آواز پر شیری نے پھر حیرت سے دیکھا۔ قہقہہ پہاڑی جھرنے کی طرح اس کے ساتھی کی مضبوط گردن کے حلقوم سے ابھرا تھا۔ کسی جانور کے کھال سے ڈھکے اس کے چست پیٹ کے اوپر چھاتی کچھ اور پھیل گئی تھی۔ قہقہہ سن کر سوکھی گھاس کو گٹھوں میں لپیٹتی ایک لڑکی نے پلٹ کر دیکھا اور قہقہہ لگانے والے مرد کے پاس آگئی۔ مرد نے اسے بھی اپنی زبان میں کچھ

کہا تو دونوں ہنس پڑے۔ اس ہنسی پر شیری مزید ایک بار چونکی کہ اس کے کان عورت اور مرد کی ملی جلی ہنسی سے نا آشنا تھے۔ اس مشترکہ ہنسی میں بانسری اور سرود کے سُر ملے ہوئے تھے۔ جیسے برسنے پر آمادہ بادلوں کی گرج کے درمیان کوئی بلبل گا رہی ہو۔ شیری کی حیرت پر اس لڑکی نے مسکرا کر مرد کی آنکھوں میں دیکھا اور اس کے چہرے کے قریب اپنا چہرہ لے جا کر کچھ بولی۔ مرد بھی مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کچھ کہنے لگا۔ وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ شیری نے اس طرح کا کوئی منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ چرند و پرند قہقہہ لگاتے ہیں نہ مسکراتے ہیں۔ جانوروں میں نر اور مادہ آپس میں باتیں ہی کرتے ہیں نہ آنکھوں میں دیکھتے ہیں۔ انسان کو قدرت نے بولنے، مسکرانے اور آنکھوں کو دل کی جگہ استعمال کرنے کی راحت عطا کی ہے۔ آج سے قبل شیری نے قدرت کے بنائے ہوئے جو جوڑے دیکھے تھے اُن سے انسانوں کا جوڑا سب سے الگ، سب سے اشرف تھا۔ سب سے مکمل اور سمجھدار معلوم ہوتا تھا کہ بات کر کے دل کی بات کہنے کی قدرت رکھتا تھا۔ شیری ہر بات کو بغور دیکھتی۔ سمجھنے کی کوشش کرتی اور اس میں کامیاب ہوتی۔ گو کہ ہر بات اس کے لئے نئی تھی۔ اور، بہت سی نئی باتیں اس کی منتظر تھیں۔

پھر مرد نے شیری کو دیکھ کر عورت سے کچھ کہا تو عورت کا چہرہ یکا یک بجھ سا گیا۔ وہ کچھ لمحے شیری کی طرف بغور دیکھتی رہی پھر اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں شکوہ بھر کر اپنے ساتھی کی طرف دیکھا اور پلٹ کر واپس گھاس کے ڈھیر کی جانب چل دی۔ مرد نے مسکراتے ہوئے اسے پکارا۔ اس نے مُڑ کر نہیں دیکھا تو وہ بھی اس کے پیچھے گھاس کی ڈھیری کی طرف لپکا۔ وہ سر جھکائے کام میں مصروف بنی رہی۔ وہ اس کے قریب جا بیٹھا۔ پھر کبھی ہنستا اور کبھی مسکرا مسکرا کر اسے کچھ کہتا رہا۔ وہ اس کی طرف سے منہ پھیر لیتی تو وہ اس کے چہرے کے رخ پر سامنے چلا جاتا۔ لڑکی اسے نظر انداز کرتی رہی۔ اس نے جیسے اس سے نہ بولنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ یہ حالت دیکھ کر مرد کچھ پل اسے سنجیدگی سے دیکھتا رہا پھر اس نے لپک کر لڑکی کو گود میں اٹھا لیا اور گول گول گھومنے لگا۔ لڑکی نے مسلسل سنجیدہ صورت بنائے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی مگر پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی اور لڑکے کے گلے میں باہیں ڈالے اس کی گود میں جھولتی رہی اور اس وقت تک ہنستی رہی جب تک وہ اسے گود میں گھماتا اس کے ساتھ ہنستا رہا۔ پھر لڑکا جب لڑکی کا بوجھ اٹھائے اٹھائے تھک گیا تو لڑکی کو گھاس کی ڈھیری پر پٹخ کر زور زور سے ہنستا وہاں سے بھاگا اور لڑکی زور سے ہنس کر ہلکے سے چلائی اور اٹھ کر اس کے پیچھے بھاگی۔ یہاں تک کہ دونوں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ شیری کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ناچ رہی تھی اور اسے یاد ہی نہ تھا کہ وہ گھر میں نہیں ہے بلکہ بھٹک کر کسی اور ہی دنیا

میں پہنچ گئی ہے۔ایسا منظر بھی شیری نے کبھی دیکھا تھا نہ تصور کیا تھا۔ان دونوں کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی شیری نے محسوس کیا کہ وہ بڑی دیر سے مسکرا رہی ہے اور ساحل سے ساتھ آنے والا لڑکا ہونٹوں کو بائیں جانب خم سا دئے گویا مسکراہٹ پر آمادہ اسے دیکھ رہا ہے۔شیری کی اس پر نظر پڑتے ہی وہ مسکرا دیا۔ اور اسے دیکھتا رہا، ایسے ہی جیسے کچھ دیر پہلے گھاس لپیٹنے والی لڑکی کو اس کا ساتھی دیکھ رہا تھا۔شیری بھی اسے دیکھتی رہی۔اس کا دل اس کے چہرے سے نظریں ہٹانے کو نہ چاہتا تھا اور وہ جیسے بے بس سی اس کی گھورتی ہوئی آنکھوں کو دیکھتی جا رہی تھی۔مگر شیری کو اس بے بسی کا کوئی غم نہ تھا۔

یہ کیسی بے بسی ہے۔۔

اسے اس مجبوری سے ایسی راحت کیوں مل رہی ہے۔۔

یہ دل کے اندر کوئی راگ سا کیا چھڑ گیا ہے۔۔

یہ روح اتنی پُر سکون کیسے ہو گئی ہے۔۔

یہ زندگی اتنی آسان سی کیسے لگ رہی ہے۔۔

اور۔۔اور۔۔ یہ زندگی اس کی زندگی سے کتنی بہتر ہے۔۔ کتنی اصلی اور کیسی فطری ہے۔۔

اس لڑکے کی آنکھوں نے اس کی آنکھوں تک یہ کیسا سلسلہ سا باندھ دیا جسے توڑنے کی اس میں ہمت ہی نہیں۔۔

اور جب۔۔جب ساتا اسے دیکھتی تھی تو۔۔

شیری کے چہرے پر سنجیدگی سی چھانے لگی تھی اور ساتا کے دیکھنے کے خیال سے اسے عجیب سی بیزاری کا خیال آیا اور پھر گھن سی آنے ہی لگی تھی کہ اس نے فوراً لڑکے سے نظر ملنے کے احساس کو دوبارہ خود پر حاوی کیا اور مسکرا اٹھی۔

وہ کتنی خوش نصیب ہے کہ اس نے زندگی کی اصل صورت دیکھ لی۔۔

وہ کسی جادوئی طاقت کے زیر اثر لڑکے کو دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ کچھ بچے کسی جانب سے دوڑتے ہوئے آئے اور ان کے پیچھے ایک ادھیڑ عمر عورت۔اس عورت نے دلچسپی سے شیری کو دیکھا اور بچوں سے کچھ کہا۔ان کے پیچھے ایک سفید ڈاڑھی والا بزرگ سا آدمی ایک بچے کو گردن پر بٹھائے آ رہا تھا۔ اور ان کے پیچھے ایک نوجوان جوڑا۔

بچے ادھر ادھر دوڑتے پھرتے کھیلنے لگے اور ایک بہت چھوٹا سا ننگ دھڑنگ بچہ شیری کی طرف دوڑا اور آدھے راستے میں رک کر اسے دیکھ کر شرماتا سا ٹھہر گیا اور پھر کچھ پل بعد مسکرا دیا تو شیری کو

ہنسی آگئی۔ وہ اسے غور سے دیکھتی مسکراتی رہی کہ بچے بھی بچیوں کی طرح معصوم ہوتے ہیں اور ویسے ہی پیار کرنے اور پیار چاہنے والے بھی۔

تو جو اس نے آج تک پڑھا، سنا، جانا، سمجھا، سب جھوٹ تھا۔۔ سب غیر فطری اور غلط تھا۔۔

شیری کے چہرے پر تناؤ ابھر آیا۔۔ اس نے سر جھٹک کر دوسری طرف دیکھا۔

اور۔۔ اور گھناؤنا بھی۔۔ اس کی نظروں میں ساتا کا سراپا گھوم گیا۔ اسے عجب سی کراہیت کا احساس ہوا۔

ایسی مثال درندو چرند میں کیا، پرندو حشرات الارض میں بھی نہیں مل سکتی کہ جسمانی ساخت میں بالکل اپنی سی صنف سے مخالف صنف کا سا غیر فطری طور پر اپنایا گیا فعل۔۔ محض کسی بیمار تجسس کی تسکین کے لئے۔۔ غیر متوازن نفسیات کے جنونی غلبے میں خود کو بے قابو ہو جانے دے کر۔۔ اپنے غلط عمل کو صحیح ثابت کرنے کی ناکام کوشش میں دوسروں کو ان عادات کا شریک بنانے کا صدیوں پر محیط مسلسل عمل اور معصومیت کا استحصال۔۔ اور پھر ایسے ذہنی مرض کو فطری ظاہر کرنے کے لئے احتجاجات بھی اور ہم خیالوں سے ان رجحانات کے تحفظ کی سند بھی۔۔ جبکہ فطرت نے انسان کو مکمل بنایا۔۔ ہر ذی روح کی طرح۔۔ ایک جوڑے کی صورت۔۔ ایک منطق کے تئیں۔۔

ادھیڑ عمر عورت نے شیری کو سوچوں میں گم دیکھا تو قریب آگئی اور سر کے اشارے سے ساتھ چلنے کو کہا۔ شیری پلٹ پلٹ کر ساحل والے لڑکے کو دیکھنے لگی تو عورت نے اپنی زبان میں لڑکے سے کچھ کہا۔ چھوٹا سا وہ گھر بڑا پر سکون تھا۔ جہاں شیری نے تازہ دم ہو کر نوجوان کے ساتھ پھلوں کا ناشتہ کیا تھا۔ اور کوئی شربت پیا تھا۔ شیری ایسی پر سکون تھی جیسے اس کا جہاز ڈوبا ہی نہ۔ ایسی مطمئن تھی جیسے وہ گھر سے دور ہو کر گم ہی نہ ہوئی ہو۔ ایسے خوش تھی جیسے خوشی اس نے پہلی بار محسوس کی ہو اور ایسے خاموش تھی جیسے کچھ حاصل کرنے کو باقی نہ رہا ہو اور زندگی اس نوجوان کے ہمراہ رہ جانے کا نام ہو۔

اور وہ وہیں رہ گئی۔ اپنی تہذیب یافتہ دنیا سے کہیں زیادہ مہذب اور سچی دنیا میں۔ جہاں تک مشینوں اور مشینی خیالات کی رسائی نے انسانوں اور فضا کو آلودہ نہیں کیا تھا۔ دنیا کا یہ اوجھل حصہ برباد ہونے سے بچ گیا تھا۔ شیری نے ان کی زبان سیکھ لی اور ان میں رچ بس کر اس ماحول کا حصہ ہو گئی۔

کئی مہینے بعد جب اس کے اندر اس کے ساحل والے ساتھی کا بچہ ننھے ننھے ہلکوروں سے اپنے ہونے کا احساس دلانے لگا تو وہ اپنے ساتھی کا ہاتھ تھامے سرشاری کے عالم میں اس مقام کی طرف نکل آیا کرتی جہاں زندگی سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔

وہ ایک دلفریب شام تھی جب اس نے دیکھا کہ سمندر نے اس کا جہاز اگل دیا ہے۔خوش ہونے کی بجائے اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا کہ جہاز میں لگے آلات کی مدد سے اسے ڈھونڈ نکالا جاسکتا تھا۔ اور وہ شدت غم سے خود کلامی سی کرنے لگی تو اس کے ساتھی نے اس کا سر اپنی چھاتی سے لگالیا۔

اب۔۔اب۔۔اس کی مسرتیں اس سے چھین لی جاسکتی ہیں۔۔شیری نے جھرجھری سی لی۔

اور۔۔اور اس مقام کی معصومیت نوچ لی جاسکتی ہے۔شیری کا چہرہ پیلا سا پڑ گیا۔

اس کی دنیا تہہ وبالا ہوسکتی ہے۔۔اور وہ اگر اپنے ساتھی کو اپنے ہمراہ لے جائے تو کون جانے اس کے ساتھ کیا سلوک۔۔اس کے ساتھی کی زندگی کو خطرہ ہوسکتا ہے۔۔

شیری ایک چیخ مار کر بے خودی ہوگئی۔اس کے ساتھی نے اس کا سر اپنی گود میں لے لیا۔اور اس کا ماتھا سہلاتا رہا۔شیری نے آنکھیں کھولیں اور جہاز کی طرف گردن موڑی۔ پھر کچھ لمحوں بعد اٹھ کر جہاز کے قریب چلی گئی۔

جہاز میں بہت زیادہ خرابی پیدا نہیں ہوئی تھی۔وہ جانتی تھی کہ جہاز کو کیسے ٹھیک کیا جاسکتا ہے۔ وہ سگنل ریسیو کر رہا تھا۔بس چند ایک بٹن دبانے کی دیر تھی جس کے بعد اس کا اپنی دنیا سے رابطہ ہوسکتا تھا۔ اور شیری یہ بھی جانتی تھی کہ سگنلز ہمیشہ کے لئے کیسے بند ہوسکتے ہیں۔

اس نے نظر گھما کر نوجوان کی طرف دیکھا۔اُس کی آنکھوں میں خوف کے سائے سے لہرا رہے تھے۔تکنیکی دنیا کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا اور اس بات کے علاوہ کچھ نہیں سمجھتا تھا کہ اس کے بچے کی ماں اس کے پاس ہے اور وہ دور بھی ہوسکتی ہے۔اس نے شیری کے شانوں کو ہاتھوں سے تھام لیا۔ اس کی باہوں میں شیری کے مستقبل کا تحفظ تھا۔اس کی گہری گہری آنکھوں میں وعدے تھے۔اس کے چہرے پر دکھ اور سکھ بانٹنے کا عزم تھا۔پریشان سی پیشانی پر ابھری لکیروں کے اوپر اس کے لہراتے بال اسے مزید حسن بخش رہے تھے۔لانبی لانبی انگلیوں والے اس کے ہاتھ اسی لئے بنے تھے کہ شیری کے کندھوں کو تھام سکیں۔اس کے بازوؤں کی مچھلیاں اسی لئے ابھری ہوئی تھیں کہ شیری کی کمر کو سہارا دے سکیں۔

شیری کی آنکھیں بھر آئیں۔اس نے نوجوان کے کھردرے رخسار کو اپنی نرم انگلیوں سے چھوا اور ایک گہرا سانس لیا۔

یہ راحتیں اس سے چھن سکتی ہیں۔۔اور وہ کبھی کسی کو ان راحتوں کے بارے میں سمجھا نہیں سکے گی۔۔اور۔۔اور ایسی راحتوں سے اس جیسی سوچ رکھنے والی لڑکیاں محروم رہیں گی۔۔ہمیشہ۔۔

ہمیشہ۔۔

شیری نے پلٹ کر شکستہ جہاز کو دیکھا۔

اگر وہ کسی طرح ماما کو اپنا ہم خیال بنا لے تو ایک نئی دنیا کی بنیاد پڑ سکتی ہے۔۔آنے والی نسلیں مکمل پیدا ہو سکتی ہیں۔۔اور آنے والی نسلوں کی تکمیل کی خاطر اسے۔۔اسے۔۔دو جہاں کی فکروں میں غلطاں اس وجیہہ پیشانی سے بچھڑنے کا خطرہ مول لینا ہوگا۔۔

شیری نے جہاز سے نظریں ہٹا کر مرد کے چہرے کی طرف دیکھا پھر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر آہستگی سے اپنے پیٹ کے اطراف رکھ دیئے۔اور پھر اس کے سینے پر اپنا سر رکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔جانے کتنی دیر وہ روتی رہی کہ اچانک اسے محسوس ہوا کہ اس نے ماما کی آواز سنی ہو۔

''اچھا ہوا۔۔اب مجھے گرینی بننے کے لئے کسی ٹام، ڈِک اینڈ ہیری کی ضرورت نہیں پڑے گی۔تم اکیلے مجھے نانی بنا سکتی ہو۔یو کین بی کم اے مام آن یوئر اون، بے بی۔۔''

اس کے کانوں نے سنا تو وہ گھبرا گئی۔اس کے پیٹ میں فطرت کے اصولوں سے الگ کوئی بچہ نہیں ہوگا۔۔کبھی نہیں۔۔اس نے چلا کر کہنا چاہا تو دیکھا کہ اس کی ماما تازہ اخبار کے سائنس والے صفحے کے اسی کالم کو بغور پڑھ رہی ہیں جسے شیری نے کچھ دیر پہلے پڑھا تھا۔اور اخبار، جون سن پچیس سو سات کا نہیں، جون سن دو ہزار سات کا تھا۔اس نے اپنے صندلیں سے پیٹ پر انگلیاں گھمائیں۔اس میں کوئی بچہ تھا نہ اس کی کمر کے گرد کسی حسین نوجوان کی باہیں۔اس انکشاف سے اس کے ہونٹوں پر پُرسکون ہنسی ابھری اور غائب ہوگئی۔اس نے پلٹ کر کھڑکی کی چوکھٹ کے قریب لگی تصویر کی جانب نظر ڈالی۔

''آئی لو یو پاپا۔۔''

وہ تصویر کے قریب چلی گئی اور کچھ اونچی آواز میں بولی۔

''آئی ہیٹ ہم۔۔اوکے؟ نفرت ہے مجھے اس سے۔۔''

ماما نے بھی ذرا اونچی آواز میں کہا۔

''وائی۔۔ماما۔۔؟''

نن آف یوئر بزنیس۔۔''

''نو مام۔۔اٹ از مائی بزنیس۔۔''

''تم کیا جانو صدیوں سے عورت نے کتنا سہا ہے۔۔''

''ہوسکتا ہے اس سے پہلے مردوں نے سہا ہو۔۔یا اس کے بعد سہنے والے ہوں۔۔خواہ مخواہ۔۔''

''فضول کی بحث مت کرو۔۔تم جانتیں ہی نہیں ہماری حیثیت کیا تھی۔۔ترقی اور تہذیب پر فخر کرنے کے باوجود ہمیں کس کس طرح محروم رکھا گیا۔۔شروعات میں ووٹ تک کا حق لینے میں ہمیں صدی بھر کا وقت لگا تھا۔۔سب سے پہلے اٹھنے والی تانیثی آوازوں کو یورپ اور امریکہ جیسی جگہ میں دہائیوں چرچ سے ریکویسٹ کرنا پڑی تھی۔۔پھر ساری دنیا میں پھیلا ہمارا موومینٹ۔۔یا ساتھ ساتھ اپنے انداز میں دنیا بھر میں چلتا رہا۔۔چل رہا ہے۔۔یا چل رہا ہوگا۔۔''

''او کے۔۔بٹ پاپا۔۔''

''یوئر پاپا۔۔مائی فُٹ۔۔وہ بھی ویسا ہی نکلا تمہارا باپ۔۔انسیکیور۔۔اے ٹیپیکل میل شاونیسٹ۔۔''

''او کے۔۔اب ماما۔۔آپ لاگوں نے اپنے حقوق حاصل کر لئے نا۔۔آپ اپنی ہر مانگ قانوناً پوری کرا سکتی ہیں۔۔اب میں۔۔''

شیری نے لمحے بھر کے لئے ماں کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ پھر اٹھ کر کھڑکی کے قریب چلی گئی۔

''تو پھر مجھے بھی ماما۔۔ایک موومینٹ شروع کرنا پڑے گی۔۔اینٹی فیمینسٹ موومینٹ۔۔آئی لو بوتھ آف یو۔۔''

اس نے چوکھٹ کے قریب لگی تصویر کے کانچ پر اپنی نرم نرم انگلیوں سے پاپا اور ماما کے چہروں کو چھوا پھر پلٹ کر ماں کی طرف دیکھا اور مسکرا دی۔

◆❖◆

مہاوٹیں

''می زورہ۔۔''

فون پر زرناب کی کانپتی سی آواز آئی تو مس زہرہ نے جن کا نام کثرتِ استعمال سے می زورہ ہوگیا تھا،فون بے قراری سے کان کے ساتھ جوڑلیا۔

(مس زہرہ اصل میں، مسز زہرہ ہوتے ہی واپس مس زہرہ ہوگئیں تھیں،مگر بعد میں انہیں می زورہ پکارا جانے لگا۔)

''کیاہوازرناب۔۔سب ٹھیک تو ہے نا۔۔؟''

''میں نے۔۔میں نے لبیب کو سب بتادیا می زورہ۔۔مجھ سے رہانہیں گیا۔۔''

زرناب کی آواز میں تھرتھراہٹ نمایاں تھی۔

''اوہ۔۔تو۔۔؟۔۔یہ۔۔یہ تم نے کیا کردیا۔۔''

مس زہرہ حیرت زدہ رہ گئیں۔

''تمہیں اپنے آپ سے یہ کھیل کھیلنے کا حق کس نے دیا تھا زرناب۔۔''

ان کی اپنی آواز کانپنے لگی۔۔وہ جانتی تھیں کہ اب سب ختم ہونے والا تھا۔جس کے لئے انہوں نے اتنی کوششیں کی تھیں، سب رایگاں جانے والا تھا۔

''تم کہاں ہو زرناب۔۔یہاں آجاؤ تم فوراً پھر ساری بات بتاؤ۔۔یہ کیا ہو گیا۔۔تم نے یہ۔۔تم جلدی آجاؤ۔۔''

''آتی ہوں می زہرہ۔۔بیس منٹ میں آپ کے پاس ہونگی۔۔''

زرناب نے آخری جملہ ادا کیا تو اس کی آواز کانپ نہیں رہی تھی۔مگر یہ بات شاید مس زہرہ نے محسوس نہیں کی۔انہوں نے فون واپس رکھ دیا اور بے قراری اٹھ کھڑی ہوئیں۔

یعنی اب۔۔اب زرناب کی زندگی بھی۔۔نہیں ایسا نہیں ہونا چاہئے۔وہ خود کلامی کرتی ہوئیں آیئنے کے سامنے چلی گئیں۔جب سے وہ اکیلی رہنے لگی تھیں، جانے کیسے انہوں نے اپنے سے گفتگو کرنا شروع کر دیا تھا۔مگر یہ بات ان کی عادتوں میں شامل نہیں تھی۔بس کبھی جب ان کا جی چاہے، ورنہ خاموشی سے کام کیا کرتیں۔

انہوں نے آیئنے میں اپنے عکس کو غور سے دیکھا۔کانوں کی لووں تک ترشے ہوئے بالوں کو برش سے سنوارتے ہوئے انہوں نے محسوس کیا کہ وقت ان کے چہرے پر کوئی نشان نہیں چھوڑ پایا۔ آنکھوں کے گوشوں میں کوئی لکیریں نہیں بنیں۔

بالوں کو سیاہ کرنے کے لئے انہوں کبھی رنگ استعمال نہیں کیا۔محض فیشن کے طور پر اپنے سیاہی مائل بھورے بالوں کو زرا ہلکا بھورا کر دیا تھا جو ان کے سرسوں کے پھولوں جیسی رنگت والے چہرے کے ساتھ خوب میل کھاتے تھے کہ سوائے ہونٹوں کے چہرے پر کہیں سرخی کا کوئی شائبہ نہ تھا۔لیکن عارضین پر ایسی تازگی تھی، جیسے لکڑی کی مصنوعات پر چمک کیلئے وارنش کرنے سے آجاتی ہے۔خیر بال رنگے بھی زمانہ ہو گیا تھا۔وہ اب لمبے ہو کر ترشے جا چکے تھے اور نئے سارے سیاہی مائل بھورے تھے۔

ہونٹوں کے اطراف گہری قوسیں بھی نہیں بنی تھیں۔صرف مسکراہٹ کے دوران دو نہایت ہلکی لکیریں پیدا ہو جاتیں جو اضافی چربی سے عاری چہرے پر خاصی جاذب نظر آیا کرتیں کہ ان کے ذاتی نظم و نسق کی قائل اور چاق و چوبند ہونے کی شاہد تھیں۔ پیشانی پر آڑی لکیریں بھی نہیں تھیں۔صرف ابروؤں کے درمیان دو عمودی خط تھے۔اس کی ذمے دار بھی مگر وہ خود تھیں کہ ہر وقت جیسے کوئی الجھن سلجھانے میں مصروف ہوں۔یا کسی مسئلے کا حل تلاش کر رہی ہوں۔گویا ہر وقت سوچوں میں غرق۔

''فراؤن مت کیجئے مِس زہرہ۔ آپ نے تو جھریاں ڈال دیں آئی بروز میں۔۔''

زرناب جب بھی انہیں اس انداز سے محو دیکھتی فوراً کہتی۔

''ٹھیک ہے۔۔اب نہیں۔۔''

مس زہرہ مسکراتیں اور لکیریں غائب ہو جاتیں مگر اگلے ہی پل ابروؤں کے اندر کی جانب کھنچ جانے سے درمیان کی جلد دوبارہ گیارہ کے ہندسے کی صورت ابھرتی تو زرناب سر جھٹک کر مسکرا دیتی۔

''آپ نہیں سمجھیں گی۔۔''

وہ بڑے خلوص سے کہتی۔ اور مس زہرہ چہرہ بے تاثر کرنے کی کوشش میں لمحے بھر کے لئے پھر دونوں خطوط غائب کر دیتیں اور سلسلہ جاری رہتا۔

مس زہرہ نے آئینے میں اپنے ابروؤں کے درمیان کی لکیروں کو دیکھا (گیارہ کا ایک، ایک (ا) قدرے چھوٹا تھا۔) اور اپنی آنکھوں کو بھی۔ جو آج کچھ زیادہ ہی اداس نظر آ رہی تھیں۔

تاریخ ایسے ظالمانہ انداز میں خود کو نہیں دہرا سکتی۔ زرناب کی سب باتوں کو میں جھٹلا دوں گی۔ اس کی معصوم زندگی ایسے ضائع نہیں ہو سکتی۔

اس کے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا۔

مس زہرہ نے اپنے عکس کو دیکھ کر سر نفی میں ہلایا اور برش سنگھار میز پر واپس رکھ کر زرناب کے موبائل پر فون کرنے لگیں۔ مگر ابھی اس کا فون آئے پانچ منٹ ہی ہوئے تھے۔

ناسمجھ لڑکی یہ تو نے کیا کیا۔

مس زہرہ تھکے تھکے سے انداز میں بالکنی میں کھلنے والی کھڑکی کے قریب رکھی اپنی پسندیدہ کرسی پر بیٹھ گئیں۔

ہلکے نصواری رنگ کے فوم والی کرسی مس زہرہ سے بہت ملتی تھی کہ تقریباً روزانہ ہی ان کے استعمال میں آنے والی اس کرسی پر جب مس زہرہ نہیں بیٹھی ہوتیں جب بھی سب کو وہ کرسی پر بیٹھی محسوس ہوتیں کہ کرسی کی پشت پر ان کے شانوں نے کینوس کے اندر لگے نرم سپونج میں ملائم سے ہلکے ہلکے گڑھے بنا رکھے تھے۔ کچھ پڑھتے وقت وہ اپنی جھکی ہوئی گردن کرسی کے اوپری کنارے پر جہاں ٹکا دیا کرتیں، وہاں بھی ایک قوسیہ سایہ سا نظر آتا۔ کرسی کے بازوؤں پر جہاں کہنیاں ٹکا کر وہ چائے کا مگ، اخبار یا کتابیں تھامے رکھتیں، وہاں دو چھوٹے گول سے نشان دکھائی دیتے۔ سیٹ پر ان کے جسم کے وزن نے

سانچا سا بنا دیا تھا۔ کسی کو اگر ان کے انتظار میں کچھ دیر لابی میں بیٹھنا ہوتا تو ایسا معلوم ہوتا گویا مس زہرہ کرسی پر موجود ہیں۔ اور بیٹھنے والا باادب سا اپنی نشست کے کنارے پر ٹکا رہتا۔

مس زہرہ نے ایک گہری سانس لے کر کرسی کے ساتھ سر ٹکا دیا۔

اداسی آنکھوں سے ہوتی دل میں جا بیٹھی۔

زہرہ نے تو ایسا نہیں کیا تھا۔ بچپن سے اس کا پھوپھی زاد کے ساتھ رشتہ طے تھا۔ سو شادی ہوگئی۔ اس کی مرضی تھی بھی، اس نے کبھی سوچا نہیں تھا۔ اسے ماہرِ نباتات بننے کا شوق تھا۔ خوش شکل و خوش مزاج تھی۔ کئی سہیلیاں تھیں۔ کتابیں تھیں لائبریری تھی۔ بڑا سا بوٹونیکل گارڈن تھا۔ کالج زنانہ تھا اور منگنی کزن سے طے تھی۔ سو، سوچے جانے والی سوچ کبھی اٹھی ہی نہیں۔ لڑکے والوں نے شادی کی پیشکش کے ساتھ وعدہ کیا کہ شادی کے بعد وہ پی ایچ ڈی کرنا چاہے تو کرسکتی ہے۔

(وہ اپنی پسندیدہ عشق پیچاں کی بیلوں پر لگنے والے کاسنی، اودے اور سفید پھولوں کے رنگوں میں گلابی سرخ اور زرد پھول اُگانے پر تحقیق کرنے کے علاوہ ہر طرح کی دستیاب بیلوں پر کام کرنا چاہتی تھی۔)

اور یوں شادی کی تاریخ طے ہوئی تو وہ سسرال چلی آئی۔ گھر اور گھر کے لوگ اس کے دیکھے بھالے تھے۔ صرف ہوش سنبھالنے کے بعد اس کا ندیم سے پردہ کرا دیا گیا تھا۔ یعنی جب کبھی عید بقرعید وہ ہوسٹل سے چھٹیوں پر آیا کرتا۔

جب پردے کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی اور اب اسے شادی کی وجہ بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ مگر دونوں باتوں سے ناپسندیدگی کی بھی کسی وجہ پر اس نے نہیں سوچا تھا۔ بس زندگی ہو رہی تھی۔ عام موسموں میں بہنے والی ندی کی طرح بغیر کسی ہلچل کے اپنی کسی منزل کی طرف گامزن۔

شادی کے تیسرے دن وہ لوگ گھر سے باہر کچھ دن گزارنے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ تازہ آئی ڈاک میں ایک خط ندیم کے نام تھا۔ ندیم خط لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے مسہری کے کنارے پر بیٹھ کر لفافہ چاک کیا تو ایک کاغذ پر صرف ایک سطر لکھی تھی اور اس کے اوپر زہرہ کی آدھی تصویر چپکائی گئی تھی۔ یعنی چہرے کو لمبائی کی طرف سے کاٹ کر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔

عبارت میں ایک جملہ تحریر تھا۔

'آدھی ہماری رہیں۔۔ باقی آپ کو مبارک!!!'

زہرہ اس کے قریب گئی تو خط دیکھ کر زور سے ہنس پڑی۔

''کسی نے کالج کے میگزین سے کاٹی ہے یہ۔۔میری کسی فرینڈ کی شرارت ہو سکتی۔۔''

وہ ہنستی ہوئی کہہ رہی تھی کہ ندیم نے اس کے منہ پر زور سے طمانچہ لگایا۔وہ مسہری پر گر گئی۔

''بے حیا۔۔یہ کسی سہیلی کا نہیں تمہارے کسی عاشق کا کام ہے۔''

وہ چیخا۔

طمانچے کی ضرب سے سُن، ہوش وحواس یکجا کر رہی زہرہ زخمی ناگن کی طرح بل کھا کر اٹھ بیٹھی۔

''خاموش۔۔۔بے ہودہ بے غیرت۔۔تم اتنے گرے ہوئے ہو کہ۔۔کہ مجھ پر۔۔کسی نے بھی کیا ہو مجھے اس سے کیا۔۔مجھے۔۔مجھے۔۔اینڈ۔۔اینڈ ہاؤ ڈیر یو ہٹ می۔۔یو۔۔''

وہ بولتی ہوئی اس کے بالکل قریب چلی گئی اور بھاری بھاری انگوٹھیوں والے ہاتھ سے اس کے چہرے پر زور کا تھپڑ لگایا اور اگلے لمحے کمرے سے باہر نکل گئی۔ندیم کچھ پل کے لئے سناٹے میں کھڑا رہ گیا پھر اس کے پیچھے لپکا۔شور سن کر گھر کے افراد اور مہمان چونک کر ادھر اُدھر دیکھتے کمروں کے آس پاس نظر آنے لگے۔اس کی والدہ اسی کے کمرے کی طرف آ رہی تھیں۔اس نے خط آگے کر دیا۔

''کیا ہوا۔۔یہ کیا ہے۔۔شادی والے گھر میں۔۔یہ۔۔یہ۔۔کیا شور۔۔''

ماں ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔

''شادی والا گھر۔۔یہ آپ اس بے شرم لڑکی سے پوچھئے۔۔''

ندیم اپنے کمرے کی طرف منہ کر کے چلایا۔

مہمانوں میں کچھ واقعی پریشان نظر آئے۔بیشتر کی آنکھوں میں تماشے سے لطف اندوز ہونے کی چمک تھی۔ایک شریف آدمی نے سمجھانے کی کوشش کی۔

''ارے میاں ایسی حرکت کوئی بھی ناکام عاشق آسانی سے کر سکتا ہے۔اس میں ایسا کیا۔۔''

مہمان مسکرایا۔

ایک بڑی بی آگے آئیں۔

''ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو بیٹا۔۔ایسا کیا ہو گیا۔۔بیٹھ کے ذرا سمجھتے ہیں معاملے کو۔۔پھر دیکھتے ہیں کہ کیا۔۔''

زہرہ کچھ دور کھڑی کانپتے نتھنوں اور بھنچے دانتوں والے چہرے سے ندیم کی جانب دیکھ رہی تھی۔اس کے چہرے پر ندیم کی انگلیوں کے نشان سرخ لکیروں کی صورت ابھر آئے تھے۔مگر ندیم اپنے

کمرے کی جانب منہ موڑے اپنے رخسار کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

مہمان ایک ایک کر کے ڈیوڑھی میں جمع ہو رہے تھے۔

زہرہ وہاں سے کب نکلی کسی کو خبر ہی نہ ہوئی۔

رشتے دار ساجھے تھے۔ ہر ایک کوئی مشورہ دے رہا تھا۔

تمہیں اس طرح وہاں سے چلے نہیں آنا تھا۔

تمہیں شوہر پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہئے تھا۔

لڑکے کو مل جل کر سمجھانے کی کوشش کی جاسکتی تھی۔

غلط فہمی دور کی جاسکتی تھی۔

وہ تمہیں معاف کر سکتا تھا۔

آخری جملہ اس کی سماعت میں سے زہر میں بجھے نیزے کی طرح گزرتا ہوا دل کے بیچ جا بیٹھا۔ یہ جملہ اس کے اپنے والد کی زبان سے ادا ہوا تھا۔ مارے رنج اور غصے کے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

اس کے بعد اس نے مہینہ بھر گھر میں کسی سے بات کی نہ ٹھیک سے کھایا پیا۔ اپنے کمرے میں بند رہتی یا کبھی کبھار پتھر کے بت سی گھر میں آتی جاتی دکھائی دیتی۔ کوئی فارم بھرتی، اسناد کی فوٹو کاپی کراتی ہوئی۔

اس کے بعد ایک دو دن تک کتابیں کپڑے وغیرہ سنبھالنے میں مصروف رہی۔ اور ایک صبح اپنے سامان کے ساتھ تیار دوسرے شہر روانہ ہونے کے لئے ٹکٹ ہاتھ میں لئے مسکراتی ہوئی سب کو سلام کرتی گھر سے نکل گئی۔ دوسرے شہر کی ایک یونیورسٹی میں اس کا داخلہ ہو گیا تھا۔

پھر ہوسٹل سے وہ کبھی لوٹ کر گھر نہیں گئی۔

بعد کو وہیں استاد ہو گئی۔ اور کیمپس کی سب سے ہر دل عزیز ٹیچر کہلائی۔

یوں اچھی استاد ہونے کے ساتھ ساتھ ہر طالب علم کی 'ذاتی کونسلر'، می زورہ، کب اساتذہ کی بھی نفسیاتی راہبر بن گئی، مس زہرہ کو خود بھی معلوم نہ ہوا۔ وہ تو بس زندگی گزار رہی تھیں۔ اس میں ان سے کئی تحقیقی کتابیں تخلیق ہو گئیں۔ مختلف دانش گاہوں سے وظائف ملے، کئی ممالک ہو آنا پڑا۔

زرناب انہیں اپنا آئیڈیل مانتی تھی۔ اس نے بال ان ہی کی طرح ترشوائے تھے۔ ماتھے کو ذرا ڈھکتے ہوئے کانوں کی لووں تک۔

اور زرناب کی لانبی سی گردن پر بھی، می زورہ کی ہی طرح ترشے بالوں سے ڈھکے ہوئے کانوں کے نیچے چھوٹا سا چمکتا بُندا گویا بالوں میں ٹنگا نظر آیا کرتا تھا۔ وہ انگریزی بھی ان کے ہی کے انداز میں بولا کرتی۔ امریکی یا برطانوی تلفظ سے الگ ہندوستانی تلفظ والے لہجے میں۔ یعنی وہ کیمسٹ کو کھیمسٹ اور سٹوڈنٹس کو سٹھوڈنٹھس نہیں کہتی تھی اور نہ ہی او، اور ڈبلیو والی آوازیں ادا کرتے ہوئے ہونٹوں کو (جیسے کہ پروفیسر ملک کی عادت تھی۔) زیادہ دیر گول گول کئے رہتی تھی۔

زرناب کو اُن جیسا بننا تھا۔ یہ بات کچھ مہینے قبل تک اس کی زندگی کا مقصد تھی۔

کہ وہ ماہرِ نباتات بن کر پروفیسر بنے گی اور می زورہ کی طرح دوسروں کے مسئلوں کو اپنا کر ہردل عزیز بھی۔

اور می زورہ کی طرح اپنا وقت اپنی مرضی سے گزار کر کتابیں لکھے گی۔

اور یونیورسٹی سے ملی رہائش گاہ (اگر اسے بھی ملی تو۔) کے کچن گارڈن کے علاوہ آس پاس کے سب پھول پودوں کی بذاتِ خود دیکھ بھال کرے گی۔

صرف (می زورہ کی طرح نہیں) شادی ہو جائے گی اس کی، مگر پھر بھی وہ طلباء کے ساتھ ممتا اور محبت سے رہے گی۔ می زہرہ کی طرح۔

مگر!

مس زہرہ طلباء کی ایک ٹیم کو کسی دوسرے شہر لے کر گئیں۔ یہ نباتاتی یونیورسٹی ایک پہاڑی علاقے میں واقع تھی۔ جہاں طلباء بڑی دلچسپی کے ساتھ چھوٹی بڑی وادیوں میں اگے پودوں کے پنپنے کا باریکی سے جائزہ لیتے۔ ہر چیز نوٹ کرتے اور نسبتاً کھردرے سفید کاغذ والی کاپیوں پر پنسل سے ان تبدیلیوں کے سکیچ بناتے۔ اور قلم سے تفاصیل مرتب کرتے۔

جس شام مقامی طالب علم مزمّل نے ان لوگوں کو اپنے گھر عصرانے پر مدعو کیا تھا، مس زہرہ کے پاؤں میں موچ آئی تھی۔ اور اس موچ سے وہ بہت خوش تھیں کہ وہاں کی لائبریری سے ایک قدیم کتاب دستیاب ہوئی تھی جس کے مطالعے میں وہ تقریباً غرق ہونے کا موقع حاصل کر سکی تھیں۔ اس

کتاب کے اندر نہایت دلچسپ قسم کے پیوند کاری کا ذکر تھا۔ پیوند کے عام طریقے سے ہٹ کر جس میں مثلاً کسی پھول یا پھل کے پودے یا درخت کی ڈنڈی کو ذرا سا آڑھا چھیل کر دوسرے پودے کی ڈنڈی سے جوڑ کر مٹی سے لیپنے کے بعد پلاسٹک سے ڈھک دیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ مختلف الاقسام پودوں کے بیجوں کو ایک مقام پر مخصوص اوقات میں وقفے دے کر بونے کے سبب پھلوں اور پھولوں کے کئی رنگوں اور خصائص کے یکجا یا یکساں ہو جانے سے متعلق تھا۔

مس زہرہ کے علاوہ دو اور طلبا جن کے اسائنمینٹ نامکمل تھے نہیں جا سکے تھے۔ کہ اگلے روز وہاں کے مشہور بوٹونیکل گارڈن کو دیکھنے جانا تھا اور اس سے کام مزید بڑھ جانے سے پہلے کا پروجیکٹ ادھورا رہ سکتا تھا۔

''اس وقت دوسری نوٹ بک کہاں سے ملے گی۔۔ یا کم سے کم کچھ کاغذ کے ورق۔۔''

زلفی نے پریشان سا ہو کر ادھر ادھر میز پر بکھری کتابوں کو دیکھا اور پھر زرناب کی نوٹ بک پر نظر ڈالی تو زرناب نے ورق پلٹے۔

''اوہ اس میں تو سارے پیجز ختم ہو گئے۔''

وہ آخری صفحے کو فائل میں پروئی ڈوری سے الگ کرنے لگی کہ وہ ایک طرف سے خالی تھا۔ دوسری طرف دو ایک فون نمبر لکھے تھے۔

''نہیں یار یہ تو برا لگے گا۔۔''

زلفی نے لمبی لمبی باہیں میز پر سیدھی پھیلا دیں۔ زرناب نے کسی دوسری نوٹ بک سے ورق نکالنے کے لئے جھک کر فرش پر سے بیگ اٹھایا تو اس کے سیدھا ہونے تک منظر بدل چکا تھا۔ اور وہ منظر اس کی زندگی میں تبدیلی بھی لا سکتا تھا، ایسا زرناب نے خوابوں میں بھی خیال نہ کیا تھا۔

زلفی کرسی کی پشت کے کونے اور اپنے شانے پر سر ٹکا کر سو چکا تھا۔ صبح کی بنی داڑھی اُگ آئی تھی اور گندمی چہرے پر مونچھوں اور داڑھی کا حصہ سبزی مائل سیاہ حاشیہ بنائے، کسی ایسی تصویر کی طرح لگ رہا تھا جس میں مصور نے صرف پھولوں کی پتیوں اور پیڑوں کے پتوں کو پیس کر بنائے گئے قدرتی رنگوں کا استعمال کیا ہو۔

(گویا بہت ساری اجناس کسی جدا طریقے سے پیوند کے ذریعے ایک ہی مقام پر اُگا کر ان کے پتوں اور پتیوں سے بنا کوئی ملکوتی رنگ۔) سیاہ ابرووٴں تلے بند آنکھیں ایسی متناسب تھیں جیسے

جیومیٹری کلی ماپ کر کھینچی ہوئی دو قوسیں۔

تھکے ہوئے ایک ہاتھ کی گرفت سے قلم آزاد ہو کر ہتھیلی کے پاس پڑا تھا۔ سانسوں کی ہلکی صدا کے ساتھ وجیہہ چھاتی کا زیرو بم عجب سکون کا سماں پیدا کر رہا تھا۔ رات کے دس بجے یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس کے سکوت اور نیند کے منظر نے زرناب کو یکا یک یہ احساس دلایا کہ وہ بھی بہت تھک گئی ہے۔ کچھ لمحے اسے بھی سو لینا چاہیے۔

اس خیال کے آتے ہی اس نے کرسی سے سر ٹکا کر آنکھیں موندھ لیں۔ مگر کسی نے جیسے اسے آواز دے کر جگا دیا۔

اس نے آنکھیں کھول کر سوئے ہوئے ذوالفقار کو دیکھا۔ اور کچھ دیر بعد جب اس نے پھر آنکھیں بند کیں تو جب بھی اسے سویا ہوا ذوالفقار نظر آنے لگا۔

اس نے آنکھیں کھول دیں اور اسے دیکھنے لگی۔ اونچی سیلنگ والے کامن روم سے لگی لمبی سی تار کے سہارے لٹک رہے خوابیدہ سے نیلے لیمپ شیڈ سے منعکس، نیلاہٹ مائل سفید روشنی میں زلفی کے پپوٹوں کی نسیں واضح طور پر نظر آ رہی تھیں مگر اس کی تھکی ہوئی نیند کو روشنی کا احساس ہی نہ تھا۔ دور تک ہریالی سے مل کر کھڑکیوں سے چلی آئی سوئی سوئی سی پروائی سے اس کے بال رہ رہ کر اڑنے لگتے۔ ٹی شرٹ کا کالر، گردن کے خم ہو جانے کے سبب اس کے رخسار سے لگ کر سو رہا تھا۔ کھڑکیوں پر محوِ خواب پردے نیند میں ہلکے ہلکے لہرا اٹھتے تھے۔ زرناب اسے ایسے دیکھ رہی تھی جیسے دورانِ سفر گاڑی کے دریچوں سے اچانک کوئی خوبصورت منظر آنکھوں کے سامنے آ گیا ہو۔

جب اسے تاکتے تاکتے اس کی گردن تھک گئی تو اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ بند آنکھوں نے اس بار زلفی کا سویا چہرہ نہیں دیکھا بلکہ اسے سوئے ہوئے زلفی کے سینے پر اپنا چہرہ آنکھیں بند کئے دھیمے دھیمے سانس لیتا ہوا نظر آیا تو وہ آنکھیں کھول کر پھر اسے دیکھنے لگی۔ یہ کیسی بے سکونی سی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ معاً اسے خیال آیا کہ اس وقت وہ اگر اپنے کمرے میں چلی جائے تو منظر بدلنے سے شاید اس کی بے قراری کچھ راحت حاصل کر سکے۔

وہ کرسی کے بازوؤں پر ہاتھ دھر کر اٹھنے لگی تو اسے ایک اور خیال آیا کہ اس کے اٹھنے سے کرسی کھسکنے کی آواز زلفی کی نیند میں مخل ہو جائے گی۔

وہ پھر کرسی پر بیٹھ کر اسے دیکھنے لگی۔

اچانک اس کی سمجھ میں سارا معاملہ آ گیا۔

وہ گھبرا گئی۔

نہیں ۔ یہ ۔ یہ ۔ کیا ۔ ہو رہا ہے ۔ روز تو دیکھتی تھی اسے وہ ۔ مگر ۔ ایسا پہلے کبھی محسوس نہیں ہوا ۔ یہ کیسا احساس ہے ۔ ایسا نہیں ہونا چاہیئے ۔

مگر ایسا ہو چکا تھا ۔ اور یہ بات وہ جان بھی گئی تھی ۔ اس کے ابروؤں کے درمیان مس زہرہ کی طرح لکیریں کھنچ گئیں ۔ مگر اس کے ہونٹوں پر جانے کب سے دھیمی دھیمی سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی ۔

اور اب وہ اسے بڑے سکون سے دیکھنے لگی ۔ وہ سوتا رہا ۔

کچھ لمحے بعد اچانک جیسے کہ زرناب کسی خواب سے چونکی ۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا ۔

وہ ہکا بکا سی ذوالفقار کو دیکھتی رہی ۔ پھر اس نے بڑی کوشش سے بغیر آواز کئے کرسی کھسکائی اور کتابوں والے بیگ کے دو دستوں میں سے ایک عجلت سے شانے پر چڑھایا اور باہر نکل گئی ۔ اوپر کی منزل پر جانے کے لئے ، عمارت کی باہری طرف سے گزرتے چوبی زینے سے گزری تو ہوا کے تیز جھونکے کے ساتھ اچانک چلی آئی مہاوٹ نے اس کے ایک شانے پر بوندوں کے نظر نہ آنے والے موتی بکھیر دئے ۔ ایک پاؤں اوپری زینے پر اور ایک نچلے پر دھرے وہ پل بھر ٹھہر کر بارش کو دیکھنے لگی ۔ ہوا یکا یک کچھ خنک ہوتی محسوس ہوئی تو اس نے ایک گہری سانس لی اور کچھ ایسے مسکرائی جیسے کوئی شناسا چہرہ نظر آ گیا ہو ۔ پھر تیز قدموں سے زینہ طے کرنے لگی ۔

کمرے تک جاتے ہوئے اس کے سوتی بیگ کا دوسرا دستہ زینے پر جھاڑو لگایا کیا ۔ اندر پہنچ کر اس نے بیگ کو بستر پر پھینک دیا ۔ ہاتھوں میں رخسار تھامے جب وہ مسہری کے کنارے پر بیٹھی تو زینے سے کمرے تک ساتھ چلی آئی مسکراہٹ ہونٹوں پر سے مٹ گئی تھی ۔

اب کیا ہوگا ۔

اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں ہو گئے ۔

’’ می زورہ ۔ ۔‘‘

اس کی زبان سے کچھ اونچی آواز میں نکلا ۔ اور چہرے پر طاری تناؤ کے تاثرات کچھ ہلکے پڑ گئے ۔

می زورہ کاش آپ جاگ رہی ہوں ۔

وہ اپنے آپ سے بولی اور موبائل فون ہاتھ میں اٹھایا ۔

’’ کاش آپ جاگ رہی ہوں ۔‘‘

اس نے ذرا اونچی آواز میں کہا ۔

مگر وہ تو جلد سونے کی عادی ہیں۔ ایک ایس ایم ایس کرتی ہوں۔

اس نے ایک پیغام لکھا۔

'مس زہرہ مجھے آپ سے بے حد ضروری بات کرنی ہے۔'

مگر جواب نہیں آیا۔

وہ تھکی تھکی سی مسہری پر دراز ہوگئی۔ بھاری بھاری پلکیں بند ہونے لگیں تو زلفی کرسی سمیت آکر اس کی آنکھوں میں سوگیا۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

صبح کب ہوگی۔

اس نے مس زہرہ کو ایک ایس ایم ایس اور کیا۔

'مس زہرہ۔ مجھ سے بات کیجیے، جتنی جلدی ممکن ہو۔۔ میں صبح ہونے تک کہیں مر نہ جاؤں۔'

جواب ندارد۔

نیچے گیٹ کھلنے کی آواز آئی تو زرناب اٹھ کر کھڑکی پر آ گئی۔ بارش ابھی بھی ہو رہی تھی۔ گاڑی سے اترتے طلبا کے قہقہوں کی آوازیں رات کی خاموشی میں مخل ہونے لگیں۔ زرناب نے فوراً کمرے کی بتی گل کر دی اور دوبارہ بستر پر جا لیٹی۔ اندھیرے میں کھڑکی سے نظر آ رہے کچھ کم اندھیارے آسمان کے مستطیل ٹکڑے کو دیکھتی رہی۔

چوکور حاشیوں کے اندر لبیب کی مسکراتی تصویر ابھری۔

''شادی تم سے ہی کرنی ہے مجھے۔۔ چاہے کوئی راضی ہو یا نہیں۔''

لبیب نے اسے یونیورسٹی میں داخل ہونے کے پہلے ہی دن کہا تھا تو اس کے دوست جن میں بہت سی لڑکیاں بھی تھیں، قہقہہ لگا کر ہنسے تھے۔

زرناب نے اسے ریگنگ کا حصہ خیال کیا اور چپ چاپ سہمی سی کھڑی رہی تھی۔ سینیرس اس کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے تھے۔

''یہ پریزیڈینٹ ہیں سٹوڈنٹس کے۔ مذاق مت سمجھنا۔''

ایک لڑکی سنجیدگی سے بولی۔

''ان کے منہ سے نکلی بات پتھر کی لکیر ہوتی ہے۔''

کسی لڑکے نے اونچی آواز میں کہا۔ کچھ قہقہے بلند ہوئے۔

''ایسا کچھ ہوتا ہے یا نہیں مگر یہ بات ضرور سچ ہوگی۔''

لبیب نے آہستہ سے کہا۔

''نام کیا ہے تمہارا؟''

کوئی لڑکی بولی۔ زرناب نے دھیمے سے کچھ کہا۔

''ہکلاتی ہے۔۔شادی مت کرنا۔۔''

ایک اور قہقہہ پڑا۔

''ذرا زور سے بولیں گی آپ۔۔کہ نام کیا ہے آپ کا۔۔؟''

اسی لڑکی نے پوچھا۔

''زرناب۔۔''

اب آواز واضح تھی۔

''پورا نام۔۔؟''

''زرناب وانی۔۔''

''چھوڑو یار۔۔ یہ سیّد زادی نہیں ہے۔۔تمہارے فادر نہیں مانیں گے۔۔تمہارا یہ عشق بھی ناکام ہونے والا ہے۔۔''

''بکواس مت کر۔۔میں نے اس سے پہلے کوئی عشق نہیں کیا۔۔''

لبیب جلدی سے بولا۔

''اور ناہید ڈار سے۔۔؟ جس کا رشتہ تمہارے ڈیڈ نے ریجیکٹ کیا تھا۔۔اور وہ بے چاری۔۔''

''وہ جانتی تھی نعمان۔۔تم حد کرتے ہو۔۔اور میں کب انٹرسٹڈ تھا۔۔ہوتا تو منا نہ لیتا گھر والوں کو۔۔جیسے اب منانے والا ہوں۔۔''

وہ مسکرایا۔

سب طلبا دلچسپی سے یہ گفتگو سننے لگے۔زرناب خاموش دیکھتی رہی۔

''بے چاری جھیل کے آبی گھر میں پلی حسین مچھلی ہاتھ سے پھسل گئی۔۔ایسی فریفتہ ہوئی تھی تم پر کہ کالج ہی چھوڑ دیا۔۔''

نعمان ہنسا۔

''اسلام میں یہ بھید بھاؤ منع ہیں۔۔اور پڑھے لکھے لوگ تک۔۔یہاں تک کہ نمازِ پنجگانہ پڑھنے والے۔۔لمبی داڑھی والے حاجی صاحبان تک۔۔سچ پوچھو تو اندر سے خالص برہمنوں کی طرح ذات پات کے قائل ہیں۔۔''

نور فاطمہ بولی۔

''ابے اوئے برہمنوں کا نام مت لے۔۔میرے باپ نے کہا ہے کہ میری شادی کسی بھی مال دار بنئے کی لڑکی سے ہوسکتی ہے۔۔''

روہت نے اونچی آواز میں گویا اعلان کیا اور قہقہے پھر گونجے۔

''ہاں یار۔۔یہ مال دار لوگ کچھ زیادہ ہی۔۔''

حنا نے کہا۔

''بڑی مشکل سے جاگیرداری چھڑوائی تھی مگر۔۔''

باسط نے نفی میں سر ہلا ہلا کر گویا افسوس کا اظہار کیا۔

''یار مذاق نہیں سچ ہے۔۔مگر جاگیرداروں نے اپنے سرمائے کو ہاتھ سے جانے تھوڑی دیا۔۔اب دوسری صورت میں نظر آتے ہیں۔۔استحصال تو جاری ہے نا۔۔''

''اور۔۔اب یہ غریبی کی سطح سے بھی نیچے کا طبقہ۔۔سوائے کرائم کے اور کیا کرے گا۔۔''

روہت بولا۔

''اور کوئی انقلاب نہیں آئے گا۔۔کرپشن جاری رہے گا اور جرائم بڑھیں گے۔۔''

گولڈی سنگھ نے اپنے خوبصورت چہرے پر سیاہ حاشیہ بناتی داڑھی کو اپنے لمبے لمبے ہاتھوں سے سنوار کر کہا۔

''پتہ ہے تھرڈ ورلڈ وار کہاں ہوگی۔۔''

روہت پھر ہنسا۔

''چاند پر۔۔یا۔۔سپیس میں۔۔یا پانی کی تقسیم پر جھگڑے ہوں گے۔''

باسط نے بڑے یقین سے کہا۔

''ایسی ان سرٹینیٹی ہے اس دور میں ہر طبقے کے انسان کے دل میں کہ۔۔کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کل کیا ہونے والا ہے۔۔''

گولڈی نے سنجیدگی سے کہا تو باسط نے ایک اور قہقہہ لگایا۔

''لو۔۔اس کی سنو۔۔جیسے آج تک کوئی بتا سکا ہے کہ کل کیا ہوگا۔۔ویسے۔۔جوکس اپارٹ یار۔۔گولڈی از ابسولیوٹلی رائٹ۔۔''

''یار تم لوگ ریگنگ کر رہے ہو یا ڈیبیٹ۔۔''

نعمان ہنسا تو گولڈی نے ہاتھوں سے ٹھہرنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں رانگ کب ہوتا ہوں بھائی۔۔پھر جونیئرس پر اچھا امپریشن پڑنا چاہیئے۔۔جینیس پیدا ہوتے ہیں یہاں۔۔کوئی پرائیویٹ یونیورسٹی نہیں ہے ہماری۔۔آرام میں بھی کام ہی کرتے ہیں ہم۔۔''

''ہاں تو بات رشتوں کی ہو رہی تھی۔۔کیا واقعی یہ ممکن ہے کہ کوئی۔۔کوئی۔۔''

باسط تقریر کرنے کے انداز میں بولتا ہوا رک کر زرناب کو دیکھنے لگا۔

''کیا نام بتایا۔۔''

وہ جلدی سے بولا۔

''زرناب۔۔''

وہ دھیرے سے بولی۔

''ہاں تو کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی لبیب کسی زرناب کا ہاتھ تھام لے اور سماج۔۔یہ ظالم سماج۔۔اس کے راستے کی رکاوٹ نہ بنے۔۔''

باسط نے تقریر جاری رکھی۔

یہ کیپٹلزم کب پیچھا چھوڑے گا ہمارے ملک کا۔۔ذات پات کا تو بہانہ ہے۔۔''

نعمان نے سنجیدگی سے کہا۔

''ملک کا۔۔؟ بھائی یہ گلوبلائزڈ کیپٹلزم ہے۔سارا معاملہ دولت کا ہے۔۔اگر ناہید ڈار کا باپ بھی کروڑ پتی ہوتا تو تمہارے ڈیڈ کو ذات کا خیال ہی نہ آتا۔۔''

دل افروز سنجیدگی سے بولی۔

''تم تو ایسا نہ کہو شہزادی۔۔شہزادی دل افروز۔۔ابھی غضنفر والا واقعہ ہماری یادوں میں تازہ ہے۔۔''

نعمان نے کہا تو دل افروز نے اسے زخمی نظروں سے دیکھا۔

''ہاں اور میری یادوں میں بھی۔۔کہ میں بدقسمتی سے ایسے گھر میں پیدا ہوئی جہاں اموشنز کو کوئی ویلیو نہیں کرتا۔۔میرا ہی دل جانتا ہے یہ۔۔یہ میرا دل۔۔''

''اور تمہارا دل ہندوستان تھا جس پر شہنشاہ اکبر کی حکومت۔۔''

ایک اور لڑکا دل افروز کا جملہ کاٹ کر بولا تو ایک زور کا قہقہہ پڑا۔ دل افروز اس میں شامل نہیں ہوئی۔

''یار سیریس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے پلیز۔۔ ہم ریگنگ کر رہے تھے۔۔ سوری یار آئی ڈِ ڈ ناٹ مین تو ہرٹ اینی ون۔۔''

نعمان نے دل افروز کی طرف دیکھ کر کہا۔

''اٹس او کے۔۔''

دل افروز پھیکی سی مسکراہٹ لئے بولی۔

زرناب ان لوگوں کو خود میں مصروف دیکھ کر دوسری طرف بڑھی۔

''ارے۔۔ بھابی۔۔ بھابی تم کہاں جا رہی ہو۔۔''

باسط اور روہت زرناب کی طرف لپکے تو لبیب نے پیچھے سے ان کے کالر پکڑ کر اپنی جانب کھینچا۔

''میں سیریس ہوں یار۔۔''

وہ عاجزی سے بولا۔

''کچھ دن میں نان سیریس ہو جاؤ گے یار۔۔''

وہ ہنستے ہوئے بولے۔

مگر لبیب کی سنجیدگی قائم رہی۔ زرناب کو بھی نئی طالبہ ہونے کے ناطے متوقع پریشانیوں سے نجات ملی تو اس نے گندمی رنگ کے مضبوط ارادوں والے لڑکے کو ذرا غور سے دیکھنا شروع کیا۔ کچھ ایسے کی وہ بھی اسے غور سے دیکھتے ہوئے دیکھ سکے۔ جب زرناب اکثر ہی اسے بغور دیکھتے رہنے کے مواقع ڈھونڈنے لگی تو مس زہرہ نے معاملہ دریافت کرنا چاہا کہ طلباء کے مسائل میں وہ اپنے ہی مسئلوں کی طرح دلچسپی لیتیں۔

''کیا معاملہ ہے۔۔؟''

انہوں نے زرناب کی نوٹ بک چیک کرتے ہوئے مسکرا کر اسے دیکھا۔

''کچھ نہیں می زہرہ۔۔''

طلبا مس زہرہ کی ہدایت کے مطابق انہیں نام سے ہی بلاتے تھے۔

''پھر بھی آخر۔۔ یہ بار بار کلاس بنک کرنا۔۔ ہوسٹل میں رہ کر بھی جب بچے سامنے نظر نہ آئیں تو ٹیچرس کو فکر ہو جاتی ہے جی۔ بتائیے۔۔''

مس زہرہ نے جھکا ہوا سر اثبات میں ہلایا۔

''می زورہ وہ لبیب۔۔ منگنی کرنا چاہتا ہے۔۔''

''تو۔۔''

''میں پڑھنا چاہتی ہوں۔۔''

''مطلب ابھی۔۔ بغیر پڑھائی مکمل کئے۔۔؟''

''جی۔۔ کہتا ہے تم پڑھتی رہنا۔ منگنی ہونے میں کیا حرج ہے۔۔ کہتا ہے کی اس کا فائنل ہے اور وہ فادر کا بزنس سنبھالنے اپنے شہر چلا جائے گا۔۔ اور میری سٹڈیز کے بعد ہی شادی ہوگی۔۔''

''اگر بعد میں کوئی فس نہ کری ایٹ کریں تمہارے پڑھنے پر۔۔ اور تم ڈسٹرب ہو جاؤ۔۔ پھر تو کوئی پرابلم نہیں منگنی کرنے میں۔۔ مگر ابھی۔۔ تم۔۔ تمہارا اپنا کریر۔۔ ڈ ونٹ یو تھنک اٹس ٹو ارلی۔۔؟''

''اٹ اِز می زورہ۔۔ میں نے کہا تھا تو کہنے لگا کہ اُس کے فادر اُس کی کزن سے کر دیں گے رشتہ ورنہ۔۔''

''اچھا۔۔؟''

''جی می زہرہ۔۔ مگر۔۔''

''مگر۔۔؟''

''آپ کی ہیلپ کے بنا یہ ممکن نہیں ہوگا۔۔''

''کیوں۔۔ ہم کوئی قاضی واضی ہیں جی۔۔؟''

مس زہرہ مسکرائیں اور ساتھ میں کچھ سامنے کے بینچوں پر بیٹھے طلباء بھی، جن کے کانوں تک کوئی کوئی جملہ پڑ جاتا تھا کہ پیار و یار کے معاملے، طالب علمی کے دور کا گویا حصہ ہو کر عام طور سے عام موضوعات جو ہوئے۔ یعنی علمی موضوعات سے ذرا ہی کم اہمیت کے۔

''اس کے ڈیڈ کو آپ کی کاؤنسلنگ کی ضرورت ہے می زہرہ۔۔ لبیب کہتا ہے کہ وہ آپ کی بہت ریسپیکٹ کرتے ہیں۔۔ پھر آپ نے ان کو یونیورسٹی کے نیو بلاک کا کانٹریکٹ دلوایا تھا نا۔۔ پچھلے کانٹریکٹر کی بنی کمپاؤنڈ وال گرنے کے بعد۔۔ اس لئے بھی۔۔''

''ہاں۔۔ ایماندار لوگ ہیں۔۔ پائے دار کام کرتے ہیں۔۔ اور نسبتاً کم مارجن پر کام کرتے

ہیں۔۔خیر۔۔چلو دیکھتے ہیں۔۔مگر تم پڑھائی میں بھی دل لگاؤ۔تمہارے گھر والے جانتے ہیں۔۔؟''

آگے کے بینچوں سے خبر پیچھے تک جا چکی تھی اور ساری کلاس سرگوشیاں کرتی ہمہ تن گوش تھی۔

''نہیں مس زہرہ۔۔انہیں بھی آپ ہی۔۔وہ۔۔وہ کہیں گے کہ دوسرے شہر میں پڑھنے گئی تھی یا۔۔''

''اچھا تو یہ معاملہ ہے۔۔''

مس زہرہ نے کاپی سے نظر اٹھا کر زرتاب کو دیکھا اور سر اثبات میں ہلا کر مسکرائیں۔زرتاب نے جلدی سے ہم جماعتوں کی طرف نظر ڈالی۔ساری کلاس کو اپنی اور دیکھتا پایا تو فوراً سر جھکا کر زمین کی جانب دیکھنے لگی۔طلباء زور سے ہنس پڑے۔سوائے دوسری قطار میں بیٹھے ایک دبلے سے لڑکے ساحل کے۔جو مس زہرہ سے یک طرفہ عشق میں بڑی سنجیدگی سے مبتلا تھا اور اس وقت بھی انہیں محویت سے دیکھ رہا تھا۔

''تم نے کیا روگ پال لیا ہے دیوداس۔۔؟ تمہیں ہنسی نہیں آتی۔۔؟''

اسی قطار میں پہلی بینچ پر بیٹھے للت نے بڑی مشکل سے ہنسی روکتے ہوئے کہا تو اور اونچا قہقہہ بلند ہوا۔

مس زہرہ کی دبی دبی ہنسی بھی ابھری کہ وہ اس روگ کو بڑی مہارت سے نظر انداز کر رہی تھیں۔اس لئے کہ ایک تو یہ ان کے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔دوسرے وہ جانتی تھیں کہ جلد ہی دیوداس کی اپنی کسی ہم عمر لڑکی سے دوستی ہو جائے گی اور وہ نارمل ہو جائے گا۔

مس زہرہ کی مداخلت سے واقعی معاملہ سلجھ گیا۔زرتاب اور لبیب ایک ہی شہر سے تھے۔منگنی کے لئے زرتاب کچھ روز کے لئے گھر چلی گئی تھی۔

لبیب فائنلز کے بعد شہر لوٹ گیا۔اور بزنس میں ایسا پھنسا کہ کافی وقت شہر سے باہر گیا ہی نہیں۔

دو برس میں صرف ایک ملاقات ہوئی لیکن فون پر باتیں ہوتیں۔گو کہ فون بھی کئی کئی روز تک نہ آتا مگر مس زہرہ نے محسوس کیا کہ دونوں ثابت قدمی سے عہد کے پابند ہیں اور مستقبل کے فیصلے سے مطمئن بھی۔

بارش تیز ہو گئی تھی۔

قطرے کھڑکی سے اندر آتے اور چھینٹے بن کر لوٹ جاتے تھے کہ ان سے بننے والے مزید

ننھے ننھے قطروں میں سے کوئی اور مہین چھینٹا زرناب کی مسہری تک آ کر سر کے نیچے دھری اس کی باہوں کو چھو لیتا۔

ورنہ اُسے اندھیرے میں یہ اندازہ نہ ہو پاتا کہ بارش اندر تک چلی آتی تھی۔

زلفی شاید ابھی بھی کرسی پر سو رہا ہوگا۔

اسے نیند میں سردی لگ گئی تو کہیں جاگ ہی نہ جائے۔

جاگ جائے تو۔۔

تو۔۔؟

وہ تو سکون سے دن گزار رہی تھی۔ پھر یہ کیا نئی مصیبت۔ مصیبت۔ آن پڑی۔

کھڑکی کے باہر آسمان کے قدرے روشن مستطیل ٹکڑے کو دیکھتی زرناب لفظِ مصیبت سوچتے ہی مسکرا پڑی۔

نہیں زلفی مصیبت نہیں ہے۔

سویا ہوا زلفی۔

تھکا ہوا بے خبر زلفی۔

اس سارے سلسلے سے انجان زلفی۔

صبح جب مس زہرہ نے اپنے موبائل کا آواز بند کرنے والا بٹن واپس دبانے کے لئے اٹھایا تو زرناب کا فون آ رہا تھا۔

''ہیلو۔۔''

مس زہرا جلدی سے بولیں۔

''می زہرہ۔۔ می زہرہ۔۔''

زرناب کی بے قرار آواز ابھری۔

''ہاں زرناب۔۔ کیسی ہو۔۔''

''مر جاؤں گی می زہرہ۔۔ ساری رات ایک پل نہیں سوئی۔۔ مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے می زورہ۔۔''

وہ گھبرائی سی آواز میں بولی تو مس زہرہ بے قرار ہو گئیں۔

''کیا ہوا۔۔سب خیریت تو ہے نا۔۔؟ ہوا کیا ہے۔۔لبیب نے کچھ کہا کیا۔۔''

''نہیں می زورہ۔۔''

''پھر کیا۔۔اس کے گھر والوں نے۔۔؟''

''نہیں می زورہ۔۔''

''یاد آ رہی ہے اس کی۔۔؟''

''نہیں می زہرہ۔۔''

''کسی تیسرے نے۔۔میرا مطلب ہے۔۔منگنی تو قائم ہے نا۔۔''

''جی ہاں می زہرہ۔۔''

''تو کیا بہت دنوں سے فون نہ آنے کے سبب پریشان ہو۔۔؟''

''جی نہیں می زہرہ۔۔ایسا کچھ نہیں ہے۔۔''

زرناب نے کچھ لمبی سانس لی تو دوسری طرف کچھ دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔

''ہوں۔۔تو۔۔تمہیں۔۔محبت ہوگئی ہے کسی کے ساتھ۔۔؟''

مس زہرہ نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

''جی ہاں۔۔می زورہ۔۔مجھے۔۔آپ کی ضرورت ہے مجھے۔۔می زورہ۔۔نہیں تو میں مر جاؤں گی۔۔میں آ رہی ہوں می زورہ۔۔''

''آؤ۔۔جلدی سے آؤ۔۔''

مس زہرہ نے باہر کا دروازہ کھول دیا اور واش بیسن کے پاس کھڑے ہو کر اپنے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے۔پھر خود کو آئینے میں ایک نظر دیکھا۔آج وہ خود کو کچھ تازہ دم معلوم ہوئیں۔ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''چلئے کچھ آرام تو میسّر ہوا اس ٹائٹ سکیڈیول سے۔۔موچ کے بہانے۔۔مگر اس زرناب کو کیا ہوا۔انہوں نے اپنے آپ سے باقاعدہ باتیں کیں۔

''کچھ ٹھکانہ ہے اس سرپھری لڑکی کا۔۔''

وہ مسکرا کر ذرا اور اونچی آواز میں بولیں گویا کسی اور سے کہہ رہی ہوں۔پھر کھڑکی کھول کر لابی میں بچھے لکڑی کے چوڑے بازوؤں والے پتلے سے صوفے پر بیٹھ گئیں۔اخبار وہ باہر کے دروازے کے

قریب سے اٹھالائی تھیں۔

زرناب کو نچلی منزل سے اوپر آنا تھا۔

زرناب آئی اور دھپ سے فرش پر بیٹھ گئی۔

''اب کیا ہوگا می زورہ۔۔''

زرناب نے فرش کی طرف دیکھا پھر ایک نظر مس زہرہ کی جانب اٹھائی۔ مس زہرہ اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

زرناب پھر فرش کو دیکھنے لگی۔ رات کا منظر اس کی آنکھوں میں تیر گیا۔

''اب کیا ہوگا می زورہ۔۔ اب میں مر جاؤں گی۔۔''

''کیوں ایسا کیا ہوگیا۔۔''

مس زہرہ اسے گردن خم کئے دیکھا کیں۔ زرناب ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پیوست کئے گردن داہنے بائیں ہلاتی رہی۔

''مجھے سمجھ میں نہیں آرہا کہ۔۔ کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔۔''

''وہ بھی چاہتا ہے کیا تمہیں۔۔؟''

''پتہ نہیں۔۔ مجھے خود ہی پتہ نہیں چلا۔۔ ہم سب گروپ میں پڑھ رہے تھے۔۔ باقی لوگ چلے گئے تھے ڈنر پر۔۔ میں اور زلفی کام کرتے رہے۔۔ وہ تھک کر سو گیا تھا۔۔''

''پھر۔۔ کیا ہوا۔۔؟''

''پھر کچھ نہیں ہوا می زورہ۔۔ وہ سویا ہوا بہت اچھا لگ رہا تھا۔۔ میں نے کبھی ایسا سوچا ہی نہیں۔۔ پتہ نہیں کل کیا ہوگیا۔ میں اسے دیکھتی رہی۔۔ بے وقوفوں کی طرح می زورہ۔۔''

''تو۔۔ پھر وہ۔۔ وہ جاگا کیا۔۔؟''

''نہیں۔۔ میں چپکے سے نکل آئی۔۔ اس کی نیند ڈسٹرب کئے بغیر۔۔''

''چائے پیوگی۔۔ منگواتے ہیں۔۔''

مس زہرہ فون کی طرف بڑھیں۔

''اب پرابلم کیا ہے۔۔؟''

''میں بہت پریشان ہوں می زورہ۔۔ میں لبیب کو کیا کہوں گی۔۔''

''کس بارے میں۔۔؟''

''یہی کہ اب کیا ہوگا۔۔''

''کس کا کیا ہوگا۔۔؟''

''اُسے پتہ چلے گا تو کیا سوچے گا۔۔''

''تم کو شادی کرنی ہے زلفی سے کیا۔۔؟'

''نہیں می زورہ۔۔ مجھے تو لبیب سے شادی کرنی ہے۔۔''

پھر اسے کیسے پتہ چلے گا۔۔ میں اس سے کچھ چھپاتی نہیں ہوں۔۔ بتا دوں گی اسے۔۔ وہ بھی تو دو سال سے نہیں ملنے آیا۔۔ پچھلے سال گھر گئی تھی تو کہیں اور گیا تھا اپنے ڈیڈ کے ساتھ۔۔ میں کیا کروں۔۔ مگر می زورہ۔۔ میں نے غلطی کی ہے تو اسے بتانا ہی ہوگا نا۔۔''

''تم نے کیا غلطی کی ہے۔۔ زرناب۔۔؟''

''میں نے۔۔ زلفی کو اتنی دیر دیکھا۔۔ اس کے بارے میں سوچ سوچ کر۔۔ سوچ سوچ کر۔۔ سو نہیں پائی۔۔ وہ اتنا کیوٹ لگ رہا تھا سویا ہوا کہ۔۔ کہ۔۔''

''یہ کوئی غلطی نہیں ہے۔۔ مگر اب کہیں تم غلطی نہ کر ڈالنا۔۔''

''کون سی غلطی می زورہ۔۔؟''

''لبیب کو بتانے کی۔۔ کچھ ہوا ہی نہیں۔۔ تم اسے بتاؤ گی کیا آخر۔۔ تم نے کچھ نہیں کیا۔۔ یہ تو کوئی بات ہے ہی نہیں۔۔ اس میں۔۔''

''کسی اور کو لائیک کرنے کی تو ہے نا می زورہ۔۔''

کینٹین سے صاف رنگ کا دبلا پتلا لمبا سا نوجوان چائے لے کر آیا۔ مس زہرہ نے زرناب کو چائے کا مگ پکڑایا۔

''تھینک یو سو مچ می زورہ۔۔''

''مائی پلیجر سویٹ ہارٹ۔۔''

وہ مسکرائیں۔

لڑکے نے باقی برتن سمیٹے۔

''کینٹین میں کام کرتے ہو؟''

مس زہرہ لڑکے کی طرف سر اٹھا کر نرمی سے مسکرائیں۔

''جی میم۔۔ پڑھتا بھی ہوں ساتھ۔۔''

وہ سر جھکائے مسکرایا۔

''اچھا۔۔بہت اچھے۔۔کس کلاس میں۔۔؟''

''ساتویں میں۔۔''

وہ شرما کر بولا۔اور پھر مسکرا کر دونوں کو باری باری دیکھا۔مسکرانے سے اس کے ہونٹ نیچے کو ہلکے سے خم ہو گئے تھے اور داہنے رخسار پر ایک چھوٹا بیضوی سا گڈھا بن گیا تھا۔اس کا چہرہ بہت سی جاذبیت لئے نظر آیا تو مس زہرہ نے زرناب کی طرف دیکھا اور مسکرائیں۔زرناب بھی مسکرائی تھی۔

''میں نے اصل میں پڑھائی چھوڑ دی تھی۔۔اب پچھلے سال پھر شروع کیا ہے پڑھنا۔۔''

وہ مسکراہٹوں کا جادو بکھیرتا کشتی ہاتھ میں لئے کھڑا رہا۔مس زہرہ نے بل ادا کیا۔

''تم نے بہت اچھا کیا شاباش۔۔یہ تعلیم تمہارے کام ہی آئے گی۔۔کبھی بھی پڑھے انسان۔۔اس کا عمر سے کوئی تعلق نہیں ایسا۔۔''

''جی میم۔۔''

وہ مسکراتا ہوا باہر چلا گیا۔

''می زورہ۔۔میں کیا کروں۔۔''

زرناب نے جاتے ہوئے لڑکے سے نظریں ہٹا کر مس زہرہ کو دیکھا۔اس کی آواز میں بے بسی کے ساتھ الجھن بھی تھی۔

''اب یہ لڑکا ہینڈسم ہے۔۔ہے نا۔۔؟''

مس زہرہ نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

''جی می زورہ۔۔''

''اگر اس کو تم کچھ پل دیکھو۔۔یا کوئی اور لڑکی دیکھ لے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں نا کہ وہ اس کے ساتھ کہیں بھاگنے کا پلان بنا رہی ہے۔۔''

''لیکن می زورہ۔۔''

''کچھ لیکن نہیں۔۔تم لبیب سے کچھ نہیں کہو گی۔۔تمہارے سامنے میری مثال نہیں کیا۔

''مگر لبیب ایسا نہیں ہے می زورہ۔۔''

''سب ایک سے ہوتے ہیں۔۔اور آپ یہ غلطی نہیں کریں گی۔۔سمجھیں۔۔ہرگز بھی۔بس اب زلفی کو کبھی یہ معلوم نہ ہو کہ وہ تمہیں اچھا لگا تھا۔۔کبھی۔۔''

''اب تو۔۔نظر آئے گا تو۔۔اور اچھا لگے گا می زورہ۔۔''

''مگر پھر بھی اسے پتہ نہیں چلنا چاہیئے۔۔اور کوشش کرنا کہ تم اس واقعے کو۔۔زلفی کو بالکل بھول جاؤ کہ تمہارا راستہ اُس سے الگ ہے۔۔اور بھول جاؤ گی اسے تم جلد ہی۔۔اسے ایسا کوئی مسئلہ مت سمجھو۔۔''

''جی می زورہ۔۔''

''اور لبیب سے بھی نہیں۔۔کہو گی تم کوئی بات۔۔''

''جی می زورہ۔۔بالکل نہیں۔۔اب نہیں بتاؤں گی اسے۔۔''

''وعدہ۔۔؟''

''جی می زورہ۔۔!''

یہ باتیں مہینہ بھر پیشتر کی تھیں۔امتحانات چل رہے تھے۔ایک بار زرناب کی اس دوران مس زہرہ سے ملاقات ہوئی تھی۔سب ٹھیک تھا۔

اب جب مس زہرہ کو اس نے فون پر یہ نئی خبر سنائی تو مس زہرہ پریشان ہوگئیں۔زرناب نے امتحان کے ہال سے نکلتے ہی فون کیا تھا۔اور مس زہرہ کی رہائش کیمپس کے دوسرے کنارے پر تھی۔ زرناب ٹھیک بیس منٹ میں ان کے وہاں پہنچ گئی۔زنجیر والا باہری کواڑ کھلنے کے ساتھ ہی مس زہرہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔انہیں ایک ہی فکر کھائے جا رہی تھی۔

خدا جانے زرناب کا کیا حال ہوگا۔

انا کے مارے ایک اور مرد نے ایک لڑکی کو ضائع کر دیا۔

وہ زبان سے مختلف جملے ادا کرتی ہوئی پھاٹک کی طرف گئیں۔

اوہ زرناب یہ تم نے کیا کیا۔میں نے تم سے کہا تھا نا۔کتنا سمجھایا تھا تم کو۔

وہ کواڑوں سے دور ہی تھیں کہ زرناب اندر آئی۔

''کیا ہوا زرناب۔۔میں نے کتنا منع کیا تھا تم کو۔۔یہ تم نے کیوں کیا۔۔آؤ۔۔آؤ آؤ۔۔''

مس زہرہ اسے شانے سے تھام کر اندر کی طرف بڑھیں اور صوفے کے قریب پہنچ گئیں۔

''بیٹھو بیٹھو۔۔''

انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''میں پانی لاتی ہوں تمہارے لئے۔۔''

وہ باورچی خانے کی طرف جانے لگیں تو زرناب نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''نہیں می زورہ۔۔ پیاس نہیں لگی۔۔ آپ بیٹھیے تو۔۔''

''ہاں اچھا بتاؤ۔۔ کیا ہوا پھر۔۔ کیا کہا اس نے۔۔''

مس زہرہ اس کے برابر بیٹھ گئیں۔

''کچھ نہیں می زہرہ۔۔''

زرناب کی آواز میں کوئی اداسی تھی نہ پریشانی۔ مس زہرہ نے اسے غور سے دیکھا۔

''کچھ نہیں مطلب۔۔ بات ہی نہیں کی۔۔؟''

''جی نہیں می زورہ۔۔ میں نے اسے ساری بات بتائی فون پر تو وہ مجھے سمجھانے لگا کہ اس میں خود کو قصوروار سمجھنے والی کوئی بات نہیں۔۔ اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔۔''

''کیسا۔۔؟''

مس زہرہ حیرت سے بولیں۔

''اس نے بتایا کہ وہ جب اپنے فادر کے ساتھ گیا تھا تو پلین میں ایک ائر ہوسٹیس بہت خوبصورت تھی۔۔ اس نے آنکھوں کو میک اپ سے پتہ نہیں کیا کیا تھا کہ اس کی آنکھوں کی پتلیاں بہت چمکتی تھیں۔۔ اور می زورہ اس نے کہا کہ آنکھوں کے علاوہ اس لڑکی نے اور کوئی میک اپ نہیں کیا تھا۔ اور اس نے کہا کہ جب وہ ہنستی تھی تو اس کے دانت موتیوں جیسے سفید اور مالا کی طرح قطار میں نظر آتے تھے۔ اور می زہرہ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ اسے ساری فلائٹ میں دیکھتا رہا تھا۔ اور وہ نیچرلی پرِیٹی تھی اور اسے ابھی بھی اس کی صورت یاد ہے۔ اور اس نے کہا کہ ہم ہیومن بینگز ہیں۔ انسان ہیں ہم۔ دل کے رشتے روح کی گہرائیوں میں رہا کرتے ہیں۔ کسی خوبصورت چیز کو کچھ دیر ایڈ مائر کرنے سے رشتوں کی بنیادیں ہل نہیں جاتیں۔ رشتے اعتماد کا دوسرا نام ہیں۔ اور می زورہ اس نے کہا کہ ہر انسان جینے کا برابر حق رکھتا ہے۔ ایسی چیزیں اس کی سمجھ سے باہر ہیں جو پچھلی نسلوں کی غیرت کا معاملہ بن جایا کرتی تھیں کہ کسی عورت نے اگر کسی کی تعریف کر دی یا نظر بھر کر دیکھ لیا تو طوفان کھڑا ہو گیا۔ اور می زوورہ اس نے کہا کہ یہ آنر کلنگ جیسے خیالات اس کے نہیں ہو سکتے۔ اور میں نے کوئی جرم نہیں کیا جو اس طرح اس کے سامنے اقبالِ جرم کروں اور می زورہ اس نے کہا۔۔۔۔۔

◆✥◆

پیش بیں

وہ ہونٹ بھینچے شیو بناتا رہا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے ذہن میں کوئی روئی دھن رہا ہے۔ کانوں سے گویا روئی کی گرد، گرم دھواں بن کر خارج ہو رہی ہے۔ آنکھوں کے سامنے ایک منظر ٹھہر سا گیا ہے۔

یہ کیا دیکھ لیا اس نے۔

کاش یہ دیکھنے سے پہلے اس کی سانسیں رک جاتیں۔ کاش وہ یہ منظر نہ دیکھتا۔ آخر اس کے ساتھ کیوں ہوا ایسا۔

اس کے دماغ میں کوئی ہتھوڑے سے چلانے لگا۔

یہ اچھا نہیں ہوا۔ بہت برا ہوا۔

کتنی لگن سے حاصل کیا تھا اس نے روشنی کو۔ کتنے جتنوں سے تلاش کیا تھا۔ گو کہ یہ سب وہ پہلے ہی جانتا تھا وہ اسے پانے والا ہے۔ مگر کوشش تو کرنا ہی تھی۔

اس نے شیو کی چلتی مشین روک کر خود کو آئینے میں بغور دیکھا۔

بے وقوف سمجھ رکھا تھا مجھے۔ میری طاقت کا اندازہ ہی نہیں اسے۔

گردن لکڑی کی طرح سیدھی کر کے وہ اپنی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

مگر میں تو سب جانتا ہوں۔

اس نے دانت پیس کر سوچا پھر زبان داہنے رخسار کے اندر تان دی اور اسی طرف ریزر چلانے لگا تو رخسار ذرا سا چھل گیا۔ اس نے نتھنے پھلا کر مشین سنک کے کنارے رکھی اور شیشے کے طاقچے سے ڈیٹول کی شیشی اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

سمیر سڑک کے کنارے گاڑیوں کے شوروم کے باہر کھڑا گاڑی پسند کرنے میں مشورہ لینے کے لئے اپنے ایک دوست کا منتظر تھا کہ قریب واقع زنانہ کالج کے بڑے سے پھاٹک کے دونوں کواڑ، خاکی وردی والے پستہ قد، ادھیڑ عمر نیپالی چوکیدار نے یکے بعد دیگرے وا کئے۔ ایک کواڑ کھلتے ہی کچھ لڑکیاں ایسے نکلیں جیسے کسی نے انہیں باہر کی جانب دھکیل دیا ہو۔

''ارے ارے۔۔شبر کرو شبر کرو۔۔ گیٹ کھولنے دو۔۔ چوٹ لگ جائے گا کسی کو تو۔۔؟''

وہ چلایا۔

''ابھی اور کتنا شبر کرے گا گورکھا۔۔ صبح سے شبر کئے بیٹھا ہے ہم۔''

ایک طویل قامت لڑکی ہنستی ہوئی بول رہی تھی۔

دہائیوں سے لڑکیاں اسے گورکھا ہی بلاتی تھیں۔

(آنے والیوں کا بیچ جانے والیوں سے سنتا رہتا۔)

کئی اور لڑکیاں قہقہے لگاتی باہر آئیں۔

''صبر کی بھی حد ہوتی ہے گورکھا۔۔ تم کو گھنٹہ بھر بیچارے بے ضرر مینڈکوں پر نائف چلانا پڑے نا۔ تو سارا صبر ٹوٹ جائے گا۔''

ایک گول مٹول سی لڑکی نے باہر نکلتے ہوئے ایک پل رک کر چوکیدار کے چہرے کی طرف دیکھ کر آواز میں اداسی پیدا کر کے کہا تو ایک اور زور کا قہقہہ پڑا۔

گورکھا ہونٹ بھینچے مسکرایا۔ یعنی مسکرایا ہی نہ ہو کہ طالبات کی باتوں پر مسکرانے کا مطلب ہوا

کہ ماحول دوستانہ ہے۔ جس کی اجازت اس کی ملازمت ہرگز نہیں دیتی تھی۔ اس لئے کہ سفید قمیص شلوار پہننے والی یہ لڑکیاں جب خوشنما بستوں میں رنگین قمیصیں چھپا کر کالج کے احاطے میں بس سے اترتیں اور انہیں غسل خانے میں بدل کر گیٹ سے باہر نکل جاتیں تو گورکھا کو روکنے میں کوئی مشکل پیش نہ آتی۔ وہ ان کے چہرے دیکھ کر ان کی چوری پکڑ لیتا۔ کیونکہ تین ساڑھے تین ہزار لڑکیوں میں سے وہ ہزار کی صورتیں ضرور پہچانتا رہا تھا۔

مگر سینکڑوں کی شکلیں اسے ایک جیسی نظر آتی تھیں۔ پچاسوں کے بال لمبے تھے۔ بیسیوں بہت حسین تھیں۔ اور دوسری صورت میں سڑک کے اس پار واقع مال کی طرف جس میں بازار اور سینما حال تھا، جانے والی لڑکیاں گورکھا سے بغیر گھبرائے پھاٹک کے ایک کواڑ میں بنے چھوٹے سے دروازے سے نکل جاتیں۔ گویا کالج کی لڑکیاں نہیں ہے۔ سفید قمیص کی جگہ رنگین قمیص پہن رکھی ہے۔ یعنی یونیورسٹی سے کوئی ایکیس سٹوڈنٹ کسی کام سے آئی ہے۔

اب اگر گورکھا مسکرا دیا کرتا تو انہیں پکڑتا کیسے۔۔؟

چھٹی کے بعد یہ باتیں یاد آ کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ لے آتیں تو دوسری بات ہے۔

کچھ ہی لمحوں میں طالبات جوق در جوق نکلنے لگیں۔ سفید ملبوسات میں۔ گویا کسی دیوہیکل پنجرے سے بیک وقت بے شمار فاختائیں آزاد کر دی گئیں ہوں۔ روزانہ کالج کے سامنے ان اوقات میں انتشار ہو جاتا کہ ٹریفک جام ہونے لگتا۔

سمیران بہت سی لڑکیوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی شادی کی عمر نکلا چاہتی تھی اور اسے اپنی پسند کی لڑکی نہیں ملی تھی۔ مگر وہ جان گیا تھا کہ اب وقت آ گیا ہے اور وہ اس لڑکی سے ملنے ہی والا ہے۔

اتنی لڑکیوں میں کیسے پہچانے گا۔ اس نے سر نفی میں ہلایا۔ اور وہیں کھڑا رہا۔

لڑکیاں اتنی زیادہ تعداد میں نکل رہی تھیں کہ ایک ایک کو غور سے دیکھنا ممکن ہی نہ تھا۔ کچھ دیر بعد یہ تعداد کچھ کم ہوئی تو وہ ایک ایک لڑکی کو بغور دیکھنے لگا۔ جس وقت اکا دکا لڑکیاں نکلنا ہی باقی رہ گئی تھیں اسی وقت اسے وہ لڑکی نظر آ گئی۔ سبز آنکھوں اور بھورے بالوں والی۔ اس کے ساتھ دوسری لڑکی تھی، جو جسامت میں نسبتاً بھاری تھی۔ مگر اس کا گول چہرہ بہت سی معصومیت لئے ہوئے تھا۔

وہ فوراً اس کی طرف بڑھا اور اس نے لڑکی کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ لڑکی گھبرا کر ساتھ چل رہی دوسری لڑکی سے لگ گئی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟ سامنے کیوں آ رہے ہو ایسے۔۔"

ساتھ والی لڑکی ٹھہر گئی اور ماتھے پر کئی بل طاری کئے اسے سوالیہ انداز میں دیکھنے لگی۔

''نہیں نہیں۔۔ پلیز۔۔ آپ مجھے غلط نہ سمجھیں۔۔ میں۔۔ میں۔۔''

وہ پھر پہلے والی لڑکی کی طرف بڑھنے لگا۔

''بس۔۔ وہیں رکے رہو۔۔ نہیں تو۔۔ پولیس کے حوالے کر دیں گے۔''

دوسری لڑکی نے اپنے گول گول ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا تو پہلی لڑکی اس کی آڑ میں ہو گئی۔

''فار گاڈس سیک۔۔''

لڑکا کچھ اونچی آواز میں بولا۔ وہ دونوں لمحہ بھر کے لئے اسے حیرت سے دیکھنے لگیں۔ پہلی لڑکی ہری ہری آنکھیں لئے اپنی دوست کی گردن کی آڑ سے، اور دوسری سامنے کھڑی۔

''آپ۔۔ آپ مجھے سمجھنے کی کوشش کیجئے۔۔ بس ایک بات سن لیجئے میری۔۔ میں کوئی لوفر لفنگا نہیں ہوں۔۔ اس لڑکی سے میری شادی ہونے والی ہے۔۔''

اس کے چہرے پر اعتماد تھا جسے دیکھ کر دوسری لڑکی اپنی دوست کی طرف مڑی۔

''ری اے لی۔۔ تم نے بتایا ہی نہیں۔۔ یہ کون۔۔''

''نہیں۔۔ میں نہیں جانتی اسے۔۔ پتہ نہیں کیا کہہ رہا ہے۔۔''

لڑکی سٹ پٹا کر اسے اور اپنی دوست کو دیکھنے لگی۔

''ٹھیک کہہ رہا ہوں میں۔۔ ابھی آپ بھی میرا یقین کریں گی۔۔''

اس نے سنجیدگی سے کہا۔

ہری آنکھوں والی لڑکی اپنی دوست کے عقب سے نکل آئی تھی۔

عمر میں کچھ بڑا اور سنجیدہ سا نظر آنے والا خوش پوش لڑکا واقعی آوارہ نہیں لگ رہا تھا۔

''مگر میں تو آپ کو نہیں جانتی۔۔''

''اس لئے کہ ہم کبھی نہیں ملے آج سے پہلے۔۔ مگر میں جانتا ہوں تمہیں۔۔ ہماری شادی ہونے والی ہے۔''

''شادی۔۔ مطلب۔۔؟ میں۔۔ میں۔۔ میری شادی۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔۔ میری تعلیم۔۔ میری بڑی بہن بھی۔۔ میں نے گھر میں کبھی آپ کا ذکر نہیں سنا۔۔''

وہ اس کے گندمی رنگ سنجیدہ چہرے پر پھیلے یقین کے سبب متحیر سبز آنکھوں میں سوال لئے رہ گئی۔

''تم غلط مت سمجھو۔ میں سب بتاتا ہوں ۔۔ہم کہیں بیٹھ سکتے ہیں ۔۔وہ اُدھر سڑک کے اُس طرف ۔۔ برستہ میں ۔۔ایک ایک کپ کافی کے دوران ۔۔''

وہ کیفے کی طرف بڑھنے لگا اور دوایک قدم چل کر لڑکیوں کی طرف پلٹا۔لڑکیاں اب بھی کچھ سوچتی ہوئی سی کبھی ایک دوسرے کو اور کبھی اسے دیکھتی تھیں۔

''آیئے آپ لوگ پلیز۔۔۔یہ سڑک ہے۔۔کوئی سنسان علاقہ نہیں ہے۔۔میں کوئی لٹیرا نہیں ہوں۔۔''

وہ سڑک پار کرنے کے لئے بڑھا اور کچھ سیکنڈ کے توقف کے بعد لڑکیاں بھی اس کے پیچھے چلنے لگیں۔اس نے ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا کہ وہ اس کے پیچھے آئیں بھی۔وہ اندر داخل ہوا اور ایک میز کے قریب کی کرسیاں کھسکا کر لڑکیوں کی جانب دیکھنے لگا جو اسی لمحے اندر آئیں تھیں۔لڑکیاں جب تک کرسی پر بیٹھیں وہ کاؤنٹر پر کافی کے لئے کہہ آیا۔

''کچھ کھانے کے لئے کافی کے ساتھ۔۔؟''

اس نے باری باری ان کے چہروں کی جانب دیکھا۔

''نہیں۔۔''

ہری آنکھوں والی لڑکی جلدی سے بولی۔

''شکریہ۔۔''

دوسری نے کہا۔

اس نے پلٹتے ہی سنا مگر سمجھ نہیں پایا کہ دو میں سے کس نے کہا تھا۔اس نے گردن موڑ کر ہری آنکھوں والی لڑکی کو ایک نظر دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا۔وہ شاید مسکرایا بھی تھا۔

''میرا نام سمیر ہے۔۔سمیر ملک ۔۔۔میں بلڈنگس ڈیزائن کرتا ہوں اور کافی کما لیتا ہوں۔عمر کا تقاضا ہے کہ گھر بسا لیا جائے مگر میں اس کی تلاش میں تھا۔''

اس نے دوسری لڑکی سے کہا۔اور ہری آنکھوں والی لڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔

آج مجھے معلوم ہوا کہ تم ملنے والی ہو ۔۔ سو چلا آیا ۔۔ورنہ ایک دو روز سے آ رہا ہوں ادھر۔۔گاڑی خریدنے۔۔۔جو رنگ میں نے بک کرایا ہے اس رنگ کی کار آج آ رہی ہے ان کے پاس۔۔''

وہ لڑکی کی طرف دیکھتا رہا۔

''اصل میں آپ لوگوں کو حیرت ہو گی کہ اب بھی ہونے والی چیزوں کی خبر لگ جاتی ہے کچھ

انسانوں کو۔ مجھے ہونے والے واقعات خواب میں نظر آتے ہیں۔ یہ بات صرف میری ماں جانتی ہیں۔''

اس نے بڑے یقین سے کہا اور کاؤنٹر کی طرف نظر دوڑائی۔ کافی تیار ہونے کا اشارہ ملا تو وہ اٹھ کر ادھر کو لپکا۔ اس نے اپنی بات کا ردِعمل جاننے کے لئے لڑکیوں کی طرف نہیں دیکھا۔ ہری آنکھوں والی لڑکی حیران سی اسے کاؤنٹر کی طرف جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔ دوسری لڑکی کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ کاؤنٹر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ہری آنکھوں والی لڑکی اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ کہیں سے پاگل نہیں لگتا تھا۔ اس نے دائیں بائیں اور پھر دروازے کی جانب نظر ڈالی اور پھر کاؤنٹر کی طرف دیکھنے لگی جہاں سے وہ کافی کے تین مگ اور پسی ہوئی شکر کی بند پڑیوں پر تین پلاسٹک کے چمچ رکھے چوڑی سی کشتی اٹھائے اطمینان سے چلا آ رہا تھا۔

''میں دراصل بچپن سے خواب میں ایک لڑکی کو دیکھتا آ رہا ہوں۔۔ جس کی رنگت صاف، آنکھیں سبز اور بال سنہرے ہیں۔ لڑکی کے چہرے کے نقوش واضح نظر نہیں آتے تاہم خوبصورت ہے اور درمیانہ جسامت کی لمبی سی لڑکی ہے۔''

وہ کافی کے گھونٹ بھرنے لگا۔

''تو۔۔؟''

ہری آنکھوں والی لڑکی نے اچانک پوچھا۔ اس نے کافی کا مگ دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔ دوسری سر جھکائے کافی کے مگ میں چمچ چلاتی رہی۔

''میں نے برسوں اس لڑکی کو تلاش کیا۔۔ مگر مجھے نظر نہیں آئی۔۔ آج پھر میں نے وہی خواب دیکھا۔۔ مجھے گاڑی لینے اس شوروم میں آنا تھا۔۔ شوروم کے برابر کالج کا بورڈ بھی دیکھا تھا کل۔۔''

اس نے کافی شاپ کے شفاف کانچ کے دروازوں سے باہر کی طرف انگلی اٹھائی اور کئی پل ادھر ہی دیکھتا رہا۔ ہری آنکھوں والی لڑکی کو ایسا لگا جیسے وہ ادھر کسی کو دیکھ رہا ہو۔ اس نے بھی دفعتاً ادھر دیکھا۔ لوگ آ جا رہے تھے۔

اچھا۔ اس طرح کسی جانب غور سے دیکھنا اصل میں اس آدمی کے سوچنے کا طریقہ ہے۔

اس نے دروازے سے نظر ہٹائی اور شکر کی پڑیا کھولنے لگی۔

''آج پھر وہی خواب دیکھا تو سمجھ گیا کہ کیا اشارہ ہے۔۔ ٹھان لی کہ جب تک تم نظر نہیں آؤ گی یہاں سے لوٹوں گا نہیں۔ حالانکہ دوست کا منتظر تھا۔''

''میں نظر نہیں آؤں گی مطلب۔۔؟''

لڑکی نے دفعتاً کہا۔اس کے ماتھے پر ایک لکیر سی ابھر آئی تھی۔دوسری خاموش ان کی باتیں سنتی رہی۔

''مطلب ایسی لڑکی جسے میں خواب میں دیکھتا چلا آیا ہوں۔۔یعنی۔۔یعنی۔۔''

''یعنی جس کے بال بھورے اور آنکھیں ہری ہوں۔۔؟''

لڑکی نے بڑے اعتماد سے کہا۔

''بالکل۔۔''

''ایسے تو کسی گرلز کالج کے باہر کھڑے آپ دیکھنا شروع کریں گے تو اس حلیے کی بھی کچھ لڑکیاں نظر آجائیں گی۔''

وہ اطمینان سے بولی۔

''ہاں میں نے آج خواب بھی دیکھا تھا تو۔۔یقین تھا کہ آج ضرور۔۔خیر چھوڑو۔۔یہ بتاؤ کہ تمہارا نام کیا ہے۔تمہارا پورا نام۔۔سرنیم وغیرہ۔۔''

''کیوں۔۔میں آپ کی ذات برادری رتبے وغیرہ کی نہ ہوئی تو۔۔اور یہ بات خواب میں نہیں بتائی کسی نے۔۔آپ کو کہ اگر لڑکی۔۔''

وہ فوراً بولی تو لڑکے نے بات کاٹی۔

''بتائی ہے۔۔اور مجھے یقین ہے کہ ہم ایک برادری سے ہیں۔۔تمہارا رنگ۔۔لمبی آستینیں۔۔طرزِ گفتگو۔۔سب وہی ہے جو ہمارے یہاں۔۔''

''نہیں ہوا تو۔۔؟''

اس کی دوست نے بات کاٹ کر کہا۔

''ایسا نہیں ہوگا۔۔مجھے یقین ہے۔۔''

اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔لڑکی خاموش اسے دیکھتی رہی۔اس کی دوست جیسے کچھ سوچنے لگی۔

مگر میں جلد پیغام بھیجنا چاہتا ہوں۔۔میں اچھا خاصا کما لیتا ہوں۔۔تمہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔۔اور ہاں تم جب تک چاہو بڑی خوشی سے پڑھ سکتی ہو۔۔''

وہ لڑکی اور اس کی دوست کو باری باری دیکھ کر بولا اور پھر غور سے لڑکی کے چہرے کو دیکھنے لگا۔

''مگر یہ بال کیوں کٹوا دئے تم نے۔۔بلکہ آدھے کر دئے۔۔اپنے بال۔۔''

وہ افسوس ناک لہجے میں بولا۔

''جی نہیں۔ میں نے اپنے بالوں کی لمبائی ہمیشہ سے اتنی ہی رکھی ہے۔۔آپ کچھ دیر اور کالج کے باہر ٹھہرتے تو آپ کو وہ لڑکی بھی نظر آجاتی جسے آپ نے خواب میں دیکھا تھا۔۔وہ فائنل میں ہے اور سائنس سٹوڈنٹ ہے۔لاسٹ پیریڈ میں پریکٹیکل ہونے کی وجہ سے دیر سے نکلتی ہے۔ لمبے بھورے بالوں والی لڑکی۔''

وہ اطمینان سے بولی تو اس کی دوست چھوٹا سا قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

''نہیں۔۔میں تو۔۔گھٹنوں سے تھا وہاں۔۔اور اتنی ریر دیکھنے کے بعد مجھے تم ہی نظر آئیں۔۔ تمہاری طرف ہی اشارہ ہوگا۔۔''

وہ بھی اطمینان سے بولا اور کشتی اٹھا کر کھڑا ہوگیا۔دیوار کے ساتھ لگے میزنما صاف ستھرے کوڑے دان میں استعمال شدہ کاغذی پیالے اور پلاسٹک کے چمچ وغیرہ ڈال کر کشتی میز کے اوپر رکھی اور باہر نکل آیا۔پھر دو قدم چل کر رک گیا جب تک لڑکیاں باہر آگئیں۔

''آپ لوگوں کو کہیں۔۔مطلب گھر چھوڑ دوں۔۔؟''

''نہیں شکریہ ہم چلیں جائیں گے۔۔''

لڑکی کی دوست نے جلدی سے کہا۔

وہ سڑک پار کرنے کے لئے آگے بڑھ گئیں تو وہ ان کی طرف لپکا۔

''پتہ۔۔تمہارا پتہ۔۔''

وہ لڑکی کے قریب ٹھہر گیا۔لڑکی نے لمحہ بھر اس کی طرف دیکھا تو لڑکے نے عجلت سے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

''اوہ۔۔میں نے اپنا پتہ تو دیا ہی نہیں تم کو۔''

اس نے ایک کارڈ لڑکی کی طرف بڑھایا۔لڑکی نے کارڈ پر اس کا نام ڈگری اور رہائش کا مقام پڑھا۔پھر اس کو ایک نظر غور سے دیکھا۔پھر کارڈ اپنی دوست کو تھما دیا۔

''آپ لوگوں کو رشتہ پسند نہ آئے تو انکار کر دیجئے گا۔۔''

وہ لڑکی کی دوست سے مخاطب ہوا۔

اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری تھی۔پھر پل بھر بعد سنجیدہ نظر آنے لگا۔کچھ لمحے خاموشی سے گزر گئے۔ہری آنکھوں والی لڑکی اپنی دوست کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔اس نے اثبات میں سر کو جنبش دی تو لڑکی نے اپنے شانے سے جھول رہے لمبے دستے کے رنگ برنگے گل بوٹوں والے بیگ کو

کاندھے سے اتار کر ہاتھ میں سنبھالا اور اس میں سے قلم نکالنے لگی تو لڑکے نے فوراً ایک چھوٹی سی ڈائری اس کی طرف بڑھائی۔ لڑکی نے اس پر اپنا پتہ لکھا اور ڈائری اسے لوٹا دی۔

''روشنی پال۔۔''

وہ زیر لب بولا۔

میرا اندازہ صحیح تھا۔۔شکریہ۔''

اس نے ڈائری تھامی اور دوسری طرف مڑا۔

''تھینک یو سو ویری مچ۔۔''

دفعتاً پلٹ کر اس نے لڑکی کی دوست سے کہا۔

دو روز بعد لڑکی کے گھر اس کا پیغام آ گیا۔ رشتہ اچھا تھا۔ لڑکی کی تعلیم بھی جاری رہ سکتی تھی۔ کوئی شرط تھی نہ کوئی مانگ۔ بڑی لڑکی کا رشتہ طے ہونے تک سگائی کی رسم روک دی گئی تھی۔

جس روز سمیر کے گھر والے روشنی کو دیکھنے آئے تھے اس رات روشنی بہت دیر تک جاگتی رہی۔ سب اتنی جلدی ہو رہا تھا۔۔ سب کیا ہو رہا تھا اس کی سمجھ میں جیسے کم کم ہی آ رہا تھا۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔

کھڑکی کے کانچ کے دوسری جانب لیمپ پوسٹ سے ٹیوب لائٹ کی ایک لکیر کمرے کے فرش پر پڑ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر کھڑکی کے قریب چلی گئی۔ دور کہیں سے پٹاخوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ آسمان کے دوسرے کنارے کے پاس کسی نے کئی رنگ کی پھلجڑیوں والی آتش بازی چھوڑی تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لہرا گئی۔ وہ مسہری کی جانب پلٹ آئی۔ تپائی سے پانی کا گلاس اٹھایا۔ تھوڑا سا پی کر واپس ڈھک دیا۔ پھر ہاتھ گردن کے قریب لے جا کر بال اوپر کئے اور تکیے پر سر دھر کر بالوں کو پیچھے کی جانب پھینکا کہ بال اتنے لمبے نہ تھے جو انہیں چوٹی میں گوندھا یا چھلے میں پرو دیا جاتا۔ اور اتنے چھوٹے بھی نہ تھے کہ گردن کے نیچے آ کر جلد میں نہ چبھتے۔

روشنی نے ایک گہری سانس لی اور آنکھیں موند لیں۔

روشنی کی شادی ہو گئی۔ اِس گھر کا ماحول بھی اُس کے گھر جیسا تھا۔ سادہ سا، پُر سکون سا۔ سمیر کو کوئی لت بھی نہ تھی۔ گھر میں زیادہ لوگ نہیں تھے اس لئے وہ وقت اپنی مرضی کے مطابق گزار سکتی تھی۔ اس

نے گھر سے کتابیں منگوالی تھیں اور کالج جانا شروع کر دیا تھا۔ سمیر اسے دفتر جاتے وقت کالج چھوڑ آتا۔ وہ کالج کی بس میں لوٹ آتی۔

وہ بڑی دل جمعی سے پڑھائی میں لگی تھی۔ سوائے امتحانات کی تیاری کے اسے کچھ سوجھتا ہی نہ تھا۔ تاہم اس نے سوچ رکھا تھا کہ امتحان کے بعد وہ سمیر کے ساتھ بہت سے دن کہیں چھٹیاں منانے جائے گی۔

کچھ مہینے سب ٹھیک ٹھاک چلتا رہا۔ پھر اچانک بسوں کی ہڑتال ہوگئی۔ کالج کی نجی بسیں کم تھیں۔ ان سے کام چلایا جانے لگا۔ مگر وہ کئی دوسرے راستوں سے ہوکر طالبات کو چھوڑنے جاتیں اور کبھی کبھار مخالف سمتوں کی لڑکیوں کو ایک ہی بس میں بیٹھنا پڑتا۔ لڑکیاں اکثر دیر سے گھر پہنچتیں۔

سمیر دفتر سے لوٹا تو اسے معلوم ہوا کہ روشنی دیر سے آئی تھی۔

''کیا ہوا۔۔؟ سب ٹھیک تھا نا انتظام۔۔ ٹرانسپورٹ کا۔۔؟''

سمیر نے گاڑی کی چابی، گھر کی لابی کی دیوار میں لٹک رہی چابی کی شکل کی چوبی کھونٹی میں لگی خمدار کیلوں میں سے ایک پر ٹانک دی۔

''ہاں سب خیریت تھی۔۔ بس کا انتظار کرنا پڑا تھا کچھ زیادہ دیر آج۔۔ سب ہی لڑکیوں کو۔۔''

روشنی نے سر اٹھا کر سمیر کی طرف دیکھ کر کہا۔ وہ بال پوائنٹ دانتوں میں دابے اپنی کسی نوٹ بک میں بڑے انہماک سے کچھ پڑھ رہی تھی۔

''چلو خیریت سے آگئیں۔۔ کل بھی شاید بس نہ چلے۔۔ دیکھتے ہیں کل۔۔''

وہ اندر کی جانب بڑھ گیا۔

اس دن سمیر نے خواب میں روشنی کو پریشان دیکھا۔ وہ بس کے انتظار میں کالج کے باہر کھڑی ہے اور کوئی بس وہاں نہیں ٹھہرتی۔ حتیٰ کہ شام ہوگئی۔ سمیر پتہ نہیں کس سبب وہاں سے گزرتا ہے۔ روشنی اسے تنہا کھڑی نظر آتی ہے اور وہ اسے اپنے ساتھ گھر لے آتا ہے۔

''آج سے میں تمہیں خود ہی پک اپ بھی کروں گا۔۔''

اس نے ناشتے کے دوران روشنی سے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔ آجاؤں گی میں۔۔ اس رُوٹ پر ایک اور لڑکی بھی رہتی ہے۔ دونوں ساتھ آئیں گے۔۔''

روشنی تو س پر جیلی لگا رہی تھی۔اس نے سر اٹھائے بغیر جواب دیا۔

''میں نے خواب دیکھا ہے۔۔تم پریشان ہو جاؤ گی۔۔''

''اگر ایسا محسوس ہوا تو میں آپ کو فون کر دوں گی۔''

''ایسا ہی ہوگا۔۔میں لینے آ جاؤں گا۔''

سمیر نے بڑے یقین سے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔روشنی اسے پل بھر دیکھنے کے بعد کرسی سے اٹھ گئی۔

''تم نہیں جانتیں دنیا کیسی ہے۔۔خوامخواہ پریشان کرنے پر تل جاتے ہیں لوگ لڑکیوں کو۔۔سب لوگ ایک سے نہیں ہوتے۔۔''

اس نے گاڑی چلاتے ہوئے ایک نظر بائیں طرف بیٹھی روشنی کو دیکھا اور پھر سامنے ونڈ سکرین کی جانب دیکھنے لگا۔

''ہوں۔۔''

روشنی نے سر اثبات میں ہلایا اور اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''مگر میں کوئی چھوٹی سی لڑکی نہیں ہوں۔۔آپ فکر مت کیجئے۔''

''کیسے نہ کروں۔۔میں نے خواب میں دیکھ لیا ہے۔۔میری یہ خوبی صرف میری مدر جانتی تھیں اور اب تم جانتی ہو۔ماں تو مجھے سمجھتی ہیں۔۔تم بھی سمجھنے کی کوشش کرو۔۔مجھے ہونے والے واقعات کا۔۔''

''پہلے ہی علم ہو جاتا ہے۔۔جانتی ہوں۔۔جیسا آپ کو ٹھیک لگے۔۔''

روشنی نے اس کی بات کاٹی اور بات ختم کی۔اس کا کالج آ گیا تھا۔

اس دن ہڑتال جذوی تھی۔واپسی پر روشنی کو اپنی بس تیار کھڑی نظر آئی اس نے سمیر کو فون کیا۔

''میری بس کھڑی ہے آج۔۔آپ مت آیئے گا۔۔''

''نہیں نہیں میں آ رہا ہوں۔تم میرے ہی ساتھ چلو گی۔۔''

'مگر جب بس تیار ہے تو۔۔آپ کو آتے پندرہ منٹ لگ جائیں گے۔تب تک میں گھر پہنچ چکی ہوں گی۔''

اس نے فون بند کر دیا اور بس میں سوار ہو گئی۔

اس رات سمیر نے پھر خواب دیکھا تھا۔ اس نے دیکھا کہ روشنی ایک بس میں اکیلی بیٹھی ہے۔ مگر پریشان ہے نہ خوف زدہ۔

صبح اس نے اعلان کردیا کہ وہ ہمیشہ اسے اپنے ساتھ لائے لے جائے گا اور جس دن ایسا ممکن نہ ہوگا اس دن اسے کالج سے ناغہ کرنا پڑے گا۔ اور یہ بھی کہ یہ سب اسی کی بہتری کے لئے ہے۔

روشنی نے اس کی باتیں سنیں اور اس کے ساتھ کالج کے لئے نکل گئی۔ مگر سارا دن اس کے خیالات کو یکسوئی میسر نہ ہو سکی۔

امتحان سر پر ہیں اور سمیر نے کہا ہے کہ وہ۔۔

کیوں نہیں جا سکتی۔ اپنی حفاظت شادی سے پہلے بھی تو کرتی تھی وہ۔۔

وہ سوچتی رہ گئی۔

اس رات روشنی نے بھی خواب دیکھا۔

وہ اپنے بابا کے گھر میں پڑھنے کی میز پر بیٹھی ہے۔ مگر سامنے تمام کتابیں ایک ہی شکل و صورت کی ہیں۔ وہ ایک کتاب اٹھانے لگتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ لکڑی کی ہے اور کیلوں کے ذریعہ میز کے ساتھ پیوست ہے۔ دوسری کتاب اٹھاتی ہے جو بہت بوسیدہ ہے اور ہاتھ میں لیتے ہی ورق ورق ہو کر بکھرتی جاتی ہے۔ وہ باہیں پھیلا کر اوراق کو پکڑنے کی کوشش کرتی ہے تو سارے ورق ننھے ننھے ٹکڑوں میں بٹ کر کھڑکی کے راستے باہر اڑ جاتے ہیں۔ اتنے میں سمیر کمرے میں آتا ہے اور میز پر جڑی کتاب اٹھا لیتا ہے۔ کچھ ایسی آسانی سے جیسے وہ میز کے ساتھ جڑی ہی نہ ہو۔ روشنی کتاب اس کے ہاتھ میں دیکھ کر خوشی سے ہنستی ہوئی اس کی جانب لپکتی ہے تو وہ کتاب کو اسی کھڑکی کے راستے باہر پھینک دیتا ہے۔

وہ گھبرا کر جاگ گئی۔ دھڑکتے دل کو قابو میں کرنے کے لئے گہرے گہرے سانس لیتی، چت لیٹی نومبر کے مہینے کے ساکت پنکھے کو دیکھتی رہی۔ ہلکی سی دھند کے سبب قدرے صاف نظر آرہے آسمان کی نصف شب کو صبح کاذب سمجھ کر ایک فریب زدہ کوا، رہ رہ کے بول اٹھتا تھا۔

روشنی جانے کتنی دیر پھٹی پھٹی آنکھوں سے چھت کو تاکتی رہی۔

دوبارہ آنکھ لگی تو خوابوں نے پھر دھاوا بول دیا۔

یہ گھر جانے کون سا تھا۔ ایک منزل پر مشتمل کوئی مکان۔ یوں نیا سا معلوم ہوتا تھا مگر جب روشنی نے گھر کے باغیچے سے مکان کو دیکھا تو اس کے بائیں جانب، چھت سے ڈھکی بڑی سی بالکنی میں

بہت سا سامان دھول کی بے شمار، سیاہ رنگ پرتوں میں اٹا نظر آیا۔

اسے صاف کرنے میں بہت وقت لگ جائے گا۔ روشنی نے بے بسی سے سوچا، اور اُدھر پہنچنے کا راستہ تلاش کرنے لگی۔ وہ سارے مکان کے اندر باہر گھوم لی۔ لیکن بالکنی تک رسائی کا کوئی وسیلہ ہاتھ نہ آیا۔ چنانچہ باغیچے کے ایک کونے میں گھٹنوں کو باہوں میں لے کر سوچنے بیٹھ گئی مگر فریب خوردہ کوا مسلسل تین مرتبہ اس زور سے بولا کہ اُس کی نیند ٹوٹ گئی۔

اس بار کوا بولنے میں حق بجانب تھا کہ کچھ اور پرندے بھی اپنی اپنی اونچی نیچی صداؤں میں اس کا ساتھ دے رہے تھے۔

روشنی نے ایک بھرپور نظر کھڑکی کے باہر ڈالی۔

خوابوں کا سلسلہ سوچوں میں تازہ تھا۔ اور یہ رنجیدہ خیالات بھی کہ ذہن میں آخر کار یہ بات بس ہی گئی کہ اسے مشکل صورتِ حال کا سامنا ہے، سمیر کا سلوک یکطرفہ فیصلوں پر مبنی ہے، اور اسے ان باتوں کا احساس دلانا سب باتوں سے بھی مشکل ہے۔

سمیر بضد تھا کہ اسے خود ہی کالج لائے لے جائے۔ حالانکہ زنانہ کالج میں اسے داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی اور اس کے انتظار میں روشنی کو داخلی پھاٹک کے باہر کھڑا رہنا اور زیادہ تکلیف دہ معلوم ہوتا تھا۔ ایک دن سمیر کے آنے سے لحہ بھر پہلے کسی نوجوان نے گیٹ کے باہر کھڑی روشنی کو اپنی موٹر سائیکل پر گھر چھوڑنے کی پیشکش کی جو روشنی نے ٹھکرا دی۔

"کون تھا یہ لڑکا؟"

سمیر نے روشنی کے گاڑی میں داخل ہوتے ہی پوچھا۔

"کون لڑکا۔؟"

"وہی جس سے تم بات کر رہی تھیں؟"

سمیر اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔

"بات نہیں کر رہی تھی۔ جانے کون تھا۔ پوچھ رہا تھا لفٹ چاہیئے۔؟ میں نے کہا نہیں۔"

"نہیں کہنے کی بھی کیا ضرورت تھی۔ خاموش رہتیں۔ بات ہی نہیں کرنا چاہیئے تھی۔"

سمیر نے روشنی کے چہرے سے نظریں ہٹا کر سامنے دیکھا اور گاڑی سٹارٹ کی۔

"جواب نہیں دیتی تو پھر پوچھتا۔ آپ جب تک نہیں آتے لوگ عجیب عجیب نظروں سے

گھورتے ہیں۔ اب تو ہڑتال کی کوئی پرابلم نہیں ہے۔ بس سے آنے جانے میں کیا ہرج ہے۔۔؟''

پھر وہی بحث۔۔ میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتا۔''

گھر تک کا راستہ کٹنے کے دوران دو میں سے کسی نے کوئی بات نہ کی۔ البتہ وقفے وقفے سے روشنی سمیر کی طرف دیکھتی رہی تھی۔ سمیر سڑک پر نظریں جمائے ڈرائیو کرتا رہا۔ وہ کبھی اس کے چہرے کو دیکھتی، سٹیئرنگ پر سرکتے اس کے ہاتھوں کو اور کبھی اس کے سراپے پر نظر ڈال کر رہ جاتی۔ روشنی کے چہرے پر گاہے حیرت سی چھا جاتی گاہے الجھن، اور کسی وقت پریشانی اور بے چارگی کے سے تأثرات عیاں ہو جاتے۔

اور اس رات روشنی نے پھر ایک خواب دیکھا۔ وہ خواب گاہ کی کھڑکی کے قریب کھڑی باہر دیکھ رہی ہے۔ سمیر مسہری پر دراز اونچی آواز میں سوال پر سوال کر رہا ہے۔

''بائک والے کے علاوہ تم اور کس کس آدمی کو جانتی ہو؟''

''کسی کو نہیں۔۔ کسی کو نہیں جانتی میں۔۔''

''جھوٹ بولتی ہو تم۔۔ میں نے خود تمہیں اس سے باتیں کرتے دیکھا ہے۔۔ اور تم۔۔''

''آپ مجھ پر۔۔ میرے کردار پر۔۔ شک۔۔ شک۔۔''

خواب میں روشنی پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی ہے اور سمیر اسے نہ رونے کے لئے ایک بار بھی نہیں کہتا۔ بلکہ دانت پیس کر اس کی طرف دیکھتا ہے۔

''رونے سے اگر گناہ معاف ہوتے ہیں تو خوب رو۔''

سمیر سر جھٹک کر کمرے سے نکل جاتا ہے۔

روشنی کی اتنے زور کی ہچکی بندھ گئی کہ اس کی نیند ٹوٹ گئی۔

وہ جاگی تو سمیر غسل خانے میں تھا۔

وہ مسہری پر بیٹھی اپنے گھٹنوں کو بازوؤں سے گھیرے کھڑکی سے باہر جانے کہاں دیکھتی رہی۔ بڑے سے درخت کے پاس سے گزر کر مکانات کے اندر جانے والی پیلے رنگ کی کچھ موٹی سی تار پر کوے اور کبوتر قطاروں میں بیٹھے اِدھر اُدھر اڑ کر اپنی جگہیں بدل رہے تھے۔ بڑے پرندوں کی دیکھا دیکھی وہاں بیٹھنے کی کوشش کرنے والے چھوٹے پرندوں کے چھوٹے چھوٹے پنجے تار کو اپنی گرفت میں نہ لے پانے کے سبب پھسل کر گرنے لگتے تو بار بار پنکھ پھڑپھڑا کر اپنا توازن برقرار رکھنے کی کوشش کرتے واپس درخت پر جا بیٹھتے۔

روشنی انہیں نہیں دیکھ رہی تھی۔

بڑے سے درخت، موٹی سی تار اور پتلی سی سڑک کی دوسری طرف مکانات کا سلسلہ موڑ تک جاتا تھا۔ ایک چھت پر بھاری بھرکم سی خاتون شب خوابی کے لباس میں تیز رفتاری سے گول گول چکر کاٹ رہی تھی۔

روشنی کو وہ بھی نظر نہیں آئی۔

ایک قمری کے کوکنے کی مسلسل آواز آ رہی تھی، کُو۔ کُو ککُو۔ کُو کُو۔ اس کُوک میں بُرہا کے گیت کا سوز تھا، نہ سکون سے گائے جانے والے نغمے کا ساز۔ بلکہ پہلی اور آخری کُوک کی درمیانی صدا کچھ ایسے زور سے ابھرتی جیسے ننھی سی قمری اپنے مختصر سے وجود کے اندر کوئی بڑی سی طاقت لئے کسی کو تنبیہ کر رہی ہو، للکار رہی ہو، یا کسی کی سرزنش کر رہی ہو۔ روشنی نے اسے بھی نہ دیکھا تھا اور وہ نظر بھی نہیں آ رہی تھی۔

تار پر بیٹھے کوؤں نے اچانک تشویش ناک انداز میں خبردار کرنے والی آواز سے کائیں کائیں کرنا شروع کیا تو درخت کی ایک قدرے اونچی شاخ پر سے ایک بلی نچلی شاخ پر کودی۔ پتے سرسرا کر دیر تک ہلتے رہے اور کوّے شور مچاتے رہے تو روشنی نے چونک کر ان ساری چیزوں کو دیکھا جن پر اس کی نظریں آ جا رہی تھیں مگر ان میں سے اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے سر بائیں موڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے کی کوشش کی۔ مگر کوکتی ہوئی قمری کہیں نظر نہیں آئی۔ جب اس نے دہنی جانب گردن اتنی خم کی کہ اس کے کان میں پڑی چھوٹی سی بالی شانے اور سر کے درمیان پھنس کر دُکھنے لگی، تو قمری اسی کھڑکی کے بائیں پٹ پر بیٹھی منقار بھینچے کُوکتی نظر آئی۔ بھورے، سرمئی اور سلیٹی پر لئے اور پروں پر نیلے، اُودے اور نارنجی رنگوں کے جگنوؤں کی سی چمک سنبھالے وہ سکون سے بیٹھی تھی۔ مگر مُنا سا سر اِدھر اُدھر ہلاتی ہوئی سیاہ موتیوں سی بے قرار آنکھوں سے دور دور دیکھتی بھی تھی۔

آسمان، سبزے اور پھیکے پھیکے سے سفید رنگ مکانوں کے پس منظر میں پہلی تار بڑی بُری لگ رہی تھی۔ محکمۂ برقیات میں حسِ جمالی کے فقدان پر اس کے لاشعور سے کہیں ہلکی سی جھنجھلاہٹ کی لہر اٹھی تھی مگر شعوری طور پر اسے اس بات کا پتہ ہی نہیں چلا۔ اس نے سر جھکا کر اپنے پیروں کی جانب دیکھا۔

گلے میں پھنسی پھنسی سی جانے کب کی سانس اس کی سرخی مائل گندمی ناک سے باہر آئی تو چہرہ اداسی میں ڈوب گیا۔

حالات نے مجھے خوف زدہ کر ہی دیا۔

اس انسان کا شک آور مزاج میرے تحت الشعور پر حملے کرنے لگ گیا ہے۔

اس کے شکوک کا ردِعمل ہے یہ خوابوں میں اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی کوشش کرنا۔
اور اس آدمی کو میں یہ نہیں سمجھا سکتی کہ جسے تم کوئی غیبی معجزہ سمجھ کر خود میں پیمبرانہ صفات دیکھتے ہو، وہ محض تمہاری غیر شعوری سوچ ہے۔
کسی طور سمجھانا ہوگا اسے۔ کسی نفسیاتی معالج کا سہارا لینا ہوگا۔ ورنہ زندگی دوبھر ہو جائے گی۔ مشکل ترین ہو جائے گی۔
روشنی اٹھ کر نہانے چلی گئی اور کچھ دیر بعد تیار ہو کر ناشتے کی میز پر پہنچی۔ کالج جاتے وقت راستے میں بات کی جا سکتی ہے۔ اس نے سوچا۔

ناشتے کے دوران سمیر کا چہرہ پتھر کے بت کی طرح سخت تھا۔ تازہ زخم نے اس کے رخسار پر چھوٹی سی سرخ لکیر کھینچ دی تھی۔
روشنی نے کٹوری میں تھوڑے سے کورن فلیکس پر کچھ دودھ ڈال رکھا تھا اور اسے چمچ سے بے آواز ہلا رہی تھی۔ ہلکے بھورے باریک کانچ کی یہ کٹوری روشنی کو بہت پسند تھی۔ اس کے سمندر میں اٹھتی لہروں کی شکل کے خمیدہ کناروں پر سوسن کے نیلے نیلے پھول بنے ہوئے تھے۔ ناشتے میں وہ اکثر ہی اس کٹوری کا استعمال کرتی۔ گاہے اس میں دواُبلے انڈوں کی سفیدی نظر آیا کرتی، گاہے دلیا۔ کبھی کٹے ہوئے پھلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تو کبھی جیلی یا جیم۔

''آج میں نے تمہیں جس حالت میں دیکھا ہے وہ کوئی شوہر برداشت نہیں کر سکتا۔''
سمیر نے گھونٹ بھر کر چائے کی پیالی اس طرح پرچ میں رکھی کہ آواز زیادہ ہو۔
''مطلب۔۔ کیا مطلب۔۔''
روشنی نے چمچ کٹوری میں چھوڑ دیا اور کچھ تیز آواز میں بولی۔
''میں نے تمہیں نیم برہنہ حالت میں اس موٹر سائیکل والے آدمی سے لفٹ لیتے دیکھا ہے۔۔ اس سے لپٹ کر بیٹھتے ہوئے دیکھا ہے اور۔۔ اور۔۔''
وہ غصے سے بولا۔
''بس۔۔ بس۔۔''
روشنی نے چیخ کر کہا۔
''اور کچھ نہیں۔۔ بند کیجئے اپنی زبان۔۔ میں نے سوچا تھا کہ آج آپ کو سمجھانے کی کوشش

کروں گی۔۔کسی نفسیاتی معالج سے مشورہ کریں گے جو آپ کو یہ بات ذہن نشین کروائے گا کہ آپ کو کوئی الہام نہیں ہوتا۔۔یہ سوچ ہی کا عکس ہے۔۔اور آپ کی مدر نے بھی آپ کو اسے معجزہ سمجھنے میں مدد کی۔۔کوئی رشی منی نہیں ہیں آپ۔ولیوں اوتاروں والا کوئی اعجاز آپ کو عطا نہیں ہوا ہے۔صوفی درویش آپ جیسے نہیں ہوا کرتے۔۔یہ گری ہوئی سوچ۔۔؟ آپ کو نفسیاتی معالج کی نہیں دماغی ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔۔ایسی بیمار ذہنیت کے لئے ہسپتال نہیں پاگل خانے ہوا کرتے ہیں۔۔سمجھے آپ۔۔؟یہ عزت ہے آپ کی نظر میں میری۔۔؟ایسا کردار ہے میرا۔۔؟ایسی ہوں میں۔۔؟اور۔۔اور ایسی سوچ والے شخص کے ساتھ جینا ہوگا مجھے۔۔''

روشنی کی آواز اور اونچی ہوگئی تھی۔

''نہیں۔ہرگز نہیں۔۔''

وہ کھڑی ہوگئی۔

''ایک دن بھی نہیں۔۔''

اس نے سر جھٹک کر اور زیادہ اونچی آواز میں کہا۔اور میز پر سے تھوڑی دیر پہلے رکھی کتابیں واپس اٹھانے لگی۔

'ایک لمحہ بھی نہیں۔۔'

اس نے دھیمی مگر مستحکم آواز میں گویا اپنے آپ سے کہا۔

کمرے کی طرف پلٹتے ہوئے اس کی نظر ناشتے کی کٹوری پر پڑی جس کے کنارے بھاپ سے دھندلے نظر آنے لگے تھے۔

وہ ایسی ہی ایک کٹوری اپنے لئے خرید لائے گی۔اس نے ایک سیکنڈ کے کسی حصے میں بڑے سکون سے سوچا۔

مگر اس آدمی کو کون سمجھائے گا کہ۔۔

اچانک ذہن میں چلے آئے اس سوال سے اس کے چہرے پر تناؤ چھانے لگا تو وہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔

◆✥◆

سورج مُکھی

برآمدے میں کھڑے سمیر نے بائیں جانب گردن موڑ کر پیپل کے درخت کی طرف دیکھا۔ جہاں ایک توتے نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اُٹھا رکھا تھا۔

''ڈیُو نو سم تھن Due(Do you) know somethin(something)

سمیر نے ایک نظر بدھی کی جانب ڈالی اور دوبارہ پیپل کو دیکھنے لگا۔

''اِٹ مسٹ بی اے میل۔۔لُکِن فار ہز پاٹنر۔

(It must be a male, lookin(looking) for his partner.) ان کا میٹنگ سیزن ہے نا۔۔''

''او۔۔ری اے لی۔؟''

بدھی نے بھی پیپل کی طرف نظر ڈالی۔

دت صاحب اور ان کی بیگم چونک کر کھڑکی کی جانب دیکھنے لگے۔ کھڑکی میں لگے کانچ کے اُس پار جہاں برآمدے کی دیوار پڑوس کے گھر سے ملتی تھی وہاں سمیر کھڑا بدھی سے بات کر رہا تھا۔ اُس کے طویل قامت بدن پر سکول کی وردی والی سفید قمیص تھی۔ بھوری دھاریوں والی سفید ٹائی ڈھیلی سی بندھی تھی

اور رہ رہ کر ہوا میں لہرا جاتی تھی۔ سامنے درختوں کے اوپر ہلکا نیلا آسمان نظر آ رہا تھا۔ گو کہ دھوپ نکلی تھی مگر جنوری کے مہینے کی میدانی علاقوں میں چلنے والی ہوا خاصی ٹھنڈی تھی۔

"ہے بھگوان۔۔۔یہ۔۔۔یہ۔۔۔کیا باتیں کر رہے ہیں۔۔۔آپ کچھ سن رہے ہیں؟ میں کہتی تھی نا کہ۔۔۔یہ لڑکا۔۔۔"

مسز دت کی آواز میں پریشانی اور تشویش صاف عیاں تھی۔ دت صاحب کھڑکی کی جانب دیکھتے رہے۔

"لَولی برڈز نا؟ (Lovely Birds.)"

ندھی مسکرائی۔

"اویاہ۔ ویری کلرفل۔"

سمیر نے مسکرا کر کہا۔ پھر وہ دونوں دھیمی آواز میں باتیں کرنے لگے۔

ندھی کے گھر کا برآمدہ نسبتاً اونچا تھا۔ وہ نازک سی باہیں ریلنگ پر رکھے آگے کو جھکی ہوئی تھی۔۔۔شانوں پر لہراتے بال سامنے گرے آ رہے تھے۔ بالوں کے اوپر اس نے سنہری دھاریاں ڈلوا رکھی تھیں۔ سیاہ بال اُس کے ابروؤں اور سنہرے اُس کی جلد سے میل کھاتے تھے۔ سمیر باتیں کرتا ہوا انگلیوں سے اپنے بالوں میں کنگھا کر رہا تھا۔

ڈرائنگ روم میں بیٹھی مسز دت صوفے سے اُٹھ کر کھڑکی کے قریب جانے لگیں تو دت صاحب نے واپس بلا لیا۔

"وہاں مت جاؤ سُمن۔ دن کا وقت ہے، اُسے کانچ میں سے تم نظر آ سکتی ہو۔۔۔دیکھ لے گا تو خوامخواہ ٹینس ہوگا اور تمہیں بھی ٹینس کرے گا۔"

"میں سننا چاہتی تھی کہ اب ایسی باتوں کے بعد یہ چپکے چپکے کیا باتیں کر رہے ہیں۔"

وہ واپس صوفے پر آ بیٹھیں۔

"ارے ارے۔۔۔ذرا دیکھئے تو۔۔۔یہ لڑکا ہماری عزت خاک میں ملا کر رہے گا۔"

مسز دت کی آواز میں گھبراہٹ ہی گھبراہٹ تھی۔

"ذرا سر تو اُٹھائیے اوپر کو۔۔۔"

انہوں نے شوہر کے ہاتھ سے ٹائم میگزین کا تازہ شمارہ کھینچ کر قریب کی تپائی پر رکھ دیا۔

"آپ کی آنکھوں کا نور اس کی زلفوں پر ہاتھ پھیر رہا ہے۔۔۔آپ۔۔۔آپ آخر کچھ کہتے

کیوں نہیں۔۔؟''

دت صاحب نے دیکھا تو سمیر نے اپنے بالوں میں انگلیاں پروئیں پھر ندھی کے بالوں کو ہاتھ میں لے کر گویا دیکھ بھال کر چھوڑ دیا۔ پھر دھیرے سے کچھ کہا اور دونوں کھلکھلا کر ہنس دیۓ۔

''آپ پلیز کچھ کیجئے۔۔نہیں تو یہ لڑکی۔۔ہے بھگوان۔۔چھوٹے چھوٹے کپڑے پہن کر اس لڑکی نے میرے بچے کو پھانس لیا ہے۔''

دت صاحب کھڑکی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مسز دت کا یہ جملہ سنا تو قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

''چھوڑو بھی۔۔کیوں پریشان ہوتی ہو۔۔بچے ہیں۔۔یاد نہیں سمیر نے کل کیا کہا تھا۔وہ ندھی اور اُس کے بوۓ فرینڈ کو ٹریٹ (treat) دینا چاہتا ہے۔۔پتہ نہیں کاہے کی۔۔''

دت صاحب نے مسکرا کر کہا اور چاۓ کا آخری گھونٹ بھر کر پیالی مسز دت کی طرف بڑھائی تو وہ کیتلی سے چاۓ انڈیلنے لگیں۔

''دودھ ذرا کم۔۔''

''بوۓ فرینڈ۔۔؟ سال میں دو تو بدلتے ہیں اُس کے۔۔پیرینٹس بھی اتنا فریکوینٹلی (frequently) جاتے ہیں ابراڈ (abroad)۔۔جوان لڑکی کو چھوڑ چھوڑ کر۔۔''

مسز دت نے پیالی میں شکر کا ایک چمچ ڈالا اور باآوازِ بلند چمچ چلانے لگیں۔

''ارے ارے۔۔چینی نہیں بھائی۔۔شوگر فری۔۔''

دت صاحب جلدی سے بولے۔

''اوہ۔۔سوری۔۔''

مسز دت نے پیالی اپنی طرف سرکائی اور دت صاحب کے لئے دوسری چاۓ بنانے لگیں۔

''بچّی ہے وہ۔۔گھر میں ملازمہ ہے نا۔۔اس کی دادی بھی تو ہے۔۔پھر ایسا کچھ نہیں ہے۔۔تم بے کار میں پریشان ہونا چھوڑ دونا۔''

''آپ بھی حد کرتے ہیں۔اب تو ہمارا بیٹا ہی اس کا نیا بوۓ فرینڈ ہے۔۔دیکھنا فیل ہو کر رہے گا۔ ٹوویلتھ ہے۔ سکول کا آخری سال۔۔بورڈ ایگزیمز۔۔عزت سے سکول مکمل کر لیتا۔۔پھر جو مرضی کرتا۔ندھی میم صاحب تو نہ بھی پڑھیں۔۔کروڑ پتی باپ بیاہ دے گا کسی پیسے والے سے اُسے۔۔اور ہم۔۔ہم تو نوکری پیشہ لوگ ہیں۔۔عزت والے لوگ ہیں۔۔کوئی حرام کے پیسے کے بل پر تھوڑی عزت کمائی ہے ہم نے؟۔۔پڑھنا تو ہے ہی ہمارے بچے کو ہر حال میں۔''

''سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔ڈونٹ وری۔''

''ڈونٹ وری؟۔۔آس پڑوس میں کوئی دیکھے گا تو کیا سوچے گا۔''

''کسی کو اتنی فرصت نہیں ہے۔ سب کے اپنے مسئلے ہیں۔۔تم۔۔میں بلاتا ہوں اُسے اندر۔۔تم ذرا شانتی رکھو۔''

دت صاحب کے بلانے کی نوبت نہیں آئی کہ سمیر ندھی کو اونچی آواز میں 'سی۔یوُ' اور 'ٹیک کیر' کہتا ہوا اندر آ گیا۔

''بیٹا چینج نہیں کیا۔''

''نہیں ڈیڈ۔۔میں آتے ہی سو گیا تھا۔۔مام میرے لئے سینڈوِچ بنوا دیجئے۔۔ اور جُوس۔۔نہیں نیمو پانی بھجوا دیجئے روم میں۔ندھی کہتی تھی میری توند نکل رہی ہے۔''

وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔

''پرپریشنز (preparation) کا کیا حال ہے؟''

باپ نے اس کی رفتار کے ساتھ گردن گھمائی۔

''کہاں ہوئی ہے ڈیڈ۔۔کرلوں گا۔۔یوُ ڈونٹ وری۔۔''

بھوری دھاریوں والے موزوں میں پاؤں گھسیٹتا ہوا وہ کمرے کی طرف گیا۔ مسز دت اُسے دیکھتی رہیں۔سکول کی وردی والی بھوری پتلون ڈھیلے سے کمر بند کے سہارے اُس کے کولہوں پر اٹکی تھی۔ ایڑھیوں کے نیچے سے کنارے کثرت سے گھسیٹے جانے کے باعث تار تار ہو چکے تھے۔

''یہ ٹراؤزرس کا حال ہے۔کوئی ذرا سا پائنچہ کھینچ لے تو سب کچھ نظر آنے لگے۔اتنی نیچے پہنی جاتی ہے پینٹ۔۔کیا عجیب سا فیشن ہے یہ۔۔''

مسز دت نے ہونٹوں کو خم سا دیا۔ساتھ میں ناک بھی مُڑی۔

''یہ جنریشن ایکس ہے میڈم۔۔''

مسٹر دت خوشگوار انداز میں بات کرنے کی کوشش کرنے لگے۔جبکہ صاحبزادے کی نامکمل تیاری کی داستاں سُن کر پریشان سے ہو گئے تھے۔

''کچھ کھاتا بھی تو نہیں ہے۔۔دیکھئے ہڈیاں نکل آئی ہیں اور میم صاحب نے کہہ دیا کہ توند۔۔کیسا گولو مولو سا تھا میرا بچہ دو سال پہلے تک۔۔فاقہ کشی شروع کر دی۔۔''

''قد بھی بڑھ گیا ہے اس کا۔۔اسی لئے پتلا لگنے لگا ہے۔پھر سٹمک (stomach) کا فلیٹ

(flat) ہونا ضروری ہے۔۔ ہنڈسم ہے میرا بیٹا۔''

دت صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ کھل گئی۔

''ہاں۔۔مگر۔۔صرف کمپیوٹر کے سامنے آنکھیں خراب کرتا رہتا ہے۔بھگوان رَکھشا کرے اس کی۔ سارا سارا دن چیٹنگ (chating) اور گیمز (Games) میں وقت ضائع کرتا ہے نا۔۔ پڑھنے میں لگائے تو گولڈ میڈل ملے اسے۔''

''اپنے بچے کو انڈر ایس ٹی میٹ مت کیا کرو۔ دیکھا نہیں کتنا انفارمڈ ہے۔۔ کسی بھی ٹاپک پر بات کرلو۔۔''

''اور نہیں تو کیا۔۔ایک بس اپنے کورس کی کتابیں نہیں پڑھتا۔ایک بار فیل ہو گیا نا تو ساری انفارمیشن دھری رہ جائے گی۔۔''

مسز دت نے چائے کے برتن کشتی میں سمیٹ لئے اور ملازم کو آواز لگائی۔

دت صاحب باغیچے میں آکر کنارے سے لگے گملوں میں جھانکنے لگے۔

''ہائے انکل''۔

ندھی اپنے برآمدے میں پنجوں کے بل کھڑی ہو کر بولی۔

''ہائے بیٹا۔کیسی ہو۔''

دت صاحب نے مسکرا کر اُسے دیکھا اور پھر گملوں کی طرف جھک گئے۔

''وری گڈ۔''

وہ چہکی۔

دت صاحب نل میں پائپ لگا کر پودے سینچنے لگے۔کونے میں لگے سورج مکھی کے پودے میں ایستادہ اکلوتا پھول دت صاحب کی طرف سے منہ پھیر کر سورج کو دیکھ رہا تھا۔دت صاحب پائپ سنبھالے اسی طرف بڑھے۔

کتنی جلدی بڑے ہو جاتے ہیں یہ بچے۔اُنہوں نے پہلے پھول کو دھویا اور پھر پودے کے باقی حصے کو سیراب کیا۔کل تک یہ ننھے مُنے ،موٹے موٹے بلیزرس (blazers) پہنے اس نیم کے ساتھ لگے سکول بس کا انتظار کرتے ایک دوسرے کو مارتے پیٹتے، ہنستے روتے تھے۔ درخت سے کوئی نبولی ندھی کے کندھے پر ٹپ سے آ گرتی تو وہ ہمیر کے شانے پر ایک چپت رسید کرتی۔وہ رونے لگتا اور کہتا کہ اُسی نے پھینکی ہے اور پھر پھینکے گا۔ جب پھینکوں گا پھینکوں گا کا ورد کرتا تو وہ مار کر بھاگنے کی بجائے اس کی طرف

دوڑ پڑتی تو وہ بھی دو ایک چپتیں لگا کر ہی چین سے بیٹھتا۔ کبھی کبھی سکول بس بھی آ چکتی اور بدلہ باقی رہ جاتا۔ ایسی صورت میں سکول کے بعد تک بول چال منقطع رہتی۔ پھر دو میں سے کوئی معافی مانگ لیتا، وہ بھی گھر کی مداخلت کے بعد۔ اور پھر دوبارہ وہی سلسلہ چل نکلتا۔

دت صاحب پودوں کو پانی دیتے مسکراتے رہے۔ پھر پرائمری کے بعد بچے کم جھگڑنے لگے۔ بلکہ کھیلنا بھی کم ہو گیا۔ کچھ تو ہوم ورک بڑھ گیا جواب ماؤں کی مدد کے بغیر خود کرنا ہوتا تھا۔ اور دوسرے۔۔ دوسرے۔۔ دت صاحب سوچ میں پڑ گئے۔۔ دوسری کیا وجہ ہو سکتی تھی۔ شاید عمر کے ساتھ ساتھ یمیر میں سنجیدگی اور ندھی میں متانت آ گئی تھی۔

(ذہن میں انہوں نے 'سنجیدگی' اور 'متانت' نہیں کہا تھا بلکہ سیریس نیس (seriousness) اور ہیومیلیٹی (humility) جیسا کچھ سوچا تھا۔)

مگر ادھر دو ایک برس سے دونوں پہلے کی طرح ساتھ ساتھ وقت گذارنے لگے تھے۔

دت صاحب نے پپیتے کے پیڑ کی طرف پائپ جھکا کر تنے کو دھوتے ہوئے سوچا تو خود کو بند لبوں سے بے آواز قہقہہ لگاتے بھی سنا۔ اس لئے کہ قہقہہ ان کی ناک سے اونچی آواز کی سانس بن کر پھسلا تھا۔ انہوں نے چونک کر پڑوس کے برآمدے کی طرف نظر ڈالی۔ ندھی وہاں نہیں تھی۔ وہ اطمینان سے دوبارہ کام میں مصروف ہو گئے۔

ندھی جب چھوٹی تھی تو گول مٹول سی تھی۔ چہرے کے خال و خد بھی گول گول سے تھے۔ چھوٹی سی گول گول ناک، گول گول آنکھیں، گول گول رخسار اور گول گول ہونٹ۔ مگر عمر کے ساتھ اس کا قد بڑھا تو چہرہ گول کم اور بیضوی زیادہ نظر آنے لگا۔ ناک ویسی ہی چھوٹی سی جیسے کوئی تتلی عین ناک کی جگہ پر آن بیٹھی ہو۔ آنکھیں بھی لمبی سی لگتی تھیں۔ جیسے دو روپہلی مچھلیاں منہ پاس پاس کئے تیر رہی ہوں۔ ابرو اونچے اور پیشانی کھلی کھلی سی۔ اس نے لپ سٹک لگانا سیکھ لیا تھا۔ اجلے اجلے چہرے پر لاجوردی رنگ کی لپسٹک لگا چھوٹا سا دہانہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے سفید کاغذ پر روشنائی کا قطرہ گرا دیا ہو۔

مسز دت کو وہ عزیز رہی تھی مگر بڑے ہوتے ہی اس کے چھوٹے پہناوے دیکھتے ہوئے مسز دت کی غالباً لاشعوری کوشش ہوتی کہ یمیر کا اس سے ملنا جلنا کم ہو۔ حالانکہ دونوں ہم جماعت تھے اور دونوں کے دوست بھی ساجھے تھے۔ مسز دت سر جھٹک کر سوچتی۔ کبھی وبھو اس کے گھر آ رہا ہے۔ کبھی تشار سکول

سے گھر چھوڑ دیتا۔ کبھی اظہر اپنی گاڑی میں ٹیوشن کے لئے پک اپ کر رہا ہے اور کبھی کوئی موٹر سائیکل سوار لڑکا پھٹ پھٹ کرتا اُسے دت صاحب کے گیٹ کے قریب ہی ڈراپ کر رہا ہے۔ موٹر سائیکل سٹارٹ رہتی اور وہ دونوں زور زور سے باتیں کرتے انجن کے شور میں اور اضافہ کرتے۔ بلکہ اب تو اکثر سکول سے لوٹتے وقت دونوں کی بس مِس ہو جاتی اور سمیر برائے نام کتابوں کی لمبی سی پٹی والا بستہ دربان کی طرف پھینک کر ندھی کے وہاں چلا جاتا۔

''بہادر اندر لے جا۔''

سمیر کی آواز آتی تو مسز دت دانت بھینچ لیتیں۔ آنے دے اپنے ڈیڈ کو تو۔۔ وہ زیر لب کہتی۔۔ اور باہر جا کر دربان سے بستہ لے کر اندر آ جاتی۔

''تو کہہ نہیں سکتا کہ بیگ گھر میں رکھ دے خود جا کر۔۔''

مسز دت اندر جاتے جاتے پلٹ کر دربان کو ڈانٹتیں۔

''کیسے بولے گا میم شاب۔۔۔ ثمیر شاب ایک شیکنڈ میں اترا۔ بیگ فٹاک شے پھینکا اور باجو والے گھر میں۔۔''

دربان گیٹ بند کرتے ہوئے کہتا مگر پوری بات سننے سے پہلے ہی مسز دت گھر کے اندر پہنچ چکی ہوتیں۔

''میم شاب کا بچہ۔۔ گدھا۔۔ تیری بھی چھٹی کرواؤں گی۔''

وہ من میں دہراتیں کھانا لگواتیں۔

''بھگوان ہی رَکھشا کرے اب میرے بچے کی۔۔ کسی کو پرواہ نہیں ہے اس کی اب۔۔ یہ لڑکی۔۔ یہ لڑکی۔۔''

وہ دت صاحب کو اندر آتا دیکھ کر کھانے کی میز کے قریب کرسی ذرا سا سرکاتیں۔

''ٹینشن پرون (tension prone) ہے میری بیوی بھگوان۔ اس کی بھی رَکھشا کرنا۔۔''

دت صاحب مسکراتے۔

''اسے تم پر بھروسہ ہوتا تو اتنی پریشان نہ ہوتی پربھو۔۔''

وہ قہقہہ لگاتے۔

''دیکھ لیجئے گا۔۔ آپ خود ہی پچھتائیں گے ایک دن۔۔ دل گھبراتا رہتا ہے میرا تو۔۔ پتہ نہیں کیا ہوگا۔۔''

اور پتہ نہیں کیا ہونے کا وقت آیا ہی چاہتا تھا۔

مارچ کے مہینے کی ایک زیادہ ہی گرم دوپہر تھی۔ سکول کی بس کے آنے کا وقت جانے کب کا نکل چکا تھا۔ سمیر کا کہیں پتہ نہ تھا۔ پڑوس میں معلوم کیا تو ندھی کی دادی بھی ندھی کے گھر نہ پہنچنے سے پریشان تھیں۔ مسز دت بے چینی سے پھاٹک کے آس پاس ٹہل رہی تھیں۔ صبح سمیر نے کہا تھا کہ اس کا موبائل ریچارج کروادیں۔

''مام صرف ہنڈریڈ روپیز کا ڈالوادیں۔۔ فون کا اِن کمِنگ بھی بند ہوگیا ہے۔۔ ڈِسکنیکٹ ہونے والا ہے۔''

وہ جوتے کے فیتے باندھتا بولا تھا۔

''یہ جوتے ذرا صاف نہیں کر سکتے۔۔ لاؤ مجھے دو۔۔''

''او مام۔۔ دِس را لُک از اِن (This raw look is in)''

اس نے جیسے کہ بے زاری سے کہا تھا۔

''یہ فیشن میں ہے؟۔۔ یہ گندے جوتے اور تم۔۔''

''کم آن ماما۔۔ گِومی سم منی۔۔ دیں گے کہ جاؤں میں۔۔ لیٹ ہو رہا ہوں۔۔''

''سکول سے آجاؤ۔۔ پھر۔۔''

مسز دت نے کہا تھا۔

تین دن پہلے پانچ سو کا کارڈ ڈلوایا۔۔ ایک رات میں ختم۔۔ فضول میں جانے کیا sms اور باتیں۔۔ وقت بھی برباد اور پیسہ بھی۔۔ دو ہفتے ٹالوں گی اسے۔۔ انہوں نے صبح دل میں سوچا تھا۔ مگر اس وقت سمیر کے فون پر اس کی آواز کے بدلے، 'نمبر استھائی روپ سے سیوا میں نہیں ہے' سن کر انہیں مزید تشویش ہو رہی تھی۔

نیم کی چھاؤں تلے دبلی باہوں والی دھوبن لوہے کی بھاری استری پکڑتی سے اِدھر اُدھر سرکا کر خاموش دوپہر کو آواز بخش رہی تھی۔

اندر فون کی گھنٹی بجی تو مسز دت لپک کر پہنچیں۔

''ماما۔۔ سوری۔۔ میں لیٹ ہوگیا۔۔ لیٹ ہو جاؤں گا۔''

سمیر کی آواز تھی۔ مسز دت کی جان میں جان آئی۔

''ہو کہاں تم؟۔۔''

انہوں نے تیز آواز میں پوچھا۔

''ہسپتال میں۔۔۔ہوں۔۔وہ میرا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔۔آپ آسکتی ہیں؟ ویسے میں ٹھیک ہوں۔۔شاید کچھ ٹانکے وغیرہ لگیں گے۔۔بس اور کچھ نہیں۔۔''

''ارے کہاں۔۔بیٹا۔۔کہاں ہو تم۔۔ٹھیک تو ہونا۔۔میرے بچے میں ابھی آئی۔۔کون سے ہاسپٹل میں۔۔ابھی تک کیوں نہیں کیا تھا فون۔۔''

آواز میں لائی ہوئی تیزی پل بھر میں غائب ہوگئی۔

''پوچھتا ہے آسکتی ہوں؟''

وہ نم آنکھیں جھپک کر زیرلب بڑبڑائیں۔

سمیر کا سارا چہرہ خون آلود تھا اور سکول کی وردی والی سفید قمیص خون سے سرخ بلکہ سیاہی مائل ہو چکی تھی۔اس کا داہنا ابرو پھٹ گیا تھا اور سارا جسم چھل سا گیا تھا۔دوسری کوئی گہری چوٹ نہیں تھی۔

دت صاحب اس دن شہر سے باہر تھے۔

''کسی سے لفٹ لی تھی میں نے بائک پر۔اُس نے بریک لگائی تو میں گر گیا۔۔سڑک پر۔''

اس نے ٹھہری ہوئی آواز میں ماں کو بتایا۔

مسز دت کی آنکھیں بھیگتی رہیں۔ان کے چہرے پر ایسا کرب تھا جیسے تکلیف خود ان کو ہو رہی ہو۔

تم کب اتنے بڑے ہوگئے بیٹا۔انہوں نے دل میں کہا۔وہ زخمی ابرو پر جم چکے خون کو دیکھنے لگی۔ابھی تک فسٹ ایڈ نہیں ہوا تھا۔اور مزید ایک مصیبت منتظر تھی۔

موٹر سائیکل سوار نے جس آدمی کی خاطر بریک لگایا تھا وہ بھی کچھ زخمی تھا۔اور اس آدمی کا ساتھی اس بات پر بضد تھا کہ موٹر سائیکل سمیر ہی چلا رہا تھا۔پولیس بھی آگئی مگر چونکہ موٹر سائیکل برآمد نہیں ہوئی اس لئے ثبوت کوئی نہیں تھا۔مگر ایک گواہ کی وجہ سے خاصی پریشانی کا سامنا تھا۔پولیس کا دعویٰ تھا کہ وہ گھنٹے بھر میں بائک برآمد کر کے کیس مضبوط کرے گی۔سمیر کو دن بھر ہسپتال میں رکھ کر گھر روانہ کیا گیا۔مگر پولیس نے پیچھا نہ چھوڑا اور پوچھنے چلی آئی کی سمیر کی موٹر سائیکل کہاں ہے۔مگر سمیر کے پاس موٹر سائیکل تھی ہی نہیں۔مسز دت بڑی شرافت سے کہتی کہ اُن کے بیٹے کے پاس بائک کبھی تھی ہی نہیں مگر خدا جانے پولیس کو کیا چاہیئے تھا۔

ندھی سمیر کو برابر دیکھنے آتی تھی۔

''آپ پہلے موٹر سائیکل ٹریس (trace) کریں۔ پھر آیئے۔''

پولیس والے ایک دن ندھی کی موجودگی میں آئے تو ندھی نے ان سے بڑی مضبوطی سے کہا تھا۔ پھر اس کے بعد پولیس نہیں آئی۔

سمیر کے جس ابرو پر چوٹ لگی تھی وہ آنکھ کچھ دن بند رہی۔ چہرہ اُس طرف سے سوج کر نیلے رنگ کا ہوگیا تھا۔ پھر کچھ دن بعد نیلاہٹ سرخی مائل سی ہوگئی۔ اُس کے بعد بینگنی رنگ نظر آنے لگا۔ رنگ بدلتے رہے۔ ندھی مسلسل آتی رہی۔ کبھی ڈریسنگ کرنے آ رہی نرس کے ساتھ کھڑی پٹی بدلوا رہی ہے، کبھی شوربہ بنوا رہی ہے۔ میوزک سسٹم کے لئے نئی 'سی ڈیز' لا رہی ہے۔ سکول سے سیدھا سمیر کے گھر یعنی سمیر کے کمرے میں پہنچ کر دن بھر سکول میں آنکھوں دیکھا، کانوں سنا اور کاپی پر لکھا گیا حال بیان کیا جا رہا ہے۔ سمیر کی مزاج پرسی کے لئے آ رہے سکول کے دوستوں کی مہمان نوازی میں مسز دت کو مشورے بھی دیئے جا رہے ہیں کہ کون چائے کافی لے گا اور کون شربت اور کوک وغیرہ۔

جس دن سمیر کے ٹانکے کھولے گئے وہی اس کی مسہری کے پاس کھڑی اپنے نازک سے شانے سے اُس کا سر لگائے اُسے حوصلہ دیتی رہی اور گھر میں ناریل کا تیل ڈھونڈتی رہی۔

''کیا ڈھونڈ رہی ہو ندھی؟''

مسز دت نے اُسے ایک غسل خانے سے دوسرے اور اپنی سنگھار میز کے آس پاس آتے جاتے دیکھا۔

''آنٹی ناریل کا تیل۔۔ دادی نے کہا ہے کہ اُس سے سمیر کے آئی بروز پر ٹانکوں کے داغ نہیں رہیں گے۔''

وہ اُدھر ادھر نظر دوڑاتے ہوئے بولی۔

''سمیر کے ہی باتھ روم میں ہوگا بیٹا۔''

دت صاحب نے کہا تو وہ تھینک یو انکل کہہ کر چلی گئی۔

دت صاحب نے بیوی کا سنجیدہ چہرہ دیکھ کر زور کا قہقہہ لگایا۔

''تمہاری سچ مچ کی بہو بھی ایسی سیوا نہ کرتی اُس کی۔۔''

انہوں نے دھیرے سے کہا۔

''ارے آپ تو۔۔ وہ سب تو چلئے۔۔ مگر اس کی یہ یونیفارم۔۔ یہ سکرٹ ہے یا شارٹس (shorts)۔ ان کو سکول میں کچھ کہتے نہیں؟ المینک (almanac) میں تو صاف لکھا ہے کہ گھٹنوں تک

کی لمبائی والا سکرٹ پہنا جائے۔۔''

''ارے اُس کا قد نکل آیا ہے۔ معصوم بچی ہے۔ پھول سی۔۔ تم بس۔۔ یہی فیشن ہوگا۔۔''

''ہاں شاید۔۔۔ مگر ہمارے گھر میں ان کپڑوں میں۔۔۔''

''تو کیا سکول میں بھی تو ان کپڑوں میں ساتھ ہوتے ہیں یہ لوگ۔۔ اور وہاں تو اور بھی لڑکیاں ہوں گی ایسے لباس والی۔۔ تم کس کس سے دور رکھوگی اُس کو۔۔ بڑا ہوگیا ہے وہ۔۔ ایک ذہین دماغ اس کے پاس بھی ہے۔۔''

''بڑا کہاں ہوا ہے۔۔ سترہ برس کا نابالغ بچہ ہے۔۔ اور آپ۔۔''

''قانونی طور پر نابالغ سہی مگر سمجھ دار ہے۔۔ جو تربیت ہم نے دی ہے وہ ضائع تھوڑی ہوگی۔۔''

''پھر کہنا کیوں نہیں مانتا پہلے کی طرح۔۔''

''یہ ٹین ایج ہے اُس کی۔۔ اس میں بچے دوستوں کے مشورے زیادہ مانتے ہیں۔۔ ہم بھی ایسے ہی تھے۔ ہر دور میں پیرینٹس (parents) ایسا ہی کرتے ہیں۔۔ وہ خود کو بڑا سمجھتا ہے اور تم اسے بچوں کی طرح ٹریٹ کرتی ہو۔۔ تم اسے بظاہر اپنے برابر سمجھ کر ڈیل (deal) کرو۔۔ کوئی پرابلم نہیں ہوگی۔۔''

''مجھے کوئی پرابلم نہیں ہے۔۔ میں تو چاہتی ہوں کہ اُسے کوئی پرابلم نہ ہو۔۔''

سمیر اچھا ہوگیا۔ سکول جانے لگا تو زندگی میں پہلے کی طرح ضابطگی بھی آ گئی مگر اچانک ندھی کی دادی انتقال کر گئیں۔ اور ندھی جو کہ والدین کی نسبت دادی سے مانوس تھی، یکلخت تنہا ہوگئی۔ سمیر اُس کا ساتھ نہ چھوڑتا۔ سکول سے لوٹتے ہی اس کے وہاں اور پھر بارہ ایک بجے کہیں گھر آتا۔ مسز دت پریشان ہوا ٹھیں۔ ندھی کے ساتھ ان کی بھی ہمدردی تھی مگر اس صورت حال کے ساتھ وہ سمجھوتہ نہیں کر پا رہی تھیں۔ گھر کی دوسری چابی سمیر اپنے ساتھ لے جاتا۔

''بیٹا۔۔ دیر سے آ رہے ہو۔۔''

ایک رات سمیر ایک بجے شب لوٹا تو مسز دت جاگ رہی تھیں۔

''بارہ بجے تک تو گورو بھی تھا۔۔ مگر اس سے سنبھلتی نہیں۔ پھٹو ہے وہ ایک دم۔۔ میں اُٹھنے لگتا تو رو پڑتی۔۔ بڑی مشکل سے سلایا اُسے میں نے۔۔ جب اُس کی آنکھ لگ گئی تو میں چپکے سے اٹھا۔۔

اُس کے پیرنٹس بھی نہیں سنبھال پاتے اُسے۔۔وہ پہلے ہی سو گئے تھے ایکسٹرا کیز (extra kees) ساتھ لایا ہوں ان کی۔۔نندو کے ہاتھ بھجوا دیجئے گا صبح۔ میں سونے جا رہا ہوں۔ گڈ نائٹ مام۔''

''کچھ کھا تو لو۔۔''

مسز دت نے جو کچھ سنا اُسے سمجھنے کی نا کام کوشش کرتی ہوئی بولیں۔

''ندھی نے بھی کچھ نہیں کھایا۔۔مجھ سے کہاں کھایا جائے گا۔ سوری۔۔ پلیز ڈونٹ ڈسٹرب می ماما۔''

''دو دو لڑکے سلاتے ہیں اس لڑکی کو۔۔کیا سے آ گیا ہے۔۔''

مسز دت بڑبڑاتی ہوئی اپنی خوابگاہ میں داخل ہوئیں۔

''رات کا ایک بج رہا ہوگا۔۔''

دت صاحب نیند کے جھونکوں میں بولے۔

''ہے بھگوان۔۔''

مسز دت نے اپنے ماتھے پر ہتھیلی سے ہلکی سی چپت لگائی اور بتی گل کر دی۔

اگلی رات پھر سمیر نے بارہ بجائے تو مسز دت نے فون کیا۔

''تھوڑی دیر میں آ رہا ہوں ماما۔۔''

وہ بولا تو ساتھ ہی کسی کے دھیمے دھیمے ہنسنے کی آواز آئی۔

''یہ کس کی آواز تھی۔۔؟''

''او۔۔یہ۔۔؟ ہم سب نے ندھی کو ایک چھوٹا سا پپی لے دیا ہے۔۔ ڈیلمی اے شن (Delmiation)۔۔اتنا کیوٹ ہے۔۔''

سمیر کی آواز میں خوشی سی جھلکنے لگی۔

''ندھی رُوم میں اکیلی ہوگئی ہے نا۔۔یہ اُس کے پاس ہوگا نا تو شی وُڈ ناٹ مس ہر گرینی (she would not miss her grany)۔۔''

وہ پھر اُداسی سے بولا۔

''از دیٹ سو؟ (Is that so?)''

مسز دت نے کہا۔

''یاہ۔۔وی ہوپ سو (Yes, we hope so)''

''اچھا تم گھر آ کر کچھ کھا لو۔۔ اگزیمز (exams) آ رہے ہیں۔۔''

''او کم آن مام۔۔ اسے سُلائے بنا ہی کیسے آ جاؤں۔۔''

''اس کا وہ فرینڈ کہاں ہے۔۔ گورو۔۔؟''

''وہ۔۔ سٹیوپڈ (stupid) ہے۔۔ چلا گیا۔۔ سُلا نہیں پایا اُسے۔۔''

''کوئی جانے لگتا ہے تو رونے لگتی ہے۔۔''

''اب تم کب تک اُسے چُپ کراتے رہو گے۔۔ اُس کے ماں باپ بھی تو ہیں وہاں۔۔ یہ اُن کا کام ہے۔۔ تم گھر آ ؤ۔۔''

''ڈونٹ بی سو ہارش (do'nt be so harsh)۔۔ آپ کیسے اتنی ان کائنڈ (unkind) ہو سکتی ہیں۔۔؟ اس کے سوتے ہی آ جاؤں گا۔۔ آپ بڑے گملے کے پیچھے چابیاں رکھ کر سو جائیں۔۔ گڈ نائٹ۔۔''

سمیر نے فون رکھ دیا۔

مسز دت غصے سے کھولتی رہیں۔ دت صاحب آرام سے سوتے رہے۔

''آپ کیسے گھوڑے بیچ کر سو رہے ہیں۔۔ کیسے نیند آتی ہے آپ کو۔۔ آپ کا جوان بیٹا ایک اکیلی لڑکی کے کمرے میں ہے۔۔ اور آپ۔۔''

دت صاحب نے کروٹ لی۔

''اُس کے پیرینٹس (parents) بھی تو ہیں گھر میں۔۔ کوئی اندر سے کمرہ بند کر کے تھوڑی بیٹھے ہوں گے۔۔ ڈونٹ وری۔۔ سو جاؤ۔''

''ڈونٹ وری کوئی گولی ہے کہ کھا کر سو جاؤں۔۔ او۔۔ گاڈ۔۔''

مسز دت نے کمرے سے باہر آ کر بڑے گملے کے پیچھے چابیاں رکھ دیں اور کچھ دیر بعد آخرکار سو گئیں۔

سمیر کے معمول میں کوئی فرق نہ آیا۔

اگلے دن جب پھر رات کے بارہ بجے تو ماں نے فون کیا۔

''او ماما۔ وہ سونے لگی تھی آپ نے گھنٹی بجا کر ڈسٹرب کر دیا۔''

وہ سرگوشی میں بولا اور فون بند کر دیا۔

''ہیلو۔۔ ہیلو۔۔''

مسز دت بولیں۔اور دوبارہ نمبر ملایا۔

''دا سبسکرا ئبر ہیز سُوِچڈ آف ہز موبائیل فون۔ پلیز ٹرائی اگین لیٹر۔''

(The subscriber has switched off his mobile phone. Please try again latter.)

چہکتی ہوئی کمپیوٹرائز ڈنسوانی آواز آئی تو مسز دت کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ دانت پیستی ہوئی خواب گاہ میں داخل ہوئی اور زور سے کچھ اس طرح مسہری پر خود کو گرایا کہ دت صاحب جاگ جائیں۔ مگر دت صاحب نیند میں ذرا سا کھنکارے اور خراٹے لینے لگے۔

اس کے بعد تین دن سمیر گھر پر ہی رہا کہ ندھی دادی کی استھیاں بہانے گھر والوں کے ساتھ ہری دوار گئی تھی۔ مسز دت نے سکھ کا سانس لیا۔

ندھی لوٹی تو رات کے نو بجے سمیر پھر غائب ہوگیا۔ مسز دت نے فون کیا تو بولا کہ دوست کے وہاں ہے اور ابھی آرہا ہے۔ مگر انہوں نے کسی کے دھیمے دھیمے ہنسنے کی آواز سنی تھی۔

''آپ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔۔آپ کا بیٹا اب جھوٹ بول کر ندھی کے گھر میں رہنے لگا ہے۔میں نے خود کسی کے ہنسنے کی آواز سُنی تھی۔۔''

مسز دت نے تشویش ناک لہجے میں شوہر سے کہا۔

''ہنسنے کی۔۔ارے بھائی وہ سوگوار لڑکی کیا ہنسے گی۔''

وہ بے بسی سے بولے۔

''دوست کے گھر میں ہی ہوگا۔''

''نہیں۔۔وہ ندھی کا پلا ایسے ہی کُوں کُوں کرتا ہے جیسے کوئی لڑکی ہنس رہی ہو۔ وشواس کیجئے۔۔جی چاہتا ہے جا کر اُسے کھینچ کر گھر لے آؤں اور اس لڑکی کو ڈانٹ لگاؤں۔۔''

''کیا ہوگیا ہے تمہیں۔۔ری لیکس۔۔غمزدہ ہے بے چاری۔۔وہ تمہارے ڈر سے جھوٹ بول رہا ہے کہ تم پریشان نہ ہوجاؤ۔''

''پریشان۔۔؟میں تو پاگل ہو رہی ہوں اور۔۔آپ۔۔''

''میں کل سمجھاؤں گا اُسے کہ جھوٹ نہ بولے۔۔''

''آپ نے سر چڑھایا ہے۔۔اب میں۔۔میں تو۔۔''

مسز دت رو پڑیں۔

''میرا بچہ بگڑ رہا ہے۔۔ یہ بات تشویش ناک ہے۔۔ آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔۔''

''بگڑنا ہوگا تو اب تک بگڑ چکا ہوگا۔۔ تمہارے فکر کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔۔''

''کسی پر اثر نہیں میری بات کا۔۔ میں زندہ کس لئے ہوں۔۔''

وہ ہچکیاں لیتی رہیں۔

رفتہ رفتہ ندھی سنبھلتی گئی۔ سمیر گھر میں رہنے لگا بلکہ ایک بار ندھی اور گورو کے ساتھ کہیں باہر بھی گیا۔

امتحانات آئے تو سمیر نے پڑھائی برائے نام کی تھی۔ جس دن حساب کا پرچہ تھا سمیر ندھی کے گھر پڑھنے گیا۔ اور پھر آدھی رات کے قریب خود ہی ماں کو فون کیا کہ چابی بڑے گملے کے عقب میں رکھ لیں، وہ تھوڑی دیر میں آجائے گا۔ جُوں تُوں کر کے پریشان سی مسز دت کو نیند آ گئی۔ صبح کے چار بجے آنکھ کھلی تو فوراً اُٹھ کر دیکھا۔ سمیر گھر نہیں آیا تھا۔

''اوہ آپ نے پپی کو جگا دیا۔۔ ایسا کیا ہوگیا مام۔۔ آپ اتنی پریشان ہوگئیں۔۔ ندھی مجھے پڑھا رہی ہے ماما۔۔ بیچاری کا خود کا بھی ایگزیم ہے۔۔''

''تو تم آکر گھر میں پڑھ لو۔۔ اسے بھی پڑھنے دو۔۔''

''اس کا بھی رویژن (revision) ہو رہا ہے نا مجھے پڑھانے سے، ساتھ ساتھ۔۔ میں آؤں گا تو وہ آگے کا پڑھ لے گی۔ بے چاری میری وجہ سے پڑھا رہی ہے۔۔''

وہ سرگوشی میں بولا۔

میرا تو سر پھٹ جائے گا۔۔ اب مجھے ندھی کے پیرینٹس سے بات کرنا ہوگی۔۔ بہت ہوگیا۔۔ اب تو بس بہت ہوگیا۔۔

مسز دت بڑبڑائیں۔

اگلی صبح سمیر سکول جانے والا تھا کہ ندھی کا فون آیا۔

''آنٹی سمیر کو فون دے دیجئے۔۔''

ندھی نے کہا۔

''کیوں کیا ہوا۔''

''کچھ بات کرنی ہے۔۔''

''سکول میں کر لینا نا۔۔ وہ تیار ہو رہا ہے۔۔''

''میں نہیں دے رہی ایگزیم آنٹی۔۔ پڑھا رہی تھی نا اُسے۔۔الارم رکھا تھا کہ دو گھنٹے پہلے اُٹھ کر روائز (revise) کروں گی۔۔ جاگی ہی نہیں۔۔''

تو اب کیا کرو گی بیٹا۔۔ کچھ تو لکھ لو جا کر۔۔''

مسز دت کا دل یکا یک ممتا سے بھر گیا۔

''نہیں آنٹی۔۔ ہماری کلاس ریپریزینٹے ٹو میم (class representative madam) نے کہا تھا کہ تم اپ سیٹ (upset) ہو گی تو بعد میں دے دینا ایگزیم اور ساتھ میں میڈیکل سرٹیفیکیٹ دکھا دینا۔ کوئی پرابلم نہیں ہو گی۔''

''اچھا۔۔ آر یو شیوئر (sure) بیٹا۔۔؟''

''ہاں جی۔۔ سمیر کا موبائل یہاں رہ گیا ہے۔۔ اور۔۔''

''اچھا اچھا۔۔ ابھی بلاتی ہوں۔۔''

مسز دت لاجواب سی ہو گئیں اور سمیر کو بلانے اس کے کمرے کی طرف لپکیں۔

سمیر نے بھی ندھی کو سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ بائیں ہاتھ سے قمیص کے بٹن بند کر رہا تھا۔ ماتھے پر آئے بالوں سے پانی کے قطرے ٹپ ٹپ ٹیلیفون پر گر رہے تھے۔ مسز دت ممتا بھری نظروں سے عقب سے اسے دیکھتی رہیں۔

''اچھا۔۔؟ اوکے سویٹ ہارٹ۔۔ ڈونٹ وری دین۔۔ گو ٹو سلیپ۔۔ سویٹ ڈریمز۔۔''

(ok sweetheart, don't worry then...go to sleep. sweet dreems)

سمیر نے فون رکھ دیا۔ پل بھر پہلے مسز دت کا ہمدردی بھرا دل غصّے سے بھر گیا۔

سویٹ ہارٹ کا بچہ۔ ہو جانے دے ایگزیمز۔ بدتمیز کہیں کا۔

وہ دانت بھینچے باورچی خانے کی طرف گئیں۔

''ہائے مام۔۔''

سمیر نے جاتے ہوئے کہا۔

''بیسٹ آف لک بیٹا۔۔''

وہ ایسے مسکرائیں جیسے ابھی ابھی انہوں نے غصے سے دانت بھینچے ہی نہ ہوں۔

سمیر امتحان دے کر لوٹا تو ندھی کے گھر اس خیال سے نہیں گیا کہ ہوسکتا ہے وہ سو رہی ہو۔۔ باہر بالکنی میں ذرا ٹہلا کیا تو ان کی ملازمہ نظر آئی۔ پتہ چلا کہ ندھی جاگ رہی ہے۔

''فوراً بلاؤ اُسے۔۔''

اس نے ملازمہ کو حکم دیا۔ ندھی جب باہر آئی تو اس نے نہایت عجلت سے ہاتھ آگے بڑھایا۔ مسز دت کمرے میں سے دیکھ رہی تھیں بلکہ سن بھی رہی تھیں کہ نندو نے جھاڑ پونچھ کرتے وقت کھڑکی ادھ کھلی چھوڑ دی تھی۔ ندھی کو سمیر کی طرف ہاتھ بڑھاتے دیکھ کر غصہ آ رہا تھا انہیں۔ مگر سمیر نے ہاتھ نہیں ملایا تھا اور ندھی کو امتحان کا پرچہ تھمایا جسے ندھی نے جلدی سے دیکھنا شروع کیا۔

''سبھی کوئیسچنز (questions) وہی ہیں نا۔''

وہ چہکی۔

''ہاں یار تھینکس۔۔تو نہیں پڑھاتی تو میری ریڑھ لگ جانی تھی آج۔۔''

وہ دھیرے سے بولا۔

''پر تو نے اچھے سے کئے نا سارے۔۔؟''

''آف کورس یار۔۔آئی مین، میم (I mean ma'm)''

سمیر بولا تو وہ دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

''یار ایک۔۔ایک فیور (favo-) چاہئے تجھ سے۔''

ندھی بولی تو مسز دت کے کان کھڑے ہو گئے۔

''شیور (su:e)، بول نا۔۔''

''گورَو ناراض ہو گیا ہے۔۔''

وہ اداسی سے بولی۔

''او۔۔نو۔۔(oh-no)۔۔مگر کیوں۔۔''

سمیر جلدی سے بولا۔

''ایسے ہی۔۔فالتو میں۔۔یو نو ہاؤ مچ آئی لو ہم۔۔''

(you know how much I love him)

وہ رو پڑی۔

''اے۔۔پلیز یار۔۔رونا نہیں ہاں۔۔ڈونٹ وری۔ابھی ٹھیک کرتا ہوں اُسے۔۔بھلوٗ کھانے لگا ہے ایڈیٹ کہیں کا۔۔چل چُپ ہو جا۔۔دیکھنا کیسے لائن پر لاتا ہوں۔۔''

سمیر نے اس کی آنکھ سے ٹپکا آنسو اُس کے رخسار پر سے شہادت کی انگلی سے پونچھ لیا۔

مسز دت دیدے پھاڑے دیکھتی رہیں۔

''ایکچو لی (actualy) اُسے غصہ ہے کہ آج مجھے اس کے ساتھ مووی (movie) جانا تھا۔۔ میں سوتی رہ گئی۔اور وہ سکول ہی میں مجھے ڈھونڈ تا رہا۔۔ میں نے موبائل سائلینٹ (silent) پر رکھا تھا پتہ ہی نہ چلا۔۔''

''ارے فارگیٹ یار (forget) ہاں تیرے یہ ہائی لائیٹڈ (high lighted) بال بہت اچھے لگتے ہیں۔۔''

سمیر نے ندھی کے بالوں پر ہاتھ پھیرا پھر اپنے بالوں میں انگلیوں سے کنگھا کیا۔

''میں بھی کرواؤں گا، آج اپنے بال ہائی لائٹ۔۔اور گورو کے بھی۔۔''

اس نے دھیرے سے کہا اور پھر چٹکی بجائی۔

''ناؤ کم آن رگومی اے سویٹ سمائل۔''

ندھی سچ مچ مسکرادی۔

''آئی ہیو این آئیڈیا(I have an idea)''

وہ چہکی۔

''کیا۔۔؟''

سمیر جلدی سے بولا۔

''ہمارا سارا گروپ بالوں میں لائٹ براؤن سٹریکس (light brown streaks) ڈلوائے گا۔۔ کچھ ہی تو دن ہیں سکول کے۔۔فوٹو کھینچیں گے ڈھیرے سارے۔۔ یہ ٹریڈ مارک ہمیں ہمیشہ یاد رہے گا۔۔''

وہ پہلے ہنستے ہوئے بولی پھر کچھ اداس ہوئی اور اس کے بعد ایک آہ بھر کر خاموش ہوگئی۔

''فرینڈ شپ مارک(friend ship mark)''

سمیر نے مسکرا کر کہا۔مگر اگلے ہی پل اُس کے لبوں سے بھی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔

''کتنے یاد یں آئیں گے نا سکول ڈیز(school day's)''

اُن دونوں نے اچانک بڑے افسردہ لہجے میں بالکل ایک ہی وقت میں کہا اور پھر ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

◆❖◆

چار دِن

گاڑی کے قریب پہنچتے ہی نہایت خوبرو اور خاصے تند خو، نبیل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی، بلکہ ہونٹوں سے اٹھ کر سرخ وسفید چہرے پر سیاہ چمکیلا حاشیہ بناتی داڑھی مونچھ پر سے پھسلتی ہوئی، سیدھی اوپر جا کر آنکھوں کی پتلیوں میں تھرکتی ،شانے تک بڑھائے ہوئے لمبے بالوں میں بھی لہرانے لگی۔اس نے سر جھٹک کر قہقہہ لگایا اور ڈرائیونگ سیٹ کے قریب سے بڑی سی زرد گیند، جس پر سیاہ حاشیوں والے پنچ کونے خانے بنے تھے، دوسری طرف اچھال دی جسے کرِیکیٹ کی گیند کی طرح کیچ کر کے نو سالہ رونق زور سے ہنس پڑا۔ اس کے موتیوں ایسے سپید دانت، سر پر بندھے چھوٹے سے جُوڑے کو ڈھکنے والے رومال کی طرح ہی چم چم کر رہے تھے۔رومال کے چاروں کونے اوندھے رکھے ہوئے چار پتیوں والے سفید پھول کی طرح پھیلے تھے۔نبیل نے چھت کے اوپر سے لمبی بانہہ آگے کر کے اس کے بڑھے ہوئے ننھے سے ہاتھ کو بغرضِ مصافحہ چھونے کی ناکام کوشش کی۔رونق نے دبلی سی کمر کے بائیں اور کے خم میں سے گیند اٹھا کر داہنی جانب دھری اور پنجوں کے بل کھڑے ہو کر بایاں ہاتھ ملانے کی کوشش کی۔اتنے میں کتوں کے زور زور سے بھونکنے کی آوازیں آئیں تو دونوں ہنستے ہوئے سر گھما کر

دیکھنے لگے۔ اکھل اور نکھل کتوں کی کامیاب نقل اتارتے، کھیلنے کے جوتے پہنے، لمبے لمبے موزے تانے ان کی طرف آ رہے تھے۔ اکھل اپنے بارہ سالہ بھائی سے دو برس بڑا تھا۔ اس نے لپک کر رونق کو اوپر اٹھالیا اور وہ نبیل سے ہاتھ ملا کر باغ باغ ہو گیا۔ اس وقت تک کرن بھی ہانپتا دوڑتا پہنچ گیا۔

''یار۔۔سوری۔۔لیٹ ہو گیا۔''

اس نے نبیل کی طرف دیکھ کر ذرا جھجکتے ہوئے اپنے دس سالہ مگر پچاس کلو وزنی بدن پر روزانہ دیر سے آنے کے باعث طاری گھبراہٹ کو اپنی جانب سے عام لہجے میں چھپانے کی کوشش کی۔

''ٹھیک ہے یار۔۔ تُو تو۔۔''

نبیل بھی اس کے لہجے کا بھرم رکھ کر ہم عمر دوستوں والے انداز میں بولا۔ پھر ربر کا چھلا (جو اس نے ماما کی سنگھار میز سے اٹھایا تھا کہ یہ چھلا سیاہ کپڑے میں بُنا گیا تھا، عام ربر کے چھلوں کی طرح بال کھینچ کر توڑتا نہیں تھا اور لڑکیوں کے استعمال کے چھلوں سے قدرے پتلا تھا اس لئے کوئی آسانی سے نہیں سمجھ سکتا تھا کہ اس نے زنانہ چھلا بالوں میں پہن رکھا ہے) شہادت کی انگلی کے گرد سے نکال کر گاڑی میں بیٹھ گیا اور بالوں کو اس میں پرونے لگا۔ بال پونی ٹیل کی صورت اس کے چوڑے شانوں کے بیچ لہرایا کئے۔

''اب کے پھر چھوٹے کٹواؤں گا بال۔۔ بہت ہو گیا فیشن یار۔۔''

اس نے گاڑی سٹارٹ کی۔

''نہیں بھیّا۔۔ابھی کچھ اور دن رہنے دیجئے نا۔۔اتنے اچھے لگتے ہیں۔۔''

نکھل نے باقی لڑکوں کی طرف دیکھا۔

''ہے نا۔۔؟''

اس نے تائید چاہی۔

''ہاں بھیا۔۔''

اکھل نے فوراً کہا۔

آپ ہیرو لگتے ہو۔۔''

رونق مسکرایا۔

''وہ تو میں ویسے بھی لگتا ہوں۔۔''

نبیل نے قہقہہ لگا کر گردن موڑی اور سب کے چہروں کو دیکھ کر کہا تو چھوٹی سی ٹیم بھی قہقہے لگانے لگی۔

بے سبب کی خوشی ان کے چہروں سے چھلکے پڑتی تھی۔ نبیل نے ونڈ سکرین پر لگے چھوٹے سے آئینے میں ان کے چہروں پر ایک اور نظر ڈالی تو اس کے چہرے پر کئی مزید لمحے تک مسکراہٹ چھائی رہی۔

انجن کی آواز بلند ہوئی۔ گاڑی کے نیچے لیٹا کچھ کچھ سیانا ہو چکا چھوٹا سا بھورا کتا باہر آگیا اور دم ہلاتے ہوئے بڑی بڑی، سیاہ اور پیار سے لبریز تھرکتی ہوئی کالی پیلی پتلیوں سے گاڑی کی کھڑکیوں کو دیکھنے لگا۔ گاڑی چلی، وہ پیچھے دوڑا اور کچھ دور جا کر لوٹ آیا۔ گویا وداع کرنے گیا ہو۔ پیچھے کی نشست پر بیٹھے گرن نے مسکرا کر اس کی ہلتی ہوئی وفادار دم کو ایک نظر دیکھا اور سامنے کی اور پلٹ کر مزید کئی لمحے مسکراتا رہا۔

کتا واپس اسی مقام پر پلٹ آیا کہ اور پہلے صبح جب گاڑی دھلی تھی تو پانی گاڑی کے نیچے کی پختہ گلی کی زمین کو اچھی طرح سیراب کر گیا تھا۔

اور مئی کی تپتی گرمی کی اس صبح میں بھورے رنگ کے کچھ کچھ سیانے اور شب بیداری سے مخمور کتے کو آرام کرنے کے لئے فی الحال اس سے زیادہ آرام دہ جگہ دوسری نظر نہیں آئی۔ وہ زمین پر پڑے لکڑی کے گھوڑے کے طرح چاروں ٹانگیں پھیلائے معصومیت سے پلکیں جھپکتا لیٹا رہا۔

برآمدے کے جنگلے سے لگی نیلوفر گاڑی روانہ ہو جانے کے دو ایک منٹ بعد تک وہیں ایستادہ رہی پھر پلٹ کر کرسی پر آبیٹھی۔ ٹہنیوں سے بنی گئی گول میز پر لگے گول کانچ پر رکھا چینی کا بڑا سا مگ انگلی کے پوروں سے چھوا۔ چائے ابھی ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی۔ چلئے کچھ فائدہ تو ہوا اس گرم صبح کا۔ چائے کی شوقین نیلوفر نے اطمینان سے مگ ہاتھ میں لے کر ٹیک لگالی۔ ایسا کرنے سے اس کی گردن اوپر کو ہوگئی۔ گولر کا درخت گول گول سرخی مائل سبز پھلوں سے لد گیا تھا اور پتوں جیسے سبز رنگ کے پروں والی ایک چھوٹی سی چڑیا شاخوں میں اِدھر اُدھر اڑتی پھر رہی تھی۔ اس کے پر اتنے مہین تھے جیسے کسی نے مُوقلم سے دیوار پر روغن کیا ہو یا جیسے کوئی پلاسٹک سے بنا پرندہ ہو۔

دھلی گاڑیوں کا پانی بہہ کر کنارے کے دو ایک چھوٹے چھوٹے گڈھوں میں جمع ہو گیا تھا۔ وہاں ایک کوا پانی پی رہا تھا۔ ہوا چلنے سے اس کی گردن کے پروں میں بھنور سا پڑ جاتا تھا۔

کہیں سے بادلوں کی گرج کانوں میں پڑی۔ نیلوفر آسمان کی جانب دیکھ بھی نہ پائی تھی کہ پانی کا ایک موٹا سا قطرہ اس کے پاؤں پر گرا۔ اس کے چہرے پر حیرت بھری خوشی چھا گئی۔ اور لبوں پر ایک پر سکون سی مسکراہٹ آٹھہری۔ اس نے دونوں پاؤں پھیلا کر دوسرا پیر بھی بھیگنے کے لئے آگے کر دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ پل ایسی ہی بیت گئے۔ شاید بہت سے پل، کہ جب آنکھیں کھول کر وہ اپنی

نشست سے کھڑی ہوئی تو اس وقت تک پوری گلی جل تھل ہو چکی تھی۔ نیم کے پیڑ کے نیچے آنے والے راستے پر ہوا سے بکھری بے شمار پیلی پیلی نمکولیاں سرسوں کے پھولوں سی لگ رہی تھیں اور پلاس کے بڑے بڑے باوقار، حسین اور کئی روز سے الٹے لٹک رہے سرخ پھولوں کو اب موقع مل گیا تھا کہ وہ اپنی لمبی لمبی ڈنڈیوں سے ہمیشہ کے لئے قطع تعلق کر کے راستے پر بچھنے کے لئے آزاد ہو جائیں۔

نیلوفر نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ان لمحوں کے اندر کئی اور تبدیلیاں بھی ہو چکی تھیں۔

ہری ہری تبدیلیاں، کہ درختوں کا رنگ بھی بدل گیا تھا۔ نیم کے چمکیلے پتوں کی ہریالی دھل کر روشنی منعکس کرنے سے ہلکی ہری نظر آتی تھی۔ پیپل کا گہرایا ہوا سبزہ گھنی شاخوں کے درمیان پہنچتے پہنچتے سیاہی مائل ہرا ہو جاتا تھا۔ گولر کے پتے بھیگ کر نیل گوں ہرے نظر آنے لگے تھے اور گھاس کچھ مسکراتی ہوئی سی ہری، جو نیم کے پتوں سے کچھ گہری اور پیپل کے پتوں سے کچھ ہلکی ہری تھی۔

کنکریٹ کی گلی نما سرمئی سڑک پر پانی کی بے شمار لکیروں کے عقب سے تارکول میں پھنس کر راستے کا حصہ بن چکے رنگ برنگے کنکر دھل دھل کر شفاف ہو گئے تھے۔ نہائی ہوئی گاڑیاں ایک دوسرے کے پیچھے کھڑی سکون سے بھیگ رہی تھیں۔ اور یہ نظارہ اس وقت تک ویسے ہی حسین رہنے والا تھا جس وقت تک بارش یوں ہی یکسوئی سے برستی رہنے والی تھی اور کوئی منظر کو بدلنے کے لئے راستے سے گزرنے والا نہ تھا۔

کوّا (غالباً بہت سا پانی پینے اور باقاعدہ بھیگنے کے لئے) کہیں اڑ چکا تھا۔

نیلوفر کی نگاہیں دوبارہ درختوں میں بھٹکنے لگیں تو مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھیل گئی۔ ہرے سبز پتوں میں گھنی سیاہ داڑھی سے لگے سرخ صحت مند لبوں کے ساتھ موتی سی قطار ایسے دانت ہنس پڑے۔ سیاہ سیاہ پتلیاں جو اکثر سنجیدگی کے زیرِ اثر نظر آتیں چمک چمک کر مسکرا اٹھیں۔ نیلوفر کے لبوں پر مسکراہٹ واضح ہو گئی لیکن پیشانی پر کچھ لکیریں بھی اُبھر آئیں۔

اتنی مشابہت؟ وہی پشت پر ہلکی سی گولائی لئے چوڑے شانے۔ ویسا ہی صاف رنگ لیکن کھیل کود میں دلچسپی کے باعث نکھرا اور سرخی مائل۔ مگر ناک پر یہ غصہ۔ مرضی کے خلاف کچھ ذرا ہو جائے تو آسمان سر پر اٹھائے۔ گلاس کے کانچ کی شفافیت میں دھندلا پن نظر آئے تو ملازم کے سر ہو جائے۔ اس کی عدم موجودگی میں کوئی اُس کا کمرہ صاف کرنے کی کوشش کر لے تو طوفان کھڑا کر دے۔

مگر دل ہیرے کی کنی سا صاف۔ کولونی کے بچوں کا دوست، کپتان، استاد، لیڈر اور جانے کیا کیا کچھ کہ جس سے وہ محبت بھی کریں اور جس کا ان پر رعب بھی ہو۔

مگر وہ۔۔ کیا وہ بھی نبیل کی طرح صاف دل تھا۔۔ گو کہ نبیل کی ہی طرح ہر معاملے میں اپنی سی کرنے والا۔

''نیلی! تم یہ حساب کتاب چھوڑو۔۔اور مجھ سے شادی کرلو۔۔''

جمیل نے ایک دن حساب پڑھنے آئی اپنے والد کے دوست کی بیٹی سے دفعتاً کہا تھا اور قلم پر ڈھکن لگا دیا تھا۔

''کیوں یہ نازک سا سر کھپا کھپا کر مزید کمزور کررہی ہو۔''

اس نے نیلی کا سر داہنے ہاتھ کی دو انگلیوں سے ہلایا اور بائیں سے حساب کی کھلی کتاب بند کردی۔

''کیا کہہ رہے ہیں سر۔۔میرا سر کمزور ہے یا آپ کا پڑھانے میں دل نہیں لگتا۔''

جمیل سے کوئی چار برس چھوٹی نیلی نے چہرے پر کوئی تأثر نہ آنے دیا۔

''میرا دل نہیں لگتا یا تمہارے دماغ میں حساب سماتا ہی نہیں۔۔یہ تو ہم جیسے 'رف اینڈ ٹف' لڑکوں کا کام ہے۔۔تم دھان پان سی لڑکی۔۔ہوم سائنس پڑھو۔لٹریچر پڑھو، موسیقی پڑھو، سائکولوجی پڑھ لو، اور شادی کے لئے ہاں کرنے کا فیصلہ کرلو۔۔ویسے بھی تم سے شادی کرے گا کون۔۔تم سودے سلف کا حساب، دھوبی یا دھوبن کا حساب، بچوں کی فیس وغیرہ کا حساب تک رکھ نہیں پاؤ گی۔۔ایسی صورت میں شوہر کا ریاضی داں ہونا نہایت ضروری ہو جاتا ہے اور یہ میرے سوا دوسرا کون ہوسکتا ہے۔''

جمیل نے اپنے بالوں میں ہاتھ پر دیا اور کمال سنجیدگی سے نیلی کی طرف دیکھنے لگا۔

''ایسے بھی میرا 'سی۔اے، یعنی' چارٹرڈ ایکاؤنٹنسی 'پورا ہونے ہی والا ہے۔اور ویسے بھی گھر والے میرے لئے لڑکی تلاش کرنے ہی والے ہیں۔اور میں ان سے تمہارے بارے میں کہنے ہی والا ہوں۔۔اور۔۔اور تم ہاں کرنے ہی والی ہو۔۔''

نیلی نے کچھ لمحے اس کی بات سمجھنے میں لگائے اور پھر ہنس پڑی۔

''آپ تو سر۔۔ایک تو میں اتنی ریسپیکٹ کرتی ہوں آپ کی اور آپ ہیں کہ گرُو اور شِشیہ کے رشتے پر دھبا لگانے پر تلے ہیں۔''

نیلی نے سنجیدہ شکل بنالی۔

''اور دوسرے آپ کا رنگ گورا ہے۔''

نیلی نے حساب کی کتاب کھول کر وہ ورق سامنے کیا جس سے کچھ دیر قبل کام ہو رہا تھا۔

''مطلب۔۔؟ رنگ گورا ہونا جرم ہے کیا۔۔تمہارا تو مجھ سے بھی زیادہ ہے۔۔''

جمیل نے کتاب دوبارہ بند کر کے ہاتھوں میں تھام لی۔

''اسی لئے تو میں نے سوچ رکھا ہے کہ کسی سانولے لڑکے سے نسبت آئے گی تو ہاں کروں گی۔ مجھے اپنا رنگ بالکل پسند نہیں۔''

''اشی لی یے تو۔''

جمیل نے سر ہلاتے ہوئے آواز باریک بنا کر نقل اتاری۔

''آج سے دعا کروں گا کہ تم کو ایسا شوہر ملے کہ پتہ ہی نہ کر پاؤ چہرہ کہاں ختم ہوا اور بال کب شروع ہوئے۔ وہ تمہاری طرف دیکھ رہا ہو اور تم سمجھو پیٹھ موڑ کر بیٹھا ہے۔۔کافرِ نعمت۔۔ناشکری لڑکی۔۔محسن کُش۔۔میں تو تمہارے بھلے کی کہہ رہا تھا۔۔اور۔۔تم ہو کہ۔۔ابھی بھی وقت ہے۔۔پھر نہ کہنا آخری بار نہیں پوچھا۔۔''

جمیل اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ انگلی رخسار پر دھرے گویا کچھ سوچ رہی ہو۔ کچھ لمحے خاموشی سے گذر گئے۔

''اب کچھ کہو بھی نیلی۔۔''

جمیل کی آواز میں ہلکی سی سنجیدگی گھل گئی۔ نیلی نے سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

نیلی نے اسے جو کہا تھا سچ کہا تھا۔ خوش مزاج ہونے کے باوجود جمیل کے گورے رنگ اور کچھ بھاری جُثے نے اسے اس انداز سے اپنی طرف متوجہ نہیں کیا تھا کہ نیلی کو اس کے ساتھ زندگی گزارنے کا خیال آتا۔ مگر ایک انسان کے ناطے اس کی جمیل کے بارے میں اچھی رائے تھی۔ اس وقت اچانک جمیل کو سنجیدہ محسوس کر کے وہ کچھ سوچتی سی کافی دیر ایسے ہی اس کی جانب دیکھتی رہی۔ پھر سر جھٹک کر ایک نظر فرش کی طرف ڈالی اور فوراً اوپر دیکھا۔

''اور سر آپ کی اگر مونچھ ہوتی نا۔۔تو۔۔''

وہ کچھ لمحے خاموش رہی پھر بغیر مسکرائے دبی دبی شوخی سے بولی۔

''تو۔۔؟ تمہاری خاطر بھی نہ منڈواتا۔۔''

جمیل نے آواز اونچی کر کے گویا سنجیدگی سے کہا۔ نیلی کو ہنسی آ گئی۔

''نہیں وہ بات نہیں۔۔اُس صورت میں۔۔میں۔۔شاید کچھ سوچ سکتی تھی۔''

''بس۔۔؟ رکھ لی مونچھ۔۔داڑھی بھی رکھنا ہو گی آقا؟''

اس نے ہاتھ باندھ کر سر جھکایا۔

''نہیں۔ ہوسکتا ہے آپ پر اچھی نہ لگے۔۔اور۔۔میرا ارادہ پھر بدل۔۔''

''نہیں کوئی ارادہ وِرادہ نہیں۔ میں جا رہا ہوں ڈرائنگ روم میں۔۔تمہارے 'ڈیڈ' سے رشتہ مانگنے۔ وہ وہیں بیٹھے ہیں اس وقت پاپا کے انتظار میں۔۔تم۔۔تم مذاق سمجھتی ہو؟''

وہ اٹھا اور سچ مچ ہی ڈرائنگ روم میں جا گھسا اور نیلی دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

زندہ دل حسین نیلی بڑی دلنواز اور ناز بردار بیوی ثابت ہوئی۔ مگر جمیل اچھا شوہر نہ بن سکا۔ شادی کے سال بھر بعد ہی دوسرے شہر سے آئی اپنی چچازاد کے ساتھ تقریباً ہر شام گزارنے لگا۔ سنگھار میز پر نہایت مشک بیز خوشبوئیں اور عمدہ شیولوشنز جمع ہونے لگے۔ غسل خانے سے پہروں گنگنانے کی آوازیں آنے لگیں۔

نیلی کے ساتھ اس کا دوستانا سا سلوک خاموش سے رشتے میں بدل گیا۔ ویسے عام طور پر اس کے شب و روز میں کوئی خاص تبدیلی بھی رونما نہیں ہوئی۔ بس وہ ذرا خود میں گم معلوم ہوتا۔

نیلی نے یہ تبدیلی شدت سے محسوس کی تھی۔

جب وہ کبھی کبھی بلا سبب مسکرایا کرتا تو نیلی مسکرانا بھول سا جاتی تھی۔

وہ بچے کو باپ سے جدا نہیں کرنا چاہتی تھی، اس نے گھر نہیں توڑا۔ وہ اداس رہی۔ اس نے موسیقی نہیں سنی۔ اس نے نئے ملبوسات نہیں خریدے۔ اسے بے خبر نیند نہیں آئی۔

وہ اپنے چھوٹے سے بیٹے سے بڑی بڑی باتیں کرنے لگی۔

''آپ کو پتہ ہے بیٹا۔۔ماماں کتنی اپ سیٹ رہتی ہیں۔''

وہ اس کے بال بنا رہی تھی۔

''ہاں پتہ ہے۔''

ہاں کہتے وقت اس نے سر کو بالکل خم نہ کیا مبادا ماما کو دوبارہ مانگ نکالنی پڑے۔

''کیوں ہیں ہم اپ سیٹ۔۔''

وہ اس کی ٹھوڑی تھام کر کانوں کے پاس نرمی سے کنگھا کرنے لگی۔

''اس لئے کہ پاپا کا اپنی کزن سے افئیر چل رہا ہے۔۔''

وہ سامنے کے تازہ تازہ گرے دو دانتوں کے خالی مقام سے 'افئیر' کی 'ف' پر زور لگا کر

بولا۔ نیلی زمین پر اس کے قد کے برابر بیٹھی حیران سی دیکھتی رہ گئی۔

''اسی لئے نا۔۔''

اس نے بغیر کسی تجسس کے کہا۔ گویا اطلاعاً کہا جارہا ہے۔ نیلی نے اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور کچھ لمحے اسے دیکھتی رہی۔ پھر اسے گود میں اٹھالیا اور ٹہلنے لگی۔ وہ اس کی گردن میں باہیں پروئے، کمر کو ٹانگوں سے جکڑے قدموں کی رفتار کے ساتھ کمرے میں بدلتی چیزوں کو دیکھا کیا۔

اپنی ہنسلی کے ہلکے سے گڈے میں ننھی سی ٹھوڑی کا میٹھا سا دباؤ محسوس کرتی نیلی اس کے پھول سے جسم کا بوجھ سنبھالے، کہ وہ نسبتاً کمزور بچہ واقع ہوا تھا، خود اعتمادی سے کسی کام میں لگ جاتی۔ گویا ایک ہمراز پاکر دل کو قدرے بہتر محسوس کرتی ہوئی۔

مگر ہم راز صاحب بڑے موڈی واقع ہوئے تھے۔ کبھی کبھی وہ اپنے ننھے ننھے معاملوں میں الجھے ماما کے اندر کی بے قرار ہرنی کو گھاس تک نہ ڈالتے اور نیلی ایسے میں پیلی پڑ جاتی۔ خود ان کے بھی کچھ عجب مسئلے ہوا کرتے جو عمر کے ساتھ بدلا کرتے۔ اور عمر تھی کہ تیزی سے بڑھتی جارہی تھی۔

''ماماں۔۔ میں یہاں ہوں نا آپ کے پاس۔۔''

سکول کی کتاب سے سر اٹھایا گیا۔

''جی ہاں۔۔ اور کیا میری جان۔۔''

''بس میں صرف یہاں ہی ہوں یا۔۔ اور بھی کہیں ہوں۔۔''

وہ پنسل والے ہاتھ کی بند انگلیوں سے، ماتھے پر آرہے بالوں کو سر کی جانب سنوارتے ہوئے نہایت چمکیلی سیاہ پتلیوں والی گہری گہری آنکھوں سے پل بھر کے لئے نیلی کو دیکھ کر پوچھا کئے۔

''یعنی۔۔ اور کہیں؟۔۔ اور کہاں؟''

ممتا کی تشویش بھری صدا ابھری۔

''کہیں بھی۔۔ سکائی پر۔۔ کوس موس میں۔۔ اوزون کے پاس۔۔ سپیس میں۔۔ ٹائم کے بعد۔۔ یا۔۔ ٹائم سے پہلے۔۔''

سوال عام سے انداز میں کیا گیا اور سر پھر کتاب پر جھک گیا۔

نیلی کرسی سے نیچے کو آویزاں، نکر میں چھپی پتلی پتلی مگر کچھ لمبی ہو چکی ٹانگوں کی مسکین پنڈلیوں کو دیکھتی حیرت کے سمندر میں غوطے کھاتی رہی۔

یہ چھوٹی سی عمر اور یہ بڑوں سے بھی کچھ اُدھر کے سوال۔

یہ رائی سا جسم اور یہ پہاڑ سی باتیں۔

وہ سر جھکا کر پھر ہوم ورک کرنے میں مشغول ہو گیا۔ اور نیلی اسے دیکھتی ہوئی سوچوں میں غرق سی ہو گئی۔

اس ضرورت سے زیادہ حساس اور معصوم ذہن کو والدین کے مابین تناؤ سے بچانا ہوگا۔ آگے چل کر وہ عدم تحفظ کا شکار ہو گیا تو۔؟

اُسے تو ماں اور باپ دونوں ہی مکمل چاہئیں۔ ورنہ۔ یہ جواب کھوجنے والا دل جواب نہ پا کر پریشان ہو جائے گا۔

نیلی کتاب پر جھکے چہرے کو دیکھتی رہی۔

چھوٹا سا دانشور۔ پڑھتا کچھ اور، سوچتا کچھ اور ہے۔

سارا فساد ہی لا جواب سوالوں کا ہے۔

خود نیلی بھی بچپن میں عجب سوال کرنے پر خاندان بھر کے بچوں میں مذاق کا نشانہ بنا کرتی۔ ایسے ہی اس کے سوالوں کا بھی کسی کے پاس کوئی جواب نہ ہوا کرتا۔

'بابا جب دنیا نہیں تھی تو۔۔تو کیا تھا۔۔'

'کیا تھا۔ کچھ نہیں تھا'

فورسز آفیسر صاحب فورس فلی جواب دیتے۔

'اور۔۔ کچھ نہیں سے پہلے کیا تھا۔۔؟'

بابا صرف ایک نظر اسے دیکھتے اور دوبارہ اپنے کسی کام میں مصروف ہو جاتے، مثلاً اخبار پڑھنا یا فون پر بات کرنا یا کچھ ویسا ہی۔

'بابا۔۔ جب دنیا ختم ہو جائے گی۔۔ تو کیا رہے گا؟'

بابا بڑی خود اعتمادی سے اپنے چہرے پر ایسے تأثرات طاری کر دیتے جیسے اس وقت کیا کرتے جب نیلی نے الٹے جوتے پہن رکھے ہوں۔

'بابا۔۔ جہاں ساری کائنات کا آخری کنارہ ہے۔۔ اس کے بعد کیا ہے؟'

وہ ذہن و دل کے اندر خوفناک سی اتھل پتھل مچاتے سوالات کے زیرِ اثر خود کلامی کے انداز میں کہتی گویا اسے معلوم ہوتا کہ بابا کے پاس اس کے سوالوں کا جواب نہیں ہے۔ اور خود ہی سوال آگے بڑھاتی۔

'کچھ نہ کچھ تو ہوتا ہی ہے نا۔۔تو پھر۔۔'

پھر سوال جوں کے توں رہ گئے۔اپنی حیرت انگیزیوں اور ڈراونے پن کے ساتھ۔جب تک کہ عمر نے کائناتی سوالات کی نوعیت بدل کر دنیاوی کر دی۔

وہ بیٹے کے عجیب سوالات کا اس کے والد سے ذکر کرتی۔اور والد صاحب نیلی کی طرف دیکھتے ہوئے جانے کس طرف دیکھتے۔نیلی سوچتی کہ برسوں سے تارکول کے گرم گولے کی طرح سانسوں میں اٹکے اپنے غم کا مداوا بھی پوچھ لے۔مگر اس کے اندر بسی خوددار عورت نے اپنے تعلق سے سوال کرنا اپنے شایانِ شان کبھی نہ سمجھا۔سو، موم سی نیلی سلگتی پگھلتی رہی۔

عم زاد، ہم زاد کی صورت تین چار برس ساتھ رہے، یعنی جب تک وہ شہر میں رہی۔خدا خدا کر کے کہیں سے پیغام آیا اور وہ گئی۔مگر نیلی کی زندگی کے کچھ اہم سال ساتھ لے کر۔

جب کہیں جا کر مستقل اندیشوں کی تباہی کے تصوّر کی قید سے نیلی کا وجود رفتہ رفتہ آزاد ہونے لگا۔

نبیل بھی بڑا ہو گیا تھا۔

''ماماں۔۔جو ہوتا ہے۔۔، وہ تو ہو گا ہی، ہمارے سمجھے یا نہ سمجھے بغیر بھی۔۔مگر جو ہم کر سکتے ہیں۔۔وہ ہمیں کرنا چاہیئے۔۔گمشدہ سوالوں کے جواب کھوجنے سے بہتر ہے کہ۔۔جو سامنے ہے اس کی فکر کی جائے۔۔''

زندگی کو ذمہ داری اور دیانتداری سے گزارنے کے طریقوں پر باتیں کرتا وہ نیلی کو بہت سمجھدار معلوم ہوتا۔

باقاعدگی سے کثرت کر کے اس نے اپنے کمزور جسم کو چست اور مضبوط بنا دیا تھا۔کھیل کود کا رَسیا تھا۔اس کے دوستوں میں کھلاڑی ہی ہوا کرتے۔وہ بھی بغیر عمر کے کسی تصوّر کے۔بس کھیل میں دلچسپی شرط تھی۔وہ صرف ایسے ہی موضوعات پر خوشی سے بات کرتا۔

''سٹیڈیم۔۔پلے گراونڈ نا۔۔ماماں۔۔زندگی کا میدان ہے میرے خیال سے۔۔جسم کو جینے کا طریقہ سکھانے والا۔۔کھلے آسماں کے نیچے کھیلتے ہوئے لوگ۔۔صحت کی عزت کرتے ہوئے لوگ کس قدر خوش ہوتے ہیں۔۔یہ جسم جو ہماری روح کو ملا ہے، نیچر کا گفٹ ہے۔۔ایک بار ملتی ہے یہ زندگی انسان کو۔۔اسے اپنی زندگی سے محبت کرنی چاہیئے۔۔اَن ہیلدی آدمی کو آپ کبھی خوش نہیں دیکھیں گی۔

جسم کے ساتھ اس کا ذہن بھی بیمار ہوتا ہے۔ دوسروں کو وہ کبھی خوش دیکھ سکتا ہے نہ خوشی دے سکتا ہے۔ بیمار رہ کر اپنا مائنڈ اور بوڈی ہم برباد کر دیں، یا تندرست رہ کر اس جسم سے ہر خوشی حاصل کر لیں، وہ ہم پر ڈیپینڈ کرتا ہے۔۔''

ایک صبح کھیل سے جلد لوٹ کر وہ برآمدے میں لگی کرسی پر بیٹھ کر ماں سے باتیں کرنے لگا۔

'خوشی اصل میں اچھی صحت ہی ہے۔ یہ چائے کب چھوڑیں گی آپ ماماں۔۔ یہ بھی ایک طرح کی سلو پوائزننگ ہے۔۔ یو کین ڈائی اِف یو ہیو اے فیو ہنڈریڈ کپس ایٹ اے سٹریچ یو نو۔۔ اور ڈیڈ نے تو گولف کلب جانا چھوڑ ہی دیا۔۔''

''میں نے کم کر دی ہے چائے بیٹا جب سے آپ نے کہا ہے۔۔ جلد چھوڑ دوں گی۔۔ اور سیر بھی تو کر رہی ہوں نا روز صبح۔۔ آپ کے بیدار ہونے سے پہلے۔۔''

''تو سچ بتائیے کیا آپ خود کو ایکٹو محسوس نہیں کرتیں۔۔ خوش رہتی ہیں نا پہلے کی نسبت۔۔''

''آف کورس بیٹا۔۔ چاق و چوبند محسوس کرتی ہوں خود کو۔ لگتا ہے جیسے زندگی میں کچھ اہم کرنے کو حاصل ہو گیا ہو۔۔ جو پہلے نہیں تھا۔۔ انتظار رہتا ہے صبح کی سیر کے وقت کا۔۔ دن بھر کے کام میں میری دلچسپی بڑھ گئی ہے۔۔ بھرپور زندگی جینے کا احساس ہونے لگا ہے مجھے۔۔ اینڈ دِس کریڈٹ گوز ٹو یو مائی چائلڈ۔۔''

''یس۔ مائی۔ مام۔۔''

اُس نے مسکرا کر تین بار سر اثبات میں ہلایا اور کرسی پر بیٹھے پہلو بدلا پھر باہر کی جانب دیکھنے لگا۔

طویل قامت دھوبن سر پر استری کرنے والے کپڑوں کی گٹھری سنبھالے، پانچ چھے سالہ بچی کو انگلی تھمائے گلی کے دوسرے موڑ پر ایستادہ پیپل کے درخت کی جانب قدم بڑھا رہی تھی۔ جہاں اس نے ادھر ادھر سے اینٹیں گارا جمع کر کے ایک چھوٹا سا چبوترا بنا لیا تھا۔ آگے آگے اس کا سات سال کا بیٹا اپنے دونوں ہاتھوں میں باری باری وزنی آہنی استری اٹھاتا چل رہا تھا۔

''یہ رگھو بہت پیتا ہے۔۔ کملی کام کرتی ہے اور یہ۔۔ بلڈی ایلکو ہولک۔۔''

اس نے ناگواری سے کہا۔

''مر جائے گا ایک دن جلد ہی۔''

اس کی غصیلی آواز میں دکھ شامل ہو گیا۔

''نہیں بیٹا خدا نہ کرے۔۔ بیچاری کملی کا کیا ہوگا۔۔ دو بچے اکیلی کیسے پالے۔۔''

''ابھی بھی پال رہی ہے اکیلی۔۔اس کو بھی پال رہی ہے۔۔اور یہ کھانے کی بجائے پینے میں لگا ہے۔۔کتنی کوشش کی تھی اس کو ہسپتال لے جانے کی ہم سب نے۔۔وہاں اس کی یہ عادت چھڑوا دی گئی ہوتی۔۔مگر۔۔''

اس کا لہجہ درشت سا ہو گیا۔

''اب جو بھی لت ہے پاگل کو۔۔مگر بچوں کا باپ تو ہے نا۔۔''

''ہاں وہ ان کا باپ ہے۔بس۔۔بٹ ہی از ڈائینگ۔۔آئی کین سی دیٹ۔۔''

اور اگلے دن ہی رگھو کو خون کی قے ہوئی اور شام تک چٹ پٹ ہو گیا۔

نیلوفر نے سنا تو دھک سے رہ گئی۔دو تین سال پہلے تک بھلا چنگا تھا۔کملی پریشان رہتی تھی کہ پینے لگ گیا ہے۔پھر کہتی کہ روز پیتا ہے۔پھر یہ کہتی کہ اب دن میں بھی اسے دارو چاہیئے۔اس کی لت اور ضد سے عاجز کملی اسے خود بھی منگوا دیتی کبھی جب کولونی کے کسی گھر کا کوئی ملازم بازار جا رہا ہو۔رگھو نے کام کرنا نہ کے برابر کر دیا تھا۔بس کسی دن کچھ کپڑے جیسے تیسے استری کر دیتا کہ ان پیسوں سے شراب کا ایک پیکٹ خرید سکے،پی کر پڑ رہتا وہیں پیپل کے درخت کے نیچے۔جب تک کملی دوسرا پیکٹ خریدنے کے برابر اسے پیسے دے نہ دیتی۔بہت سی دیر ایک ہی انداز میں بیٹھا رہتا۔کبھی نیم دراز،کبھی گھٹنے پیٹ سے لگائے پیڑ کے تنے سے ٹکا ہوا۔منہ اٹھائے کسی جانب دیکھتا ہوا۔بچوں کی طرف۔استری کر رہی بیوی کو یا راستے کی اور۔اس کی ناک لمبی تھی،آنکھیں چھوٹی اور دہانہ چوڑا تھا جس میں سے،کبھی جب وہ کام سے پہلے پیسے مانگتے وقت خوشامدانہ ہنسی ہنستا تو پورے بتیس دانت نظر آتے۔دبلی ہو چکی گردن پر آگے کو اٹھا ہوا سر ایسا لگتا جیسے کسی دیسی نسل کا تربیت یافتہ مگر بے ضرر کتا مستعدی سے چوکیداری کر رہا ہو یا مالک کے حکم کا منتظر ہو۔

چھوٹے بچوں اور جوان بیوی کا پہرے دار اب نہیں رہا تھا۔نیلوفر نے ایک لمبی سانس لی۔

نبیل کھیل سے اسی وقت لوٹ رہا تھا کہ کملی کے چبوترے پر کوئی دوسرا آدمی کپڑوں پر استری کرتا نظر آیا۔نبیل نے گاڑی روک کر پوچھا تو رگھو کے بارے میں پتہ چلا۔

''اس آدمی کو بہت پہلے گولی مار دینا چاہیئے تھی۔۔''

اس نے سر جھٹک کر کہا۔

''نہیں بیٹا ایسا نہیں کہتے۔''

کیوں نہیں کہتے مام۔۔نیگیٹو اثر پڑتا ہے ایسے لوگوں کو دیکھ کر بھولے انسانوں پر۔۔انہیں قدرت نے تھوڑی کوئی بیماری دی ہے۔۔نشے سے خود کو خود بیمار کر دیتے ہیں ایسے احمق لوگ۔۔سرکار کو ایک ایسی ہی پالیسی بنانا چاہیئے۔۔کہ صرف سانس لینے کی خاطر سانس لیتے ہوئے یہ کیڑے مکوڑے، یا تو اپنے سُدھار میں کوآپریٹ کریں ورنہ۔۔ورنہ ان کو کسی دور دراز جزیرے پر جبراً زیرِ علاج رکھا جائے۔جہاں یہ اپنے عزیزوں کی صورت تک نہ دیکھیں جو ان کی شراب نوشی کی وجہ سے تکلیف اٹھاتے ہیں۔"

اس نے ناگواری سے کہا۔

"سچ نہیں ہے کیا۔۔آپ بتائیں۔۔ایک انسان دوسرے کو انفلنس کر سکتا ہے نا۔۔نیگیٹو ہو یا پوزیٹیو۔۔اثر تو پڑتا ہے نا۔۔میرے دوست یہ بچے۔۔جو میرے ساتھ کھیلتے ہیں بڑے ہو کر بلکہ اس وقت بھی اور لوگوں کو ہیلدی طریقے سے جینا سکھائیں گے۔۔انہیں دیکھ کر سیکھیں گے لوگ۔ہر ایک کی لائف پریشیس ہے۔اسے ضائع کرنا کون افورڈ کر سکتا ہے۔خود صحت مند زندگی گزارنا اور دوسروں کو انسپائر کرنا کیا سب سے بڑا کنٹریبیوشن نہیں لائف کی طرف۔۔اب کملی کے یہ بچے۔۔یہ کچھ کچھ ہوش مند بچے باپ کو یاد کر کے رویا کریں گے۔۔"

وہ اداس ہو گیا۔اور ایک گہری سانس لے کر دوبارہ پہلو بدلنے لگا تو کراہ اٹھا۔

ماں قانون پڑھ رہے بیٹے کو، زندگی موت کے بارے میں اس طرح باتیں کرتے غور سے سن رہی تھی کہ اس کی تکلیف سے سٹپٹا سی گئی۔

"کیا ہوا۔۔؟"

وہ جلدی سے بولی۔

"میرے پاؤں میں آج پھر موچ آ گئی ماماں۔۔"

اس نے ماں کے چہرے پر ابھر آئے پریشانی کے تاثرات دیکھ کر فوراً کہا۔اور کرسی کا سہارا لے کر بمشکل کھڑا ہوا۔

"بڑی مشکل سے ڈرائیو کیا۔۔سب نے جیبوں سے رومال نکال کر باندھ دیے۔۔"

وہ مسکرایا اور سوجا ہوا پاؤں ماں کے سامنے کر دیا۔

"یہ دیکھئے۔"

اس نے کہا۔پھر ایک آدھ بار زور سے کراہ کر گھر کے اندر کی طرف مڑا۔ماں باہیں سیدھی کر کے سہارا دینے کی خاطر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''میں بڑا ہو گیا ہوں مام۔۔آپ کیسے سنبھالیں گی۔الٹا دونوں گر جائیں گے۔۔ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں۔''

اس نے گردن موڑ کر کہا اور زور کا قہقہہ لگایا۔

''ہا۔۔ماما۔''

دوسرا پاؤں فرش پر رکھتے ہی وہ اونچی آواز میں چلّایا اور پھر ہنسا۔اس کے بعد دیوار کے سہارے اندر کی جانب چلا گیا۔اس کے عقب میں نیلوفر بھی اس پر نظریں ٹکائے آہستہ آہستہ اس کے کمرے تک جا کر اس وقت تک دروازے کے پاس کھڑی اسے دیکھتی رہی تھی جب تک آہستہ آہستہ وہ مسہری پر بیٹھ گیا اور ڈاکٹر سے فون پر بات کرنے لگا تھا۔

بیگم نیلوفر خان برآمدے میں بیٹھی سوچوں میں ڈوب گئی تھی۔

نبیل بالکل جمیل جیسا نظر آنے لگا تھا۔

اپنے باپ جمیل احمد خاں جیسا۔

مگر اب جمیل احمد خاں ویسے نہیں رہے تھے۔پہلے جیسے زندہ دل۔اب وہ لباس بھی کچھ سادہ پہننے لگے تھے ادھر دو چار سال سے۔

بدن کچھ اور بھاری ہو گیا تھا۔بال چھدرے ہو گئے تھے۔۔اب نیلی کے خریدے کپڑے پہن کر مطمئن نظر آتے۔ہوش ربا خوشبوؤں اور شیو کے بعد لگانے والے لوشنوں کی وہ اچھی خاصی تعداد جو خوابگاہ کی سنگھار میز یا غسل خانے میں نصب بڑے بڑے آئینوں کے ساتھ لگے طاقچوں پر سجا کرتی، رفتہ رفتہ غائب ہو چکی تھی۔لباس کے ساتھ میچ کرنے والے یا بسیار سوچ کے بعد خوبصورت تضاد پیدا کرنے والے جوتے، کمر بند، ٹائیاں اور اُوپری جیب کے رومال، قیمتی گھڑیاں، چشمے کے فریم اور مختلف شکل اور ساخت کے بیش قیمت قلم اب اپنی اہمیت کافی حد تک کھو چکے تھے۔شام ڈھلے سیدھے گھر آ جانا اور ہر بات حکم کی طرح مان لینا بھی معمولات میں شامل ہو گیا تھا۔

جیسے کوئی شخص جانے پہچانے راستے پر کتاب پڑھتا ہوا چلتا ہو۔

یا جیسے اپنی غلطی کی تلافی کر رہے ہوں۔گویا اب جمیل احمد خاں کے لئے چیزوں کا ہو جانا ہی زندگی ہو، اور چیزوں کے ہو چکنے پر ہی زندگی منحصر ہو اور اگر نہ ہو چکنے پر نہ بھی منحصر ہو تو کوئی فرق نہ پڑتا ہو۔

بے رنگ سے جمیل احمد خاں کچھ ایسے لگنے لگے تھے جیسے کوئی قیمتی لباس دھونے کے بعد اپنی

چہک کھودے۔

نیلوفر نے نظریں اوپر کی جانب ڈالیں۔ مہین ہرے پروں والی چڑیا ڈال ڈال گھوم رہی تھی۔ درخت کی سب سے بلند شاخ کے سرے پر جانے کس طرح اپنا توازن برقرار رکھے بیٹھی ایک بلبل چہک چہک کر اپنے اطراف دیکھ رہی تھی یا اطراف دیکھ دیکھ کر چہک رہی تھی۔

کیسے لگ رہے تھے جمیل احمد خاں دو روز پہلے جب نیلوفر اچانک غسل خانے میں شیمپو رکھنے گئی تھی۔ انہیں غسل خانہ اندر سے بند کرنے کی کبھی عادت نہ تھی۔۔ شاور سے پانی کی پھواریں جاری تھیں اور وہ زمین پر بیٹھے بال رگڑ رہے تھے۔ گول ہونے کی بجائے تکونے ہو چکے ان کے مظلوم سے کولھے زمین سے خاصے اوپر اٹھے ہوئے تھے کہ پیٹ ان کے اور ان کی اُکڑوں بیٹھی ٹانگوں کے درمیان نبیل کی زرد رنگ گیند کی صورت تنا، فاصلہ کئے ہوئے تھا۔ مگر جسم پر بال کم ہو جانے کے سبب پیٹ پر گیند کی طرح کی کوئی کالی لکیر واضح نہیں تھی۔ بھیگے بالوں نے خشک سر کے تمام اسرار طشت از بام کر دئے تھے اور سر کی پیلاہٹ مائل سفید جلد یہاں وہاں سے جھانک رہی تھی۔ موڑے ہوئے موٹے گول گھٹنوں سے لگی پنڈلیاں ٹخنے تک آتی ہوئی ہو بہو مرغِ مسلم کی ٹانگ کی طرح نظر آ رہی تھیں۔

نیلوفر نے پھواروں سے بچتے ہوئے عجلت سے شیشی، کانچ لگے تین طاقوں والی منقش چوبی الماری کے اوپری طاقچے پر رکھی اور اندر کا منظر ساتھ لئے باہر آ گئی۔

اس نے ایسی صورت بنائی جیسے بغیر شکر ملائے لیمو والی چائے کا گھونٹ بھر لیا ہو۔

جمیل احمد اس دن بھی حسبِ معمول نہیں گنگنائے تھے اور جلدی سے نہائے تھے۔

کیا جمیل ناخوش ہیں، اس لئے اب گنگناتے نہیں؟

کیا جمیل 'ان ہیلدی' ہیں اس لئے ناخوش ہیں۔؟

یا ناخوش ہیں اس لئے صحت کی طرف سے لاپرواہ ہیں؟

بیمار رہ کر اپنا 'مائنڈ' اور 'بوڈی' برباد کر رہے ہیں؟

انہیں 'انسپائر' کرنا زندگی کی طرف سب سے بڑا 'کونٹریبیوشن' ہوگا؟

نیلوفر درختوں میں دیکھتی ہوئی نبیل کی کہی باتیں سُنا کی۔

مگر جمیل احمد خاں تو کسی اور کے لئے خوش رہتے تھے۔

اُن دنوں بلا ناغہ گولف کھیلا کرتے تھے۔ اور اب کبھی کبھی مہینوں اور اکثر ہفتوں ہو جاتے ہیں

انہیں، 'گولف کورس' کا رخ کیے۔

شادی کے پہلے سال نیلوفر بھی جاتی تھی جمیل کے ساتھ۔ جب نبیل امید بنا گولف کی، سفید، گڈّوں والی چھوٹی سی، سخت گیند سے بھی چھوٹا مگر بے حد نرم اس کے ساتھ گولف کلب کے ریستوراں کے منفرد سینڈوچ بانٹ کر کھایا کرتا تھا، نظر نہ آتے ہوئے بھی۔ اور وہ اپنے ساتھ اس کی موجودگی کے تصوّر سے محظوظ، کہیں ایک الگ دنیا میں شاد رہا کرتی تھی۔ کلب کی خاص دارجلنگ چائے کے خوشبو سے حساس تیکھی ناک کے اوپر پُرسکون آنکھوں سے درختوں کی شاخوں میں نظریں دوڑا دوڑا کر آخرِ کار پرندوں کو ڈھونڈ نکالتی۔ ان کی معصومیت کو پہروں نہارنا اس کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ وہاں ہی نیم کے درخت پر اس نے پہلی بار کوئل کو کُوکتے دیکھا تھا۔ نیم کی شاخوں کے نیم خمدار پتوں میں بنے بے شمار بھنور جب ہوا کے تیز جھونکوں سے یہاں وہاں کو جھکنے لگتے، جب جا کر کہیں پردہ نشین کوئل کی جھلک ملتی۔ وہ بلبل کی طرح درخت کی سب سے بلند شاخ پر بیٹھ کر علی الاعلان برہا کا گیت نہیں الاپتی۔ سیاہ پروں اور سفید سی منقار والی کوئلیا، جو منا سا گلا پھاڑ کر یوں چلاتی کہ اس کے کالے جسمانی پس منظر میں چونچ کے اندر کی گلابی دنیا، گرم چیز سے ہاتھ چھو جانے کے سبب اچانک رو اُٹھے افریقی بچے کے دہانے ایسی معلوم ہوتی۔

نیلوفر مسکرا دی تھی۔

جانے کیا تکلیف ہوتی ہوگی کوئل کو۔ شاید اسے سرد موسم پسند ہو۔۔ یا شاید اسے کوئی تکلیف نہ ہو اور وہ ہُوک کی طرح کُوکتی اصل میں چہکتی ہو۔۔ کسی کو پکارتی ہو۔۔ دور سے سنائی دیتی اس کی کُوک اچھی لگتی ہے۔ سیاہ ساری کے آنچل سے سر اوڑھنے والی دوشیزہ کی طرح لگنے والی بی کوئل۔ یا شاید آم کے موسم سے جڑی ہونے کی وجہ سے آم کے شوقین لوگوں کے لئے کسی خوش کن پیشگوئی سی معلوم ہوتی ہو۔

اُن دنوں جمیل احمد بیرون ملک سے لوٹتے وقت 'اڈیڈاس' کا نیا 'گولف کِٹ' لے آئے تھے۔ پہلے کا سرخ اور سبز خانوں والا نہایت عمدہ اور نرم ریگزین کا اور اس کے علاوہ 'لاویا' کا بیش قیمت کِٹ ہوتے ہوئے بھی۔ کیا ضرورت تھی بھلا اتنا مہنگا اضافی کٹ خریدنے کی، جب دو پہلے سے ہی موجود تھے۔ اب ایک نیچے لابی کے ایک کونے میں ملازموں کے جھاڑ پونچھ کا کام بڑھانے کے لئے کھڑا رہتا ہے اور دوسرے دو اوپر کتابوں کی الماریوں کے درمیان دیوار سے لگے ایسے ساتھ ساتھ کھڑے کئے گئے ہیں جیسے تازہ تازہ بالغ ہوئے دو ضرورت سے زیادہ صحت مند طلبا کو استاد نے کھڑا رہنے کی سزا دی ہو۔

مگراب انسانی حقوق کا زمانہ ہے، یہ تشبیہ کچھ مناسب نہیں۔

نیلوفر نے مسکرا کر سوچا پھر دوبارہ کچھ سنجیدہ ہوگئی۔

اور شام کو بتی جلانے سے پہلے اگر نیم تاریک کتب خانے میں نظر ڈالیں تو انسان دو دو گولف کٹ اچانک دیکھ کر کچھ پل کے لئے خوفزدہ ہونے سے خود کو روک نہیں پاتا کہ دو بڑے بڑے سروں والے جڑواں چور حملے کی تاک میں کھڑے معلوم ہوتے ہیں۔

نیچے کمرے میں گولف کے تین کلب نظر آیا کرتے ہیں۔ چھوٹے غلاف کے اندر کونے میں۔ اکثر ہی بے حس وحرکت پڑے۔

جمیل صحت کی طرف دھیان دیں گے تو نبیل کو خوشی ہوگی۔ اور وہ صحت کی طرف جب ہی دھیان دیں گے جب خوش ہوں گے۔

خوشی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔ مگر جمیل احمد نے اپنے لئے خوش ہونا سیکھا ہی کہاں تھا۔ خوش رہنے کے لئے انہیں کسی اور کا سہارا چاہیئے۔

نیلوفر کی نظریں درختوں سے ہوتی ہوئی آسماں کی جانب اٹھ گئیں۔

خدا۔۔خدا خوش رکھے۔۔انہیں۔۔

نیلوفر کے دل نے دعا دی تو وہ چونک کر مسکرا اٹھی۔ پھر کچھ پل بعد اس کی مسکراہٹ اداس ہوگئی۔

ان کو خوش رہنے کی دعا دینا خود غمگیں ہونے کی بددعا ہو جائے تو؟

کہ وہ کسی اور کی خاطر ہی خوش رہیں گے۔

یعنی کسی اور کے لئے گنگنائیں گے۔

کسی اور کے ساتھ کہیں جائیں گے۔

شام کو دیر سے آئیں گے۔!

تو۔۔؟

اچانک نیلوفر کو حلق کے بیچ تار کول کا گرم گرم گولا اٹکا محسوس ہوا۔

گھر۔۔دیر سے۔۔آئیں گے۔۔نبیل کی جانب سے لا پرواہ ہو جائیں گے۔۔

اور نبیل اپنی ماں کو اداس دیکھ کر۔۔

مگر نبیل اب بڑا ہو گیا ہے۔۔

گلے میں اٹکا گولا جیسے نرم پڑ گیا۔

اس نے غیر ارادی طور پر چائے کے مگ کو چھوا۔ حالانکہ اس میں کوئی چائے نہیں بچی تھی۔ وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

نبیل کھیلنے گیا ہے۔

نیلوفر کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

نبیل اپنی بچہ گاڑی پارک لے گیا ہے۔

لوٹنے والا ہوگا میرا بچہ۔۔ میری بچہ گاڑی۔

مسکراہٹ کچھ اور واضح ہوگئی۔

نیلوفر اندر کی طرف چل دی۔ مسکراتی ہوئی۔

کمرے میں آئی تو ٹھٹھک گئی۔

جمیل صاحب نے سنگھار میز کے آدھے سے کچھ ہی کم حصے پر خوشبوؤں کا خاصا سامان کر رکھا تھا۔ متصل غسل خانے سے ان کے گنگنانے کی آواز آ رہی تھی۔

تو۔۔ جمیل اب پھر۔۔ پھر کہیں مصروف ہو رہے ہیں۔۔ ہو گئے ہیں یا ہونے والے ہیں۔۔

اس خیال کے آتے ہی وہ اداس سی ہونے لگی تھی کہ پھر ایک خیال نے اسے اپنی طرف متوجہ کر دیا۔

یعنی جمیل۔۔ زندگی میں دلچسپی لینے والے ہیں۔

اور زندگی۔۔ ایک بار ملتی ہے۔

اور نبیل کہتا ہے کہ۔۔

اور نبیل سچ کہتا ہے۔۔

اس نے میز پر سے پان کے پتے کی ساخت کی گہرے نیلے رنگ کے کانچ کی ایک تازہ وارد شیشی ہاتھ میں لی اور ڈھکن کھول کر اسے اپنی ناک کے قریب لے گئی۔ خوشبو نہایت دلنواز تھی۔

'پیکو ربے بین' برینڈ کی 'مردوں کے لئے مخصوص پرفیوم'۔

'ارمانی' کا حال ہی میں ڈیزائن کیا گیا سیاہ چشمہ سنگار میز کی خوش رنگ قیمتی پتھروں سی چمکتی

ہوئی چیزوں کے درمیان کوہِ نور ہیرے کی مانند نمایاں تھا۔ اور پاس ہی 'بیل مین' کی نفیس گھڑی کا سرخ لوگو اپنی انفرادیت کا اعلان کر رہا تھا۔

قریب دو نئے 'کف لنکس' پڑے تھے اور ان کے پاس سیاہ رنگ کا 'موں بلاں' کا قلم رکھا تھا۔

یعنی کوٹ کی اوپر کی چھوٹی جیب سے جھانک کر چشمے کو مزید وقار عطا کرنے کے لئے، یا چشمے کے ساتھ نظر آ کر اپنا وقار بڑھانے کے لئے۔ اس نے آنکھیں میچ کر ایک بار پھر شیشی کو ناک سے چھوا اور آنکھیں کھول دیں۔ پھر چشمہ اٹھا کر آنکھوں پر لگا لیا۔ چشمہ آنکھوں کے باہری گوشوں سے ہوتا ہوا کان تک کا حصہ ڈھکتا تھا۔

نیلوفر کے دادا جان ایک تصویر میں ایسا ہی چشمہ پہنے ہیں۔ نئے ڈیزائن اصل میں پرانے ڈیزائن ہوتے ہیں۔

اس نے گویا اپنے آپ سے کہا اور چشمہ اتار کر خود کو آئینے میں دیکھا۔

اسے معلوم ہوا کہ وہ اداس نہیں ہے۔

خوشی خود سے وابستہ رکھنے کی چیز تھی، وہ کہاں اسے جمیل احمد میں کھوجتی رہی۔

چار دن کے لئے ملی زندگی کو داؤ پر ہی لگا دیا۔

عمرِ عزیز کا ایک طویل حصہ کسی اور کے لئے ضائع کر دیا جب کہ ہر ذی روح کی ایک جدا دنیا ہوتی ہے جسے وہ اپنی ہی مرضی سے چلانے کی کوشش کرتا ہے۔

اس نے جمیل احمد کے انتظار میں اداس رہنا پسند کیا۔ جمیل احمد نے کسی اور کے لئے خوش رہنے کو ترجیح دی۔

اب جمیل احمد پھر زندگی میں دلچسپی لینے لگے ہیں۔

انہیں اپنے طور پر خوش رہنے کا حق ہے۔

مگر کسی اور کی خاطر۔؟

چلئے۔۔ کسی بہانے سہی۔

ایک انسان۔۔

کوئی انسان زندگی سے محبت کرنے لگا ہے۔

نیلوفر کچھ لمحے چپ چاپ آئینے کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر دفعتاً پلٹ کر کمرے سے نکل آئی۔

◆❖◆

چمگادڑ

نور جہاں نے یہ منظر دیکھا تو اس کی چیخ نکل گئی اس نے جلدی سے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

گو کہ وہ کچھ دور تھی اور بہت صاف طرح دیکھ نہیں پا رہی تھی تاہم اسے یہ نظر آیا کہ ایک ادھیڑ عمر آدمی کسی گندمی سے رنگ کے چمڑے کا ہیرے جڑا لباس پہنے ایک اونچی لعل جڑی کرسی پر، ایک موتی جڑی میز کے سامنے بیٹھا جواہرات سے چنی ہوئی بڑی سی رکابی میں کچھ کھا رہا تھا۔ رکابی کے برابر کسی لمبے سے گلاس میں کوئی سرخ رنگ مشروب ہے۔ آدمی کے ہاتھ میں کانٹا اور چھری ہے۔ پھر آدمی نے چھری کانٹا تھالی میں رکھ دیا اور ہاتھ سے کھانے لگا۔ اس نے مشروب کا گھونٹ بھرا تو نور جہاں کو اندازہ ہوا کی وہ مشروب گاڑھا تھا۔ سرخ رنگ کا گاڑھا سیال۔

جب نور جہاں نے آدمی کی طرف بغور دیکھا تو اسے محسوس ہوا کہ آدمی کے ہاتھ میں ایک بے حد چھوٹا سا انسانی بازو تھا جس پر سے وہ دانتوں سے گوشت الگ کر رہا تھا۔ نور جہاں کی نظر جلدی سے اس کی تھالی پر گئی۔ تھالی میں ایک چھوٹا سے انسانی سر نظر آیا تو وہ تھر تھر کانپنے لگی۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے یہ کیا دیکھ رہی ہوں میں۔

وہم ہو گیا ہے مجھے۔ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی ہوں۔

اس نے سوچا اور پھر آدمی کی طرف دیکھنے لگی۔

سر سے جڑا ایک چھوٹا سا انسانی جسم بھی نظر آیا جس کے پاؤں پیٹ کی طرف خم تھے۔ پیٹ کا حصہ کھلا اور کالا سا لگ رہا تھا۔ جیسے جلا ہوا ہو۔ چھوٹی چھوٹی ٹانگیں بھی سیاہ جیسی نظر آ رہی تھیں۔ اور گول سر بھی اسی رنگ کا۔ مگر سر تو کالا ہی نظر آتا ہے بالوں کے سبب۔ دور سے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا وہ حصہ بالوں سے ڈھکا ہے یا جلا ہوا ہے۔ نور جہاں نے نظر اٹھا کر آدمی کی طرف دیکھا۔ وہ طویل قامت تھا اور اس کی آنکھیں نیلی تھیں۔ اس کے سر کے بال بھورے اور سفید تھے اور وہ اپنے کھانے میں مگن تھا۔

کیا معلوم دہایوں سے جاری ان یک طرفہ جنگوں میں مہلوکین کی لاشوں کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہوگا۔ کون جانے یہ لوگ کس کس طرح سے ان کا استعمال کرتے اور کرنا چاہتے ہونگے۔ ایسے لوگ صرف محاوروں میں ہی غیر انسانی جملہ استعمال نہیں کرتے بلکہ واقعتاً جنہیں یہ دشمن کہتے ہیں ان کا خون مشروب کی طرح پیتے ہیں۔ ان کے منہ سے انسانی خون لگ گیا ہے۔ اب یہ کہانیوں والے مردہ خوروں کی اصلی شکلیں ہیں۔ صرف ان کے دانت لمبے نہیں ہیں۔

اس نے جھرجھری لی۔ اور منہ پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

کسی غیر مرئی طاقت نے اسے پھر اُدھر کی اور مڑنے کو مجبور کیا تو اس نے دیکھا کہ آدمی کے بڑے سے دہانے کے قریب ننھی ننھی انگلیوں والا چھوٹا سا پنجہ ہے۔

نور جہاں کو اُبکائی سی آئی۔ اس نے آنکھیں زور سے بھینچ لیں۔

کچھ پل بعد جب اس نے آنکھیں کھولیں تو آدم خور آدمی کسی اور مخلوق میں تبدیل ہو گیا تھا۔ یہ مخلوق بیضوی شکل کی تھی اور اس کے سارے بدن میں سے لمبی لمبی انگلیوں والے بڑے بڑے ان گنت پنجے نکلے ہوئے تھے اور جہاں اس مخلوق کا سر ہو سکتا تھا وہاں ایک چوڑا سا بے شمار دانتوں والا دہانہ تھا۔ جو اوپر سے زپ کی طرح نظر آتا تھا۔ اس حصے میں دماغ کے لئے جگہ نہیں بنی تھی اور باقی جسم میں سینے اور دل وغیرہ کے مقام پر صرف ایک لمبا سا پیٹ تھا۔

نور جہاں کا دل دھک دھک کرتا جیسے اس کے حلق سے باہر آیا چاہتا تھا۔ اسے لگا کہ اس کی دھڑکن رک جائے گی۔ وہ زور سے چیخنا چاہتی تھی۔ مگر یہ جیسے اس کے بس میں نہ تھا۔ وہ چلّا کر رونا چاہتی تھی۔ مگر اس میں بھی وہ ناکام ہو گئی۔ اب اس کی دھڑکن بے قابو ہو گئی تھی۔

کسی طرح نور جہاں کا ہاتھ اپنے دل کے قریب چلا گیا۔

قریب بیٹھی نرس فوراً اس کے پاس آگئی اس نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔نور جہاں آنکھیں بند کئے لیٹی رہی۔نرس کو محسوس ہوا کی اس کی دھڑکن بے ترتیب چل رہی ہے۔اس نے داہنے ہاتھ سے لوہے کے پلنگ کے سرہانے لگا ایمرجینسی بٹن دبایا اور بائیں ہاتھ سے مریضہ کے گلے کی بائیں جانب ہنسلی سے ذرا نیچے پسلیوں پر مساج دینے لگی۔ڈاکٹر نے فوراً آکر آکسیجن کی نلی سے مریضہ کی ناک اور دہانہ ڈھک دیا۔

شام کے قریب جب نور جہاں کو ہوش آیا تو تو اس سے ملنے اس کا بیٹا اور شوہر دونوں آئے تھے۔

''آج ہم گھر لے جائیں گے آپ کو۔۔چاہے کچھ بھی ہو۔۔''

اس کے شوہر نے مسکرا کر اس کے ماتھے پر ہاتھ پھیرا۔

''سُونا ہو گیا بھئی گھر ہمارا۔''

انہوں نے آہ سی بھری۔

''جی امی۔۔آپ اچھی ہو جایئے نا جلدی سے۔۔''

بیٹا اداسی سے مسکرایا۔ماں نے نیم واسی آنکھوں سے اسے ایسے دیکھا جیسے کہنا چاہتی ہو کہ تم تو جانتے ہو اَب میں اچھی نہیں ہو سکتی۔بیٹے نے ماں کا ہاتھ پکڑا اور ہتھیلی پر اپنا رخسار رکھ دیا۔

''ہم ابھی آتے ہیں۔''

اس کے والد ڈاکٹر سے ملنے کے لئے باہر نکل گئے۔نور جہاں کو اپنے ہاتھ پر نمی کا احساس ہوا تو اس نے لمبی سانس لی۔

''مجھے معاف کر دیجئے امی۔خدا کے لئے اپنے آپ کو سنبھال لیجئے ورنہ میں خود کو معاف نہیں کر سکوں گا۔''

وہ رو پڑا۔

''یہ میرا ہی قصور ہے۔مجھے سمجھ لینا چاہیئے تھا کہ میری امی کتنی حساس ہیں۔دنیا کے بہترین انسانوں میں سے ایک ہیں۔۔میں نے کیوں۔۔کیوں۔۔''

اس نے اپنے گھنے گھنے بالوں والا سر ماں کے بازو پر رکھ دیا۔ماں نے بمشکل اس کی طرف دیکھا اور ہلکے سے نفی میں سر ہلایا۔ماں کی آنکھ کے گوشے پر آنسو کی ایک بوند ابھر آئی۔

''نہیں۔۔میرا قصور ہے امی۔مجھے خیال رکھنا چاہیئے تھا۔۔میں خود ہی۔۔''

اس کے والد ڈاکٹر کو لئے اندر داخل ہوئے۔

کچھ سمجھ میں آیا ڈاکٹر صاحب۔۔ ہو کیا گیا ہماری ہنستی مسکراتی بیگم کو۔۔''

''کوئی فکر کی بات نہیں۔۔ مگر ابھی ہمیں کچھ دن اور او بزرو کر لینے دیجئے۔۔ کوئی شاک لگا ہے۔۔ تھوڑے دن لگ سکتے ہیں اُس سے باہر آنے میں۔۔''

''نہیں ڈاکٹر اس دن تو کہیں گئیں نہیں۔۔ بہت خوش تھیں۔۔ ہمارا بیٹا باہر سے ہفتے بھر کے ٹوور سے آیا تھا۔۔ دیر تک اسی کے پاس تھیں۔۔ پھر آکر سو گئیں۔۔ اور صبح پھر آپ کو پتہ ہی ہے کہ بے ہوش تھیں۔۔''

عامر کو اپنے دفتر نے ایک سیمینار میں شرکت کیلئے جنوب مشرقی ایشیا کے ایک حصے میں بھیجا تھا۔ مختلف ممالک سے کئی لوگ آئے تھے۔ ایک عمدہ ہوٹل میں رہائش کا انتظام تھا۔ آخری دن جب آخری اجلاس جلد ختم ہوا تو وہ دو اور لڑکوں کے ساتھ قریب کے علاقے کا چکر لگانے کی غرض سے نکلا تھا۔ عامر کو یاد تھا کہ وہ گھومتے گھومتے کچھ چیزیں خریدتے ایک مقامی ریستوران میں کافی پینے کی غرض سے داخل ہوئے تھے۔ مگر وہاں سے وہ ایک مرض ساتھ لئے آ گیا جس کا اس کے پاس کوئی علاج ہی نہ تھا۔

اس نے سن رکھا تھا کہ لوگ زندہ بندر کا بھیجا کھاتے ہیں۔ مگر اس ریستوراں کے مینیو پر سب سے اوپر جو پکوان درج تھا، اسے پڑھ کر اس کا اور اس کے ساتھیوں کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ دوبارہ غور سے پڑھا تو چہرے خوف سے پیلے پڑ گئے۔

سب سے پہلی، سب سے مہنگی ڈش 'ہیومن فیٹس' تھی۔ انہوں نے خود کو قابو میں رکھ کر ٹوٹے الفاظ میں ویٹر سے تصدیق چاہی تو پتہ چلا کہ ڈش وہی تھی جو انہوں نے پڑھی تھی۔ بلکہ اس غیر انسانی بات پر یقین نہ کرتے ہوئے انہوں نے ہوٹل کے مینیجر سے دریافت کیا۔

اس نے الٹا انہی سے سوال کیا تھا کہ کیا ایسا کرنا پریکٹیکل بات نہیں ہے۔ کیا ایسا کرنا تکنیکی طور پر غلط ہے۔

اور وہ لوگ ادھ کھلے ہونٹ لئے اسے دیکھتے رہ گئے تھے۔

ان کا ایک ساتھی جو لا جواب حسِ مزاح رکھتا تھا، خود کو اور اُن کو یہ محسوس کرانے کی خاطر کہ وہ اسی دنیا میں ہیں اور زندہ ہیں اور کوئی ڈراونا خواب بھی نہیں دیکھ رہے، اپنی زبان میں بولا تھا کہ نکل چلو۔ یہ آدمی نظر آنے والا مشینی پرزہ، احمق سمجھ کر ہمارے کباب بنائے گا اور خوب پیسے کمائے گا۔ مگر اس کے ساتھیوں کے چہروں سے حیرت اور خوف کے تأثرات ہی گئے نہ وہ خود ہی اپنے کہے جملے سے اک

ذرا بھی محظوظ ہو سکا۔

پھر وہ لوگ ایک منٹ ضائع کئے بغیر ریستوران سے باہر نکل آئے۔ ایک نے الٹی کر دی۔ دوسرے کو ہوٹل پہنچنے تک چکر آتے رہے۔ تیسرا رو رہا تھا۔

فلائٹ اسی رات کی تھی۔ دوسرے دن عامر گھر پہنچا تو پتھر سا خاموش تھا۔ والدین نے لپٹایا تو ہلکے سے مسکرا دیا تھا مگر چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ گھر والوں نے سوچا کہ سفر میں رات دن کے تفرّق کے سبب Jet Lagged ہے اسی لئے چپ سا ہے۔ آرام چاہیئے اسے۔

وہ اپنے کمرے میں آیا تو اپنے ایک دو قریبی دوستوں کو فون پر یہ باتیں بتائیں۔ معلوم ہوا کہ ایک نے پہلے یہ بات سنی تھی مگر یقین نہیں کیا تھا۔ کچھ دیر بعد اس کے ایک دوست نے اسے کچھ انفارمیشن اور تصاویر میل کیں۔ جن میں کچھ پرانے قبیلوں کا ذکر تھا۔ جزائر پر صدیوں سے آباد قبائل کی تصاویر تھیں جن کی جدید دنیا تک رسائی نہیں تھی۔ مگر کچھ تصاویر ایسی بھی تھیں جو تہذیب یافتہ دنیا کے باشندوں کی ہو سکتی تھیں۔ گو کہ ساتھ ہی یہ تحریر تھا کہ یہ کسی مصدقہ ذریعے سے دستیاب نہیں ہوئیں تاہم تصاویر اصلی نظر آتی تھیں اور کسی بھی انسانی صفات رکھنے والی روح کے لئے کسی اذیت سے کم نہیں ہو سکتی تھیں۔

عامر پتھر کا بت بنا ماؤس گھماتا رہا۔ معلومات میں لکھا تھا کہ یہ لوگ وقت سے پہلے ضائع ہوئے یا ضائع کردئے گئے انسانی بچوں کو ضائع نہیں کرتے کہ وہ حیاتین سے پُر اور ذائقہ دار ہوتے ہیں۔ اس نے کچھ عرصہ پہلے جب یہ پڑھا تھا کہ ایبارٹڈ فیٹس، کاسمیٹک سرجری وغیرہ میں استعمال کئے جاتے ہیں تو اس کا دل بہت تیز، بہت دیر تک دھڑکتا رہا تھا۔

وہ عجیب طرح کی ذہنی تکلیف سے دوچار ہوا تھا۔
عجب بے چارگی اور محرومی کا احساس ہوا تھا اسے۔
گھن آئی تھی۔
غم ہوا تھا۔

اور بہت سے ہارے ہوئے جذبوں سے اس کا بے بس سا تعارف ہوا تھا جن کو سمجھنے کے لئے اس کا ذہن تیار نہیں تھا اور جن کو نام دینے کے لئے اس کے پاس الفاظ نہیں تھے۔

اس نے گھنٹوں خود کو ٹوٹا ٹوٹا سا محسوس کیا تھا اس روز۔

مگر اس وقت جو اس کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں اس نے اسے خود سے اور گردوپیش سے بے گانہ کر دیا تھا۔ وہ پسینے سے نہایا ہوا، سہا سہا کمپیوٹر سے لگا اس قدر محو تھا کہ اسے خبر ہی نہ ہو پائی کب اس کی والدہ کمرے میں داخل ہوئیں۔ کمپیوٹر دیوار سے لگا تھا اور اس کی پیٹھ دروازے کی جانب تھی۔ والدہ نے جو مانیٹر پر دیکھا وہ یکے بعد دیگرے دو تصاویر تھیں۔ ایک میں منگولیائی نقش ونگار کا ایک شخص کشتی میں کچھ لئے آرہا تھا۔ اس کے نیچے کی عبارت میں 'روسٹڈ ہیومن فیٹس' تحریر تھا۔ جسے وہ ایسے ہی دیکھ رہا تھا جیسے کوئی عام طور پر اپنے کھانے کی طرف دیکھتا ہو۔ اور دوسری تصویر بھی اسی آدمی کی تھی جو ایک معمولی سے رستوران میں اسی تھالی سے کھا رہا تھا اور ساتھ میں سنگترے کا جوس کا گلاس تھا۔ وہ چکرا کر گرنے والی تھی کہ بیٹے نے تھام لیا وہ خود بے حد گھبرایا ہوا تھا۔

''یہ سچی تصویریں نہیں ہیں امی۔۔''

اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا۔

''یہ۔۔یہ۔۔''

ماں بول نہیں پائی تھیں۔

''دیکھئے نا کیسے کیسے فوٹوگرافرس ہیں۔۔ کمپیوٹر نے تو جھوٹ سچ ایک سا کر دیا۔۔ ایسا لگتا ہے جیسے سچے فوٹوگریف ہوں۔۔''

وہ مسکرانے کے سے انداز میں بولتا گیا۔ ماں نے کسی صورت حواس یکجا کر کے اسے بغور دیکھا تو اس کے ممتا بھرے دل میں ایک اور خوف گھر کرنے لگا۔

عامر بہت چھوٹا تھا۔ کوئی تین برس کا۔ ایک روز رات کی خبروں کے بعد ٹیلیوژن پر فلم چلنے لگی تھی۔ فلم دلچسپ تھی۔ گھر میں سب دیکھنے لگے تھے۔ عامر بھی نیند سے گویا لڑلڑ کر فلم دیکھ رہا تھا۔ ماں نے سلانے کی کوشش کی تھی۔ مگر زیادہ نہیں کہ دوسرے دن اتوار کے سبب سکول بند تھے۔ وہ کہانی میں محو تھا اس کے بال ماتھے پر آجاتے تو انہیں ہاتھوں سے ایک طرف ہٹاتے وہ نیند بھری آنکھوں کو مسل دیتا۔

کہانی میں ایک گمشدہ بچی کو ایک نوجوان اپنے گھر لے آتا ہے اور اس کی بہت دیکھ بھال کرتا ہے۔ اپنے ہاتھوں سے کھانا اور دوائیں کھلاتا ہے۔ اس کے ساتھ کھیلتا ہے۔ اسے لوریاں گا گا کر سلاتا

ہے۔وہ اداس یا ناراض ہو تو جانوروں کی نقل اتار کر اسے ہنساتا ہے۔ضد کرے تو گال پھلا کر اس سے تھپڑ بھی کھاتا ہے۔

جب وہ اس کی انتھک خدمت سے صحت یاب ہو جاتی ہے تو اسے پہچان ہی نہیں پاتی۔

وہ لوری گاتا ہے کہ کبھی وہی لوری وہ اس کے ساتھ گانا سیکھ گئی تھی۔

تو وہ حیرت سے اسے دیکھتی ہے۔اسے کچھ یاد نہیں ہوتا۔

وہ بندر کی طرح اچھلتا ہے، تو وہ پہلے کی طرح نہیں ہنستی۔

فلم کے اختتام تک وہ جب اسے کسی طرح یاد نہیں دلا پاتا اور وہ والدین کے ساتھ لوٹ جاتی ہے تو وہ سڑک کے کنارے بیٹھ کر رو پڑتا ہے۔

اس منظر پر عامر دھاڑیں مار مار کر رویا تھا۔اور ہچکیاں لے لے کر تتلائی زبان میں والدین سے سوال پر سوال کئے جاتا تھا۔

''وہ للکی اسے کوں نہیں پیچانتی امی۔۔ابو اُس للکی کو کون بتائے گا۔۔وہ لوتا ہے۔۔وہ کُوں لوتا ہے۔۔وہ چپ نہیں کرتا۔۔''

اور اس رات عامر آدھی رات تک روتے روتے سو گیا تھا۔

ایسے حساس بچے کو ہرگز اس بات کو سچ نہیں سمجھنا چاہیئے۔

''ہاں بیٹا۔۔میں جانتی ہوں۔۔''

نور جہاں نے کپکپاتی لڑکھڑاتی زبان کو قابو کرنے کی کوشش کرتے ہوئے چہرے پر کچھ ہنسی جیسی شے طاری کی۔

''وہ تو پینٹ شرٹ پہنے ہے۔۔کوئی وحشی قبائلی تھوڑی ہے۔۔اور پھر اب تو کوئی ایسا وحشی بھی کہاں ہوگا۔۔دنیا اتنی سویلائزڈ ہو گئی ہے۔۔سب کیمرہ ٹرکس ہیں۔''

بیٹے کو وہ آرام کی تلقین کر کے خود بھی کمرے میں چلی گئی۔

شوہر کو کچھ نہیں معلوم تھا کہ عامر کے کمرے میں کیا ہوا۔اس کے تھرتھراتے کانپتے دل میں بارہا یہ خیال آیا کہ وہ شوہر سے اس بارے میں بات کرے تو شاید وہ کوئی تسلی بخش جواب دیں گے مگر شکار کرنے کو پشتینی سند سمجھنے والے خاندان کی دوسری نسل کے تیسرے چشم و چراغ کو جو کسی مرغی کو ذبح ہوتے

نہ دیکھ سکتے تھے، ایسی دل آزار بات کے بارے میں کوئی کیا پوچھے۔ چنانچہ کمزور دل پر پتھر کی سل سا بوجھ لئے وہ سونے کی کوشش کرتی رہی۔

وہ پڑھی لکھی، سیاسی وسماجی بصیرت سے بہرہ ور خاتون تھی۔ جانتی تھی کہ انسان کی یہ حیوانیت آج کی دنیا کی کنفیوژڈ سیاسی صورتِ حال کے سبب ہے کہ اس دور میں کیا نہیں ہوتا۔

ایک طرف تو اشرف المخلوق کی روحانی اور اخلاقی بنیادیں تبدیل کی جارہی ہیں تو دوسری طرف نئی طرز کی سیاست فروغ پارہی ہے۔

دشمن تخلیق کئے جاتے ہیں اور دوستوں اور دشمنوں کی فہرستیں بدلتی رہتی ہیں۔ پھر دنیا کو یہی باور کرانے کی کوشش ہوتی ہے کہ ستم گر، ستم ڈھانے میں حق بجانب ہیں۔

اسے معلوم تھا کہ روغنی زمینوں والے اگر آرام طلب نہ ہوتے، عیاشیوں کے زیرِ اثر حواس گم کر کے اپنی ہی مٹی پر دوسروں کو ٹھکانہ کرنے کی اجازت دے کر ان کے ہاتھوں میں نہ کھیلتے تو اس وقت دنیا کا منظرنامہ الگ ہوتا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ قدیم علوم اور جدید تہذیب کا سہرا اپنے سر لینے والوں نے بہت سی چیزوں کا استعمال اسی مہذب قوم سے سیکھا جو ندیوں پیڑوں یا پر فضا مقامات کی روح پرور فضاؤں سے نہیں، ریگستانوں سے اٹھی تھی۔ اور جب وہ تہذیب کے شروعاتی عمل سے دوچار تھے اس سے کہیں پہلے یہاں اس سرزمین پر، اس کی اپنی سرزمین پر دانش گاہیں تعمیر ہو کر کئی نسلوں کو کئی صدیوں تک مختلف علوم سے بہرہ ور کرنے کے بعد پھر معرضِ وجود میں آنے کے لئے اجڑ بھی چکی تھیں۔ اور اسے اس بات کا بھی علم تھا کہ یہ زمانہ مثبت تہذیبی کارناموں کو اپنے کھاتے میں ڈالنے کا ہی نہیں، ذرائع ابلاغ کے بے مُہار استعمال سے ایسی دیدہ دلیریوں کے فروغ کے ساتھ ساتھ بہتان اور دِروغ گوئی کا بھی ہے۔

اسے خبر تھی کہ عام انسان کو تیز گام زندگی کی ایسی دوڑ میں دھکیلا گیا ہے کہ اس کے پاس سوچنے کی فرصت ہی نہیں۔ وہ بھی مشین کی طرح دوسرے کل پرزوں پر انحصار کرتا بھاگا جارہا ہے۔ سوچنے کے لئے ذرا ٹھہر جاتا تو سوچتا کہ دنیا میں بھلا کون اپنے معصوموں کو جواں مرگی کا پیام دے گا۔ اپنے تو ایسا نہیں کرتے۔ محرومیوں اور رسوائیوں کا یہ سامان کون کر رہا ہے۔ لالچ، بالادستی، زبردستی۔ کون جانے؟

وہ یہ بھی جانتی تھی کہ یہ اندھی بڑی طاقتیں کس کس بہانے سے آپس میں مل کر خوش حال ممالک کی زمینوں کے اثاثے ہڑپنے کا سامان کرتی ہیں۔

دوست بن کر کمزوریوں کو خریدتی ہیں اور نہ خرید پائیں تو بے سبب کے دشمنوں کی طرح علی الاعلان حملوں پر اتر آتی ہیں۔ ترقی پذیر ملکوں کو توڑنے اور غلام بنانے کے لئے انسانیت سوز حرکات کر رہی ہیں۔

بظاہر اخباروں میں عام انسانوں کی طرح آئس کریم کھاتے اور بچوں سے کھیلتے تصویریں چھپواتے ہیں یہ لوگ۔ گویا وہ بھی انسان ہے۔ اور بباطن ایسی حرکات کیے چلے جاتے ہیں۔ گویا انسان ہی نہیں۔

مگر کسی کے لئے تو رکھتے ہوں گے یہ لوگ بھی نرم گوشہ۔ کچھ تو انسانیت کی رمق ہو گی ان کے اندر، کہ ان کی شکلیں انسانوں جیسی ہیں۔

تو وہ رمق سب کے لئے کیوں نہیں۔ کوئی تو اس رمق کو جگائے ان کے اندر۔

کون جگائے گا۔

شاید کبھی وقت انہیں سمجھا دے۔ مگر ایک عرصہ گزر جانے کے بعد۔ جب یہ لوگ خود ہوں گے نہ ان کے مظالم جھیلنے والے۔

ہٹلر مناظر کو مصوِر کیا کرتا تھا۔ مگر تصویر کے گوشے میں پس منظر سے جدا کسی رنگ میں چھوٹا سا 'روڈالف' پینٹ کیا ہوا منظر کسی بھی تہذیب یافتہ شخص نے اپنی نشست گاہ کی زینت بنانا گوارا نہ کیا۔

پھر وہی ہوگا۔ آنے والا دور اس دور کے یک قطبی تصور کی نا خدائی، شب خون مارنے والی اس انسان نما، شپرۂ چشم مخلوق کو بھول سکے گا؟

خونخواہی کی مسلسل مثال، ان زندہ بدروحوں کو کیسے کیسے یاد کرے گا۔

اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ان کے علاوہ کچھ ایسے شدید نسل پرست بھی ہیں جو اپنی نسل کو اتنا اہم اور عظیم سمجھتے ہیں کہ اگر دوسری نسل کے فرد کا بچہ ان کے وہاں کسی کی امید بنا پل رہا ہے تو اس کی نشو و نما کو جراحی عمل سے روک دیتے ہیں۔ خود کو ایسا سالم اور خالص سمجھتے ہیں کہ اپاہج بچوں کو پیدائش کے وقت مار کر غالباً دفنا دیتے ہیں کہ ان کے ملک میں کوئی اپاہج انسان نظر نہ آئے۔ کبھی رعب ڈالنے کی خاطر اور کبھی انا کی تسکین کے لئے نیوکلیائی تجربے کرتے ہیں۔ یہ لوگ محض انا کی تسکین کے لئے جانیں لے سکتے ہیں۔ یہ لوگ فاقوں سے بے حال ہو کر پیٹ کی آگ کو بجھانے کے لئے غلط چیزوں کے استعمال پر مجبور نہیں ہوتے۔ یہ لوگ شوق کی تکمیل کے لئے انسانیت سوز کام کرتے ہیں۔

یہ لوگ ان ایبارنڈ بچوں کو دفنانے کی بجائے کھا بھی سکتے ہیں۔۔

یہ لوگ اپنے بچوں کو بھی۔۔ یعنی۔۔ یعنی۔ یہ لوگ بھی جانوروں کی طرح۔

یعنی جیسے بلی کو ڈر لگا رہتا ہے کہ خود ان کا باپ ہی اپنے بچوں کو نہ کھا جائے۔

جیسے سانپ اپنے ہی بچوں کو کھانے کا موقع ڈھونڈتا ہے۔ اور ممتا۔۔ ممتا کی ماری ناگن۔

ان کی عورتیں تو اس میں حصہ دار نہیں ہو سکتیں۔۔ ان چند مردوں کی طرح جنہیں ممتا بھرے

دل سے نوازا ہو قدرت نے۔ جن کے بل پر انسانیت باقی ہے۔

ان ہی باتوں پر سوچتے سوچتے نور جہاں کے تھکے دماغ کے لاشعور نے ان سب انہونی سچائیوں کو خواب بنا کر تصور کی آنکھوں کے سامنے کر دیا تو وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گئی۔

خواب میں وہ آدم خور گاہے سرخ و سفید جلد اور نیلی ہری یا بھوری آنکھوں والا طویل قامت ہوتا، گاہے پیلی رنگت چندھیائی آنکھوں اور پھیلی ناک والا جو انسانی کھال میں ہیرے جواہرات جڑ کر زیب تن کرتا ہے اور اس کے کمرے کا فرنیچر نہایت عمدہ ہوتا ہے۔ اور کبھی وہ منگولیائی نسل کا قدرے کوتاہ قد آدمی ہوا کرتا اور ایک معمولی سے ریستوران میں نظر آتا۔

نور جہاں کی آنکھ لگتی تو خواب گویا دل کی جانب جاتے ہوئے خون کو منجمد کر دیتے۔ اور یہ سلسلہ آج تین روز سے جاری تھا۔

ڈاکٹروں نے علاج کے لئے زیادہ تر نیند کی گولیاں ہی تجویز کی تھیں۔

ہسپتال میں لیٹی ماں کو دیکھتا ہوا عامر سوچ رہا تھا کہ جب ماں پوری طرح بیدار ہو گی اور اس کے ساتھ گھر چلے گی تو وہ اس سے کہے گا کہ وہ گاؤں جا کر دادا جان کے ساتھ اپنی زمینیں سنبھالیں گے اور باہر کی دنیا سے کوئی تعلق نہ رکھیں گے۔۔ کیوں کہ یہ۔ گلوبلائی زیشن۔۔ کلوننگ۔۔ یہ نیوکلیائی ہتھیار۔۔ ہلاکتوں کے یہ جدید سائنسی آلات۔۔ دراصل انسانیت کا کمرشلائزیشن ہے۔۔ اور فطرت سے بہت دور بھی۔۔ اسی لئے انسان کی معصومیت چھن گئی ہے۔۔ اور لوگ جانور ہو گئے ہیں۔۔ اور اسے اس ملٹی نیشنل کمپنی کی نوکری نہیں کرنی ہے۔۔ اسے نیچر کا حصہ بن جانا ہے۔۔ وہ سب نیچر کا حصہ ہو جائیں گے۔

یہ فیصلہ کرتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ چھا گئی۔ کیوں کہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ماں اس بات کے لئے آسانی سے ہاں کر دیں گی۔ اور ابو کو بھی منالیں گی۔

◆❖◆

ماں صاحب

جانماز پر بیٹھی ماں صاحب نے سر اوپر اٹھا کر خرم کی جانب دیکھا تو روشنی سے ماں صاحب کی آنکھیں چندھیانے لگیں۔

''خدا اس کی عمر دراز کرے بیٹا۔۔ابھی معصوم بچہ ہے۔۔اگلے برس چلا جائے گا۔۔عمر پڑی ہے اس کی۔۔میں۔۔میں کتنے دن اور زندہ رہ لوں گی۔۔''

انہوں نے ادھ مندی آنکھیں میچ کر سر جھکا لیا۔مگر ان کے کان خرم کی آواز کے منتظر رہے۔

ان کے ماتھے کے قریب نظر آنے والے بال سر پر اوڑھی چادر سے بھی سپید نظر آرہے تھے۔ تسبیح پھیرنے کی رفتار کے ساتھ آڑی ترچھی لکیروں والی ٹھوڑی اوپر نیچے ہو رہی تھی۔چھوٹی سی جانماز پر بیٹھی ماں صاحب سکڑتے سکڑتے اتنی ہو گئیں تھیں کہ اگر جانماز موجودہ سائز سے نصف کر دی جائے، جب بھی وہ اس پر بآسانی نماز ادا کر سکیں۔

ماں صاحب کب اتنی نحیف ہو گئیں پتہ ہی نہ چلا۔خرم کے دل میں یہ خیال آیا ہی تھا کہ پاس سے تیز چل کر اندر جانے کی کوشش میں ہانپتی شگوفہ پر نظر پڑی۔اس نے دونوں ہاتھوں کی بھری بھری

انگلیوں سے کنپٹیاں ایسے تھام رکھی تھیں جیسے ہاتھ ہٹانے سے سر کے زمین پر گر جانے کا اندیشہ ہو۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا شگوفہ کا بھاری بدن رفتار کے ساتھ داہنے بائیں جھکتا تھا۔ کمر کے معمولی طور پر سے نمایاں خم کو چھوڑ کر سارے جسم پر چربی نے قبضہ جما رکھا تھا۔

''ہے نا بیٹا۔۔ میں کتنے دن تک رہوں گی اب۔۔ ٹھیک ہے نا۔۔؟''

خرم نے نظریں اندر جاتی ہوئی شگفتہ سے واپس لا کر ماں صاحب کی طرف موڑیں۔ ماں صاحب دوبارہ گردن اوپر کئے آنکھیں جھپک جھپک کر بیٹے پر پتلیاں مرکوز کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ آنکھ کے آپریشن کے بعد ایک آنکھ کی پتلی کسی شے پر زیادہ دیر مرکوز کرتے وقت اس آنکھ میں بھینگا پن آ جاتا تھا۔ تسبیح فاطمہ کا ورد کر رہی ماں صاحب کی زبان ایک ردھم سے تالو سے لگتی تھی اور انگلیاں تسبیح کے دانوں پر تیزی سے چل رہی تھیں۔

بسم اللہ۔ خرم نے دل میں دہرایا تو عجب حسرت بھری مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر چھا گئی۔

''بسم اللہ۔۔''

زاہدہ نے بڑی بڑی سیاہ پتلیوں والی آنکھوں کو مزید پھیلا کر کہا اور لام کی آواز نکالتے وقت لاجوردی سے ہونٹوں، لا دہانہ وا کر کے تالو سے جا لگتی زبان کا لام کہنے والا عمل سمجھانے کے لئے چار سالہ خیرو کے گول گول چہرے کے عین سامنے اپنا چہرہ لے جانے کے لئے فرش پر بیٹھ گئی۔

''ایسے ہی کہا تھا۔۔ ہم نے بھی۔۔''

خیرو نے روٹھی روٹھی آواز میں کہا اور ہاتھ میں تھاما چمچ ہفت رنگ پھولوں والی تام چینی کی پلیٹ میں رکھ دیا۔

''نہیں کھائیں گے۔۔ ہم۔۔''

اس نے زاہدہ کی زبان کی طرف دیکھا جو لام کہہ کر ابھی ابھی تالو سے الگ ہوئی تھی۔

''کیوں نہیں کھائیں گے۔۔''

زاہدہ نے کچھ اونچی آواز میں کہا اور ہاتھوں میں تھامی خیرو کی دونوں کلائیاں جلدی سے چھوڑ دیں۔

ایسے میں اس کی چوڑیاں چھن سے بجیں تو خیرو اس کے ہاتھوں کی جانب دیکھنے لگا۔

''اس لئے کہ آپ نے زور سے پکڑے تھے۔۔ہاتھ ہمارے۔۔''

اس نے دھیرے سے کہا پھر زاہدہ کے چہرے کی طرف دیکھا اور منہ دوسری طرف موڑا جہاں سے دسترخوان پر چنی نعمتیں نظر آنے کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔اور خاص کر باریک سفید چینی کی قاب جس کے پار سے دسترخوان کے سرخ پھول تک نظر آتے تھے اور جس میں زاہدہ نے اس کی پسند کی ضیافت یعنی نرم نرم آلو کے بھورے بھورے قتلے پروس رکھے تھے۔

تام چینی کی رکابی اپنی طرف سرکاتے ہوئے زاہدہ کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''ہم کھلائیں گے اپنے بچے کو۔۔مگر پھر بچے کیسے سیکھیں گے اگر سمجھایا نہ جائے۔۔آپ لام پر تشدید بھول جاتے ہیں نا۔۔''

زاہدہ نے اسے اپنے زانو پر بٹھایا۔

''دھیرے سے ہاتھ پکڑ کر بھی تو سمجھایا جا سکتا تھا نا۔۔''

خیرو زاہدہ کے چہرے کی طرف دیکھ کر سمجھانے کے انداز میں زاہدہ ہی کی طرح بار بار پلکیں جھپک کر بولا کہ اب اور روٹھے رہنا قتلوں کے ذائقہ کو ترستی زبان کے لئے ممکن نہ تھا۔وہ تتلاتا نہیں تھا اور اس کی زبان بھی صاف تھی۔زاہدہ کو ہنسی آئی تھی مگر وہ مزید ذرا گہرا سا مسکرا کر رہ گئی۔

''اوہ۔۔اس کے لئے ہم معافی مانگتے ہیں۔۔''

زاہدہ نے کانوں کو ہاتھ لگایا تو خیرو نے دیکھا کہ کمرے کی چھت کے درمیان لٹک رہے فانوس سے ملتے جلتے جھمکوں کے ساتھ بندھے بہت سے چھوٹے چھوٹے سرخ موتی (جو ہلکے ہلکے جھولا سا جھولا کرتے تھے) زور زور سے ہلنے لگے تھے۔زاہدہ نے کانوں سے ہاتھ ہٹائے تو ننھے ننھے سرخ موتیوں سے نظریں ہٹا کر خیرو نے رکابی کی طرف دیکھتے ہوئے منہ بڑا سا کھول دیا۔موتی خرگوش کی آنکھ کی طرح چمک رہے تھے مگر خرگوش کی آنکھ سے بہت چھوٹے تھے۔اس نے ایک اور سیکنڈ کے لئے زاہدہ کے کانوں کی طرف نظر ڈالی اور پھر رکابی کی جانب دیکھنے لگا۔زاہدہ آلو کو کانٹے میں پروئے پھونک مار کر ٹھنڈا کر رہی تھی اور کچھ ہی دیر میں قتلہ خیرو کے منہ میں آنے والا تھا۔

''اب ہمارا بچہ جلدی جلدی کھائے گا۔۔۔پھر ابو کے ساتھ تھوڑا سا کھانا بھی کھاتے ہیں نا اچھے بچے۔۔''

زاہدہ نے اس کے گال پر ایک بوسہ ثبت کیا۔

''جی۔۔''

آلو چباتے ہوئے وہ سر ہلا ہلا کر جھومتے ہوئے بولا تھا۔

جب تک خیرو کے ہاتھ پاؤں تھوڑے لمبے ہوئے تھے، وہ زاہدہ کے ہی ہاتھ سے آلو کے قتلے کھاتا تھا کہ اوپر سے ٹھنڈا نظر آنے والا گستاخ قتلہ منہ کے اندر جاتے ہی اس کی زبان جلا دیتا۔ مگر پھر اپنے ہی ہاتھ سے کھانے سے بھی ایسا اکثر ہی ہونے لگا تھا اور وہ دہانہ وا کر کے زور زور سے سانس اندر باہر کر کر کے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتا تو زاہدہ جانے کہاں سے پانی لئے آ پہنچتی۔

انہوں نے کیسے سانس کی آواز سن لی تھی اتنی دور سے۔ خیرو سوچ کے رہ جاتا۔

''اگر ہم گھوم گھوم کر کھائیں گے تو پانی ساتھ کیسے رہے گا۔''

وہ جب بھی سمجھانے کے ہی انداز میں کہا کرتی۔

خیرو نے اپنے ساتھ زاہدہ کو بھی بڑا ہوتے دیکھا تھا۔ مگر جب اس کا قد اور لمبا ہوا تو اس کی دونوں بچیاں موٹی ہوگئی تھیں اور ان کے اچھے اچھے کپڑے ان کی کمر میں پھنس جاتے تھے اور کبھی کبھی وہ گاؤ تکیے سی لگتیں۔ مگر زاہدہ پہلے کی ہی طرح تھی۔ مشن سکول کی پیرینٹ ٹیچر میٹنگ میں جب بچے کہتے کہ خیرو کی مدر بہت کیوٹ ہیں تو اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ خیرو نے زاہدہ کو ہمیشہ بچوں کی ہی طرح پلیٹ میں تھوڑا سا کھانا لیتے دیکھا تھا۔ گھر کے لوگ کھانے پینے کے خاصے شوقین تھے۔ خیرو کے ابو بھی دیر تک کھانے کی میز پر نظر آیا کرتے۔

زاہدہ پانچ نمازوں کے علاوہ بھی کچھ اور نمازیں پڑھا کرتی اور رمضان کے علاوہ بھی کئی روزے رکھا کرتی۔ گھر میں ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف نظر آتی۔ چادریں کاڑھنے سے لے کر ملازمین کے ساتھ مل کر باغیچے کے حوض صاف کرنے تک۔ کچن گارڈن میں پھول سبزیاں اُگانے تک۔ اور زاہدہ کو پودوں میں پانی کھاد ڈالنے اور کھانا بنانے جیسے کام کرتے دیکھ کر خیرو خیر سے بڑا ہوگیا تھا۔

یہ بیسویں صدی کے وسط کے آس پاس کے دن تھے۔ لوگ کچھ سرحد پار ہجرت کر گئے تھے۔ بعض اپنی زمینوں سے لگے رہے۔ جاگیریں ضبط ہونے لگیں تو محنت کش لوگ سر اٹھا کر جینا سیکھنے لگے۔ بدلتی اقدار سے جب استحصال شدہ لوگوں نے آرام طلبوں کو جی کھول کر مذاق کا نشانہ بنایا تو زاہدہ اس کی شکار نہ ہوئی کہ اس کی ملنسار طبیعت ہر دل عزیز تھی۔ زمینوں کو مستقل قسم کا سرمایہ سمجھنے والے گھر کے حاکموں نے صرف پیسہ جمع کیا تھا۔ مستقبل کے لئے کسی قسم کی سرمایہ کاری کر کے مالی حالات کو مضبوط نہیں کیا تھا۔ زمینوں کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ جمع شدہ پیسہ بھی ختم ہوتا گیا۔

دونوں دیور منقولہ جائداد کا بڑا حصہ لے کر ہجرت کر گئے۔ اُن کی والدہ ان کے ساتھ نہیں گئی

تھیں۔ وہ اپنے بڑے بیٹے اور بہو کے پاس رہیں۔ اوران کا خیرو سے بھی دوستانہ رشتہ تھا۔ زاہدہ کے شوہر کا انہی دنوں انتقال ہوگیا۔ پھر والدہ بھی زیادہ دن تک زندہ نہیں رہیں۔

مگر گھر کا ظاہری رکھ رکھاؤ ویسے ہی قائم رہا۔ خیرو کی تعلیم بلکہ کچھ اور اہتمام سے جاری رہی۔ دبلی پتلی ناخواندہ ماں کے کام کی صلاحیت اور مستقبل کے مشوروں پر خیرو کی عقل حیران رہ جایا کرتی۔

اپنے ساتھ اس نے ماں کو بھی بدلتے دیکھا تھا۔ جب چھوٹا تھا تو ماں کے ہاتھوں میں بہت سی چوڑیاں ہوا کرتیں۔ لباس کے رنگوں جیسے آویزے اور کنگن۔ ماتھے کے اطراف اس کے بال لہراتے بہت اچھے لگتے۔ جب ماں اسے گود میں لیا کرتی تھی تو اس کے کندھے کے پاس سے چنبیلی کے پھولوں کی سی خوشبو آتی جس کی پھلواری باغیچے کے پیچھے والے کونے میں جھولے کے قریب کی دیوار سے لگی رہتی۔ خیرو جب دسویں درجے میں تھا تو ماں نے چوڑیاں بندے پہننا چھوڑ دیے تھے۔ صرف کلائی میں گھڑی تھی اور گلے میں چھوٹے موتیوں کی بڑی سی مالا۔ وقت سے پہلے ہی ماتھے کے اطراف بال خاصے سفید ہو چلے تھے اور سفید موتیوں کی مالا کے ساتھ خوب جچتے تھے۔ خدا حافظ کہتے وقت ماں اس کے ماتھے کا بوسہ لیتیں تو ان کے پاس سے وہی گلِ یاسمین کی مہک آیا کرتی۔

ماں صاحب جب اور بڑی ہوگئیں اور خرم بھی بڑا ہو کر اور بڑا افسر بن گیا تو ماں نے اس کے لئے اسی کی طرح پڑھی لکھی اور ہری ہری آنکھوں والی دلہن ڈھونڈ لی جو خود بھی بڑی افسر تھی۔

ماں صاحب نے گھر سنبھالے رکھا اور دلہن کی زچگی بھی ماں کی ہی طرح کر کے اسے دفتر کے لئے چاق و چوبند کر دیا۔ ماہم کی دیکھ بھال خود کرتی رہیں اور پھر کوئی تین برس بعد قیصر کی بھی۔ ماں صاحب نے بیٹے کے بچوں کی بھی اسی انداز سے عمدہ پرورش کی گو کہ وہ اب پہلے کی نسبت کمزور ہو گئی تھیں۔ خاندان بھر میں اور خاندان سے باہر بھی ماں صاحب کے ایسا احترام اور کسی کو نصیب نہ تھا۔

ماہم پڑھ لکھ کر برسرِ روزگار ہوئی تو اسے وداع کر دیا گیا۔ جب ہی پھر ماں صاحب کو ذرا دم لینے کی فرصت ملتی محسوس ہوئی۔ اور پھر انہوں نے حج کو جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ خرم بخوشی تیار ہو گیا۔

"تمہیں بھی چلنا ہوگا میرے ساتھ بیٹے۔۔"

ماں صاحب مسکرا دیں۔

"کوئی محرم چاہیئے نا۔۔ اور پھر تمہیں بھی تو۔۔"

"جی ماں صاحب۔۔ میری بھی شدید چاہت ہے۔۔ انشاء اللہ۔۔"

قیصر کی پڑھائی کا معاملہ نہ ہوتا تو شگوفہ کو بھی لے چلتے۔۔"

خرم نے پراٹھے پر بالائی لگاتی ہوئی شگوفہ کی طرف دیکھا۔

''آپ کا بجٹ ہے اتنا۔۔؟''

شگوفہ نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

''ہاں۔۔ کھینچ کھانچ کے۔۔ اگر بلا وا ہوا تو۔۔''

''اتنے خرچے کے بعد بھی۔۔ سب بڑی بڑی رقوم تو نکال لیں ہم نے۔۔''

''اچھا۔۔؟''

ماں صاحب نے موٹے چشمے کے پیچھے سے ایک نظر سب کو دیکھا اور ابلی ہوئی لوکی پر چھڑکی گئی دھنیے کی پتیوں کی خوشبو سے محظوظ ہو کر مسکرا دیں اور نمک دانی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ خرم نے نمک ان کی طرف سرکایا۔

''بس ذرا سا۔۔ ضرورت نہیں ہوتی اتنے نمک کی انسان کو۔۔''

''یہ بات ذرا انہیں بھی تو سمجھایئے نا۔۔''

خرم نے شگوفہ کی طرف اشارہ کیا۔ اور مسکرایا۔

''شگوفہ کو۔۔؟''

ماں صاحب بھی مسکرائیں۔

'' کہاں کا شگوفہ ماں صاحب۔۔ یہ تو جانے کب کی پھول ہو گئیں اور وہ بھی سورج مکھی کا۔۔ وہ اس لئے کہ اس سے بڑا کوئی اور پھول نہیں ہوا کرتا غالباً۔۔''

''قیصر قہقہہ لگا کر ہنسا۔''

''ہوتا ہے پاپا۔۔ گوبھی کا۔۔''

اس نے کہا تو ماں نے اسے مصنوعی غصے سے دیکھا۔

''مام۔۔ نظر لگا رہے ہیں ڈیڈ آپ کے ڈنر کو۔۔''

شگوفہ بھی مسکرائی۔

''لگانے دو جی۔۔ ہم پھر بھی وہی کھائیں گے جو جی چاہے گا۔۔ اصل میں خود ان کا جی للچا رہا ہے۔۔ ماں صاحب کے ڈر سے نہیں کھا رہے۔۔''

''مجھے چشمے کے پیچھے سے کچھ زیادہ نظر نہیں آتا۔۔ جسے جو چاہے کھا سکتا ہے۔۔''

سب نے قہقہہ لگایا تو ماں صاحب سر جھکائے مسکرائیں۔

''کبھی کبھی چلتا ہے۔۔''

انہوں نے پرخلوص سی آواز میں کہا۔

ماں صاحب اور خرم حج سے لوٹے تو شگوفہ اور گھر کا ملازم کئی روز تک مبارک بادیوں کے تقاضوں میں گھرے رہے۔ کئی دن تک روز کا سکیڈیول متاثر ہوتا گیا۔ ہفتوں بعد کہیں کچھ سکون میسر ہوا۔

رات شگوفہ خواب گاہ میں آئی تو خرم میز پر کچھ کاغذ دیکھ رہا تھا۔

''باہر جانا چاہتے ہیں صاحب زادے۔۔''

اس نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

''جی۔۔کوئی ڈپلومہ ہے دو سال کا اور اس کے بعد اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے گا انشاءاللہ۔۔''

''مگر فیس ڈالر، پاؤنڈ یا یورو میں ہوگی۔۔ پتہ ہے آپ کو۔۔''

خرم نے ایک کاغذ پلٹ کر دیکھا۔

''ہے تو۔۔مگر بچے کا مستقبل بھی تو دیکھنا ہے نا۔۔اور اگر کم ہو تو وہ پانچ سال والی ایف ڈی میچور ہونے والی ہے۔۔''

''ہاں ہے تو مگر وہ نومبر میں ہوگی اور رقم مارچ میں چاہیئے۔۔ میں وہی دیکھ رہا تھا۔۔''

''اس ایف ڈی پر لون بھی مل سکتا ہے۔۔ کچھ انٹریسٹ میں کمی ہو سکتا ہے مگر۔۔''

''توڑا بھی جا سکتا ہے اسے۔۔مگر پھر انٹریسٹ لوز ہو جائے گا۔۔''

''کوئی اور چارہ بھی نہیں۔۔''

اس نے شوہر کے چہرے کی جانب دیکھا اور الماری سے رات کو پہننے والا لباس نکالنے لگی۔

باہر کوئی کتا زور زور سے بھونک رہا تھا۔

اگلی صبح برآمدے میں ناشتے کے دوران ماں صاحب نے بتایا کہ رات ان کی چھاتی میں ہلکا سا درد اٹھا تھا۔

''کس طرف۔۔؟ داہنے یا بائیں۔۔''

خرم نے گھبرا کر پوچھا تھا۔

ماں صاحب نے جب بائیں کہاتو خرم نے چائے کا پیالہ چھوڑ دیااور کھڑا ہوگیا۔
''آپ تیار ہو جائیں۔۔میں چینج کرتا ہوں۔۔ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں پوری طرح چیک اپ کرانا ہوگا۔۔''

''ابھی بھی تکلیف ہے۔۔؟''
شگوفہ نے پوچھا۔
''نہیں۔۔''
''تو پھر کوئی خاص بات نہ ہوگی انشااللہ۔۔تیزابیت سے بھی بھاری پن ہو جاتا ہے اور دھڑکن تیز اور تکلیف سی محسوس ہوتی ہے۔۔''
شگوفہ نے کہا۔
''ہاں بیٹا۔۔پھر بھی۔۔مجھے ڈر سا لگ رہا ہے۔۔نرسنگ ہوم لے چلنا مجھے۔۔''
''ہاں سب چیک کروائیں گے ماں صاحب آپ فکر نہ کریں۔۔''
خرم اندر چلا گیا۔
''کچھ نہیں ہوا ہے۔۔سب ٹھیک ہے۔۔بلاوجہ۔۔''
شگوفہ نے سامنے کی دیوار پر اخروٹ کی لکڑی سے منقوش آیت الکرسی کو ابرو اٹھا کر ایک نظر دیکھا اور لمبا سانس لے کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

اور واقعی کچھ نہیں ہوا تھا۔ ہر طرح کی جانچ صحیح نکلی۔سب مطمئن ہو گئے مگر خرم نے محسوس کیا کہ ماں صاحب اکثر و بیشتر کراہتیں ہیں۔
ویسے ماں صاحب کا معمول بھی نہیں بدلا تھا اور صحت بھی ٹھیک لگتی تھی۔وقت سے کھانا پینا بھی ہوتا تھا۔رات کو آرام سے سوتی بھی تھیں اور رات کی عبادت بھی حسب سابق جاری تھی۔مگر جب بھی خرم کے کانوں میں ان کے کراہنے کی آواز پڑتی ،وہ بے سکون ہو جاتا۔لپک کر ان کے پاس جا پہنچتا۔پوری تسلی کرتا کہ سب خیریت ہے۔
''ماں صاحب ٹھیک تو ہیں نا آپ۔۔کیوں کراہ رہی تھیں۔۔؟''
''میں ٹھیک ہوں بیٹا۔۔دفتر جا رہے ہو۔۔آؤ دعا دم کردوں۔۔پھر میں چاشت میں مصروف ہو جاؤں گی۔''

انہوں نے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا پڑھی۔ان کے پاس سے گلِ یاسمین کی خوشبو آ رہی تھی جس سے خرم پچاس سال سے مانوس تھے۔

''جاؤ اللہ حامی و ناصر ہو۔۔''

''ٹھیک ہیں نا آپ ماں صاحب۔۔''

خرم نے باہر کی جانب قدم بڑھانے سے پہلے پوچھا۔

''ہاں بالکل۔۔بے فکر ہو کر جاؤ۔۔''

لابی میں لوٹا تو چائے کی پیالی پر بھاپ جیسی کوئی شے نظر نہ آئی۔

''ناشتہ کیے بنا اٹھ گئے۔۔؟''

شگوفہ نے پیالی ان کے سامنے سے سرکائی اور ٹی کوزی ہٹا کر ہاتھ کی الٹی طرف سے کیتلی کو چھوا۔پھر گردن باورچی خانے کی طرف اچکائی۔

''ظفر دوسرا کپ دینا۔۔''

اس نے ہلکے سے پکارا۔

''گرم ہے۔۔''

وہ کیتلی سے ہلکا سنہرا گرم گرم پانی نیلے کنارے والی سفید پیالی میں انڈیلنے لگی۔

''لیجئے۔۔''

''گھبرا جاتا ہوں میں۔۔''

وہ شکر دان اپنی طرف سرکا کر بولے۔

''بلاوجہ گھبراتے ہیں آپ۔۔''

''سوچتا ہوں ہمارے لئے کیا نہیں کرتی رہتیں ماں صاحب۔۔کہیں مجھ سے کوئی کمی نہ رہ جائے۔۔''

''کس چیز کی کمی۔۔وہ ماشاللہ بالکل تندرست و توانا ہیں۔۔''

''مگر اس دن کی تکلیف کے بعد کراہتی کیوں رہتی ہیں پھر۔۔؟''

''آپ ہی کی موجودگی میں یہ آواز سننے کو ملتی ہے۔۔ورنہ دن بھر تو۔۔''

''کیا تم روایتی بہوؤں کی طرح۔۔کبھی انہوں نے روایتی ساس جیسا برتاؤ کیا ہے تمہارے ساتھ۔۔''

''آپ یہ الزام نہ دیجئے۔۔ ساری رات عبادت میں گزارتی ہیں ہمیشہ کی طرح۔۔ کمرہ ہم سے زیادہ دور تو نہیں۔۔ جب ان کے دُرود و تلاوت کہ آواز کانوں میں پڑسکتی ہے تو۔۔؟''

''وہ تو میری کچی نیند کے سبب اونچی آواز میں کہاں پڑتی ہیں۔۔''

''تو کراہتی ہیں رات کو کیا۔۔ کبھی سنا آپ نے۔۔؟''

''نہیں۔۔ سنا تو نہیں۔۔ شاید۔۔''

''اگر کراہتیں تو آپ ضرور سنتے۔۔''

''برداشت کا مادہ ہے ان میں بہت۔۔ سہہ لیتی ہوں گی۔۔''

''پھر دن میں کیوں نہیں سہہ پاتیں۔۔''

''دن میں سب گھر میں ہوتے ہیں جاگ رہے اسی لئے شاید۔۔''

''ہاں شاید۔۔ شاید یہ ہی بات ہوگی۔۔''

شگوفہ نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا۔

''یہی ہوگا۔۔ مگر آپ پریشان نہ ہوں۔۔ ماشاءاللہ سے تندرست ہیں۔۔''

خرم چائے پینے لگا۔ تو ملازم آکر میز کے دوسرے کنارے کے پاس کھڑا ہوگیا۔

''رات میں کیا بنے گا میم صاحب۔۔''

''کیا کھائیے گا۔۔''

شگوفہ نے مسکرا کر پوچھا۔

''جو آپ کھلائیے گا۔۔''

خرم نے سر کاندھے کی طرف خم کیا۔ باہر سے کوئی بانسری بیچنے والا ایک پرانی فلم کی دھن بجاتا گزرا۔

خرم نے پیالی خالی کر کے پرچ میں ذرا اونچی آواز سے رکھی اور نیچی آواز میں گاتا ہوا کھڑا ہوگیا۔

''تن ڈولے میرا من ڈولے میرے دل کا گیا قرار رے۔۔''

وہ کمرے کی طرف گیا تو شگوفہ بھی مسکراتی پیچھے چل دی۔

''گوبھی گوشت چلے گا۔۔''؟

شگوفہ نے مسہری پر رکھی نیلے مہین مہین خانوں والی سفید قمیض کو نظر بھر کے دیکھا اور الماری

سے نیلی ہری آڑی دھاریوں والی ٹائی نکال کر خرم کو پکڑائی۔

''ضرور چلے گا۔۔''

وہ ٹائی باندھنے لگے تو شگوفہ باورچی خانے کی طرف لوٹی۔ ملازم ریفریجریٹر میں سر ڈالے 'تن ڈولے' کا اگلا حصہ گنگنا رہا تھا۔

''میرے دل کا گیا قرار رے کون بجائے بانسریا۔۔''

شگوفہ دروازے کے پاس ذرا سا ٹھٹھکی اور کھنکار کر اندر گئی۔ ظفر نے ہونٹ سی لئے اور سر باہر نکالا۔

''ادرک ہے ہی نہیں۔۔''

وہ جلدی سے بولا۔

''گوبھی گوشت بنے گا۔۔ اور وہ بلیک بینز بنانا۔۔ کالی دال۔۔ اور ماں صاحب سے پوچھو جا کر کچھ اور لانا ہو تو۔۔ کچھ کہہ رہی تھیں لانے کو گھیا کے علاوہ۔۔ پھر جلدی مارکیٹ جاؤ۔۔ اور یہ سر اتنا اندر کیوں ڈالتے ہو عقل مند آدمی۔۔ سبزی والا ڈبہ نکال لیا کرو۔۔ اس بہانے دھل بھی جائے گا۔۔''

''کل ہی دھویا تھا خدا کی قسم۔۔''

''اچھا اچھا ٹھیک ہے۔۔ اب شروع ہو جانا قسم پر قسم۔۔''

شگوفہ باورچی خانے سے باہر نکلی۔

''اب قسم نہیں کھاؤں گا میم صاحب خدا کی قس۔۔ اوہ۔۔''

ظفر نے دروازے تک آ کر جلدی سے دانتوں تلے زبان دبائی اور واپس اندر گیا۔

اس شام خرم کچھ دیر سے لوٹا کہ بیٹے کے لئے ٹریولرس چیکس وغیرہ کا کام تھا۔ شام کو قیصر بھی ان کے ہمراہ گیا تھا۔ سب کچھ توقع کے مطابق ٹھیک ہوا تھا۔

رات کے کھانے کے بعد ماں صاحب کے کمرے سے کراہنے کی آواز آئی تو خرم بے قرار ہو گیا۔

''ماں صاحب کو پھر تکلیف ہے دیکھتا ہوں۔۔''

وہ اٹھ کر ان کے کمرے کی طرف گیا۔

''سوئے نہیں بیٹا۔۔''

وہ دھیرے سے بولیں۔

''بس سونے ہی والا تھاماں صاحب۔۔آپ کی طبیعت کچھ خراب لگ رہی ہے۔۔''

''میں ٹھیک ہوں۔۔تم کیوں فکر مند ہو جاتے ہو۔۔''

''مگر آپ کیوں کراہ رہی تھیں۔۔؟''

''میں۔۔کچھ نہیں۔۔ٹھیک ہوں میں۔۔تم۔۔میں۔۔''

شگوفہ بھی کمرے میں داخل ہوئی۔

''تم لوگ آرام کرو۔۔کچھ فکر کی بات نہیں۔۔''

ماں صاحب نے گہری سانس لی۔

''بس میرا جی چاہتا ہے کہ۔۔''

''کیا ماں صاحب۔۔؟''

''ایک بار عمرہ کے لئے جاؤں۔۔۔''

زاہدہ خانم نے دونوں کو باری باری دیکھا۔

''تو ٹھیک ہے۔۔جیسا آپ چاہیں ماں صاحب۔۔''

خرم فوراً مسکرایا۔

''مگر تمہیں بھی چلنا ہوگا۔۔یا قیصر کو۔۔محرم کے بغیر تو ممکن۔۔''

ماں صاحب نے پھر بہو بیٹے دونوں کو دیکھا۔

''یہ۔۔یہ۔۔کیسے کرتے ہیں۔۔سوچتے ہیں ماں صاحب۔۔آپ بے فکر ہو کر آرام کریں۔۔کچھ کرتے ہیں۔۔''

شگوفہ نے ماتھے پر ہلکا سا بل ڈال کر شوہر کو دیکھا پھر ماں صاحب کی طرف (بغیر بل ڈالے) بھی۔

''قیصر بھی آسکتا ہے بیٹا۔۔اس کے امتحان بھی ہو گئے ہیں۔۔، چھ مہینے کے لئے وہ بھی آزاد ہے۔۔آجائے گا ساتھ میرے۔۔مشکلیں حل کرے گا اللہ اس کی۔۔''

''مگر ماں صاحب اسے کوچنگ کا کورس جوائن کرنا ہے۔۔ابھی بچہ ہے انشااللہ آگے چل کر۔۔کرے گا حج بھی اللہ نے چاہا تو۔۔ابھی اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے۔۔''شگوفہ نے جلدی سے کہا۔

''ہاں انشااللہ ضرور کرے گا۔۔میں محرم کی وجہ سے۔۔خیر خرم ہی چلے تو۔۔''

''آپ آرام کیجئے ماں صاحب۔۔کچھ کرتے ہیں۔۔''

خرم نے انہیں مصنوعی ریشم کے نرم نرم ریشوں سے بھری، ساٹن کے چھوٹے چھوٹے گلابی پھولوں والی نیلی رضائی شانوں تک اڑھادی اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ شگوفہ اس کے آگے آگے تھی۔

کمرے میں پہنچے تو شگوفہ کا سانس پھول رہا تھا۔

''ہانپ رہی ہو تم تو دو قدم چل کر۔۔وزن کم کرلو اپنا شگوفہ بیگم۔۔ورنہ ہمیں ہی کچھ کرنا پڑے گا۔۔ایسے بھی ابھی ہم جوان لگتے ہیں۔۔اور ویسے بھی وہ تمہاری خدمت کرے گی۔۔اور جیسے تیسے میں نبھالوں گا۔۔''

خرم خود کو آئینے میں اور دراصل شگوفہ بیگم کو دیکھ کر بولے جو آئینے کے اندر مسہری پر بیٹھی نظر آرہی تھی۔

''آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے۔۔؟ ویسے آپ سے کیا بعید ہے۔۔''

اس نے ایک نظر آئینے میں دیکھ کر گردن جھٹکی۔

''اچھا۔۔؟ ابھی بھی شکوک نے پیچھا نہیں چھوڑا آپ کا۔۔کتنے ثبوت دے دیے ہم نے وفا کے۔۔ہمیں کوئی آپ جتنا خوبصورت نظر نہیں آتا ورنہ۔۔''

''نظر نہیں آتا۔۔کسی اور سے کہیئے جاکر۔۔خیر میں سنجیدہ بات کرنا چاہتی ہوں اور آپ۔۔''

''سنجیدہ بات۔۔اچھا اب بتایئے اگر سچ مچ ہی ہمیں وہ آپ کی رشتے کی بہن جس کی ہم نے بھول سے ایک بار تعریف کردی تھی، پسند آجاتی اور ہم آپ کو آئے دن خدانخواستہ طلاق کی دھمکیاں دیتے رہتے تو آپ کی زندگی تو۔۔''

خرم اپنے بالوں میں کنگھا کرتے ہوئے بیگم کی طرف پلٹے۔

''جہنم ہو جاتی۔۔ٹھیک سمجھا آپ نے۔۔مگر ہم جہنم میں رہنے کے قائل نہیں ہیں۔۔یہ آپ بھی جانتے ہیں۔۔ہم نے راستے الگ کرلئے ہوتے۔۔''

شگوفہ بیگم کا لہجہ سخت سا ہو گیا۔

''دیکھیے اس ذکر سے ہی آپ ٹینس ہو جاتی ہیں۔۔خدا کا شکر ہے کہ آپ کا شوہر ایسا نہیں ہے۔۔سوچیے اگر سچ مچ ہی کسی کے ساتھ ایسا ہوتا ہو تو اس کا کیا حال ہو جائے گا۔۔''

''زندہ درگور ہو جائے گی۔۔''

شگوفہ نے پاؤں سمیٹ لئے اور پیچھے ہو کر تکیہ درست کرنے لگی۔

''ہاں آپ نے بالکل سچ کہا۔۔ایسا ہی ہوا تھا۔۔''

''کب۔۔؟ کس کے ساتھ۔۔ کس کی بات کر رہے ہیں آپ۔۔؟''

خرم نے کنگا میز پر رکھ دیا اور ایک لمبی سانس لیتے اس کے برابر آ بیٹھے۔

خورشید عالم نے گھٹنوں تک آ رہے لمبے سفید جوتے کرسی کے قریب اتار کر اوور کوٹ کرسی کی پشت کو گویا پہنا سا دیا۔ اور چائے کی میز کی طرف دیکھتے ہوئے ایک نظر آتش دان میں سلگتے ہوئے انگاروں کی طرف ڈال کر کھانے کی کرسی پر آ بیٹھتے۔

''تو کوئی فائدہ نہ ہوا تمہیں باہر بھیجنے کا۔۔''

انہوں نے سر جھٹک کر، چائے بنا رہی بیگم کی طرف نظر اٹھائی اور سامنے کی کرسی پر بیٹھے اپنے صحت مند جوان بیٹے کو دیکھ کر سر جھکا لیا۔

''نقصان ہی ہوا الٹا۔۔''

بیگم خورشید اُداسی سے بولیں۔

''کہاں کمی رہ گئی ثاقب۔۔ قصبے کے اہم اور اکلوتے مشن سکول میں تمہیں تعلیم دلوائی۔۔ سینٹ جوزف میں۔۔ آکسفرڈ بھیجا۔۔ کیوں تمہارا پڑھائی میں دل۔۔''

''آکسفرڈ نہیں کیمبرج ابا جی۔۔''

ثاقب جانتا تھا کہ موضوع بدلنے کا یہ ہی یک کارگر طریقہ ہے۔۔''

''دونوں اہم ہیں۔۔ کیمبرج اسی کی اصل میں ایک شاخ ہے۔۔ اور تم۔۔ لندن کی سب سے پرانی یونیورسٹی آکسفرڈ میں جس کے والد نے تعلیم حاصل کی ہو اس کی پہلی اولاد اس عمر تک آ کر بھی چھوٹے بچوں کی طرح پڑھائی سے جی چرائے۔۔ اور۔۔''

خوشید عالم پیالی کو چھو کر رہ گئے۔

''کتنی پرانی ہوگی یونیورسٹی ابا جی۔۔ کوئی۔۔؟''

''لیجئے۔۔ یہ موضوع کو کیسے۔۔''

وہ بے بسی سے بیگم کی طرف دیکھ کر بولے۔

''نہیں ابا جی میں واقعی جاننا چاہتا تھا۔۔ کوئی گیارہویں صدی کہتا ہے کوئی بارہویں۔۔''

ثاقب بھی ماں کی جانب گویا بے بسی سے دیکھنے لگا۔

''اب جو بھی ہے۔۔کوئی۔۔ابھی پچھلی صدی میں تمہاری پیدائش سے کوئی صدی بھر قبل۔۔ یعنی۔۔ سن ۱۸۲۳ میں اس کی یونین۔۔آکسفرڈ یونین بننے کے بعد سے۔۔بننے کے بعد۔۔جانتے ہو بڑے بڑے لیڈر اور Nobel Laureates پیدا کئے ہیں اس نے۔۔''

''پہلے بہت جھگڑے ہوا کرتے تھے ناتعلیم کو لے کر وہاں۔۔چرچ کی تعلیم کے خلاف سمجھتے تھے لوگ یونیورسٹی میں پڑھنے کو۔۔اور سٹوڈنٹس کے ساتھ بھی ہوئے تھے نا جھگڑے۔۔؟''

''ہاں۔۔بند ہونے سے بچانا پڑا تھا بڑی مشکل سے منتظمین کو اسے۔۔مگر یہ تو ہمیشہ ہی سماج میں ہوتا ہے۔۔کوئی نئی چیز اپنے ساتھ متضاد خیالات تو لاتی ہی ہے۔۔اور جیت ہمیشہ صحیح بات کی ہوتی ہے۔۔مگر تعجب ہوتا ہے۔۔وہ علمی ماحول۔۔وہ سبزہ زار۔۔وہ چناروں جیسے میپل ٹریز۔۔وہ کشادہ باغات۔۔وہ پرشکوہ عمارتیں۔۔کلس۔۔گرجے۔۔راستے۔۔کوئی تمہیں تعلیم کی طرف راغب نہیں کر سکا۔۔کتنا شوق تھا مجھے تمہاری اسناد میں تاج پر رکھی کھلی کتاب کے دونوں صفحات پر مزید دو تاج سنبھالے علم کی دنیا کا وہ بے مثال نشان دیکھنے کا۔۔اپنے جیسا۔۔یا ایسا ہی کوئی اور اہم نشان۔۔ ایک پورا شہر۔۔ایک پورا تعلیمی شہر۔۔ایک پوری علمی کائنات بھی تمہیں تعلیم کی طرف راغب نہ کر سکی۔۔اور آخرِ کار تم نے فیصلہ ہی کر لیا کہ۔۔''

انہوں نے مکھن لگی مکئی کی روٹی کا ادھ چبا ٹکڑا کلے میں دبائے جواب دیا اور پھر اسے عجلت سے نگل کر بیٹے کی جانب غصے سے دیکھنے لگے۔۔مگر تم۔۔یہ بچوں کے سے سوالات پوچھ کر میرا اور اپنا وقت کیوں ضائع کرتے ہو۔۔مجھے یہ بتاؤ کہ یہ اتنی جائداد۔۔یہ امپائر جو میں نے کھڑی کی ہے اسے۔۔ اسے کس کو سونپ کر جانا چاہتے ہو تم۔۔وہ دونوں تو بہت چھوٹے ہیں۔۔تم بڑے ہو۔۔کتنی امیدیں وابستہ تھیں تم سے میری۔۔''

انہوں نے گردن خم کر کے ہاتھ میز پر اوندھے رکھ دئے اور بیٹے پر نظریں مرکوز کر لیں۔

''اچھا آپ۔۔آپ کا دل لگتا ہے یہاں۔۔سچ بتائیے ابا جی۔۔میں۔۔؟''

''نہ لگتا تو میں یہاں آ کر کیوں بس جاتا۔۔گرم خطے کا باشندہ ہو کر بھی۔۔یہ جگہ مجھے لندن سے کم نہیں معلوم ہوتی مجھے۔۔یہ ہماری اپنی سرزمیں ہے۔۔اور پھر کمی کیا ہے۔۔کس بات کی کمی ہے۔۔ ایسے باعزت عہدے پر فائز ہوں۔۔گھربار زمینیں باغ سب یہاں ہے۔۔اور یہ سب مجھے ساتھ نہیں لے جانا۔۔اور تم۔۔کیسے سمجھاؤں تمہیں میری سمجھ میں نہیں آتا۔۔''

''مگر مجھے۔۔مجھے۔۔یہاں رہنا اچھا نہیں لگتا ابا جی۔۔اگر اس سب کو بیچ کر ہم لندن میں بزنیس کریں اور کسی لارڈ کی طرح رہیں۔۔''

اس نے بالکل بچوں کی طرح کہا۔

''چپ رہو۔۔میں نے تمہیں اوکسفرڈ کاروبار کے لئے نہیں تعلیم کے لئے بھیجا تھا۔۔میری موت کے بعد ہی۔۔تم۔۔تم۔۔اور لارڈ۔۔یوں ہی نہیں بن جاتا کوئی۔۔بغیر محنت اور عزت کمائے لارڈ۔۔تم میں یہ دو چیزیں ہیں؟۔۔تم۔۔؟''

خورشید عالم کھانسنے لگے تو بیگم نے غصے سے بیٹے کی طرف دیکھا۔وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

''سوری۔۔میں۔۔''

اس نے باپ کی طرف نظر اٹھا کر جھکا لی۔

''دور ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے۔۔مجھے شک ہے کہ۔۔کہ۔وہاں تم۔۔''

وہ کچھ کہتے ہوئے رک گئے اور کمرہ چھوڑ کر جاتے ہوئے بیٹے کی جانب دیکھتے بیگم کی طرف پلٹے۔

''اس نے کہیں شادی تو نہیں کر لی وہاں۔۔میں نے اسے غلط کیا بھیج کر۔۔اس کا تو کبھی تعلیم میں دل ہی نہیں لگتا تھا۔یہیں باغ واغ سنبھالتا۔۔اب تو یہ ہاتھ سے نکل ہی۔۔''

''نہیں خدا نہ کرے۔۔کچھ بھی ہو وہ شادی نہیں کر سکتا وہاں آپ کی مرضی کے بغیر۔۔بھانجی میری منگیتر ہے اس کی۔۔جانتا نہیں کیا۔۔آپ بھی کہاں کی سوچنے لگ جاتے ہیں۔۔''

''غصے میں۔۔میں۔۔میں کہیں اسے عاق۔۔''

''کیا کہہ رہے ہیں یہ آپ۔۔سن لے گا تو چلا جائے گا ناراض ہو کر۔۔پھر کیا کریں گے اس سب کا۔۔دیوانے ہو جائیں گے ہم دونوں۔۔ابھی بھی باہر جاتا ہے تو کیا میری طرح آپ بھی چپکے چپکے روتے نہیں رہتے۔۔؟بھوک مر جاتی ہے ہماری۔۔ہول پڑنے لگتے ہیں ہم لوگوں کو۔۔اپنی اولاد آنکھوں سے اوجھل کی جا سکتی ہے اپنی مرضی سے۔۔؟یہ تو ہم نے اس کی بہتری کے لئے کلیجے پر پتھر رکھ لیا تھا۔۔اب آ گیا ہے تو۔۔مہینوں کے سمندری سفر سے۔۔''

بیگم کی آواز آنسوؤں سے نم ہو گئی۔خورشید عالم کی آنکھوں میں بھی پانی سا بھر آیا۔مگر اگلے لمحے وہ پیالی اٹھا کر پُرسکون سے چائے پیتے نظر آنے لگے۔

''ٹھیک کہتی ہو۔۔ہماری تو جان ہی اس میں بستی ہے۔۔ہم کیا کر سکتے ہیں۔۔مگر ایک بار

اس سے پوچھ لیں کہ کہیں اس نے وہاں کسی سے شادی۔۔''

''آپ کو لگتا ہے کہ ایسا۔۔میں پوچھوں گی۔۔نہیں پہلے اپنے طریقے سے معلوم کروں گی۔۔''

''جیسے۔۔؟''

''جیسے کہ پیار سے دلار سے۔۔کوئی آپ کی طرح اعلانِ جنگ کر کے نہیں۔۔''

اگلی صبح جب ثاقب گھڑ سواری کے لئے اپنے باغوں کی جانب نکل گیا تو اس کی والدہ اس کے کمرے سے دھونے والے کپڑے لینے گئی۔

مسہری پر پڑے کوٹ کی جیب سے ایک والیٹ جھانک رہا تھا جس میں اور چیزوں کے علاوہ ایک تصویر بھی نظر آئی۔اس کا حسین وجمیل لڑکا اپنے سے کچھ لمبی لڑکی کے ساتھ کھڑا تھا۔لڑکی کے شانے اس کے کشتی بیٹے کے شانوں سے کچھ زیادہ کشادہ تھے اور کمر تک چست،گھیرے دار گاؤن جیسے لباس میں بھی اس کی کمر کا خم نہایت مبہم نظر آتا تھا۔جیسے کسی لڑکے کی کمر ہو۔لڑکی کے ہنستے ہوئے دانتوں کے اطراف اس کے چربی سے نابلد چہرے پر دو دو لمبی کمانیں سی بنی تھیں۔سیاہ سفید تصویر میں اس کی آنکھوں کی پتلیوں کی سیاہی نسبتاً کم تھی اور ہلکے رنگ کے ترشے بالوں کے ساتھ میل کھا کر کچھ جاذبیت عطا کر رہی تھی۔

'گورا رنگ تے بلیاں اکھاں۔' بیگم خوشید نے خالص پنجابی لہجے میں گویا اپنے آپ سے کہا۔

'کیا بات نظر آ گئی میرے بیٹے کو۔۔تجھ میں۔۔مگر اس کے باپ نے بھی تو ہمیشہ حسن کا معیار اسی پیمانے سے ماپا تھا۔۔'

انہوں نے سوچا۔

'ہمیشہ کہتے میمیں گوری ہوتی ہیں بہت۔۔ہاں مگر انہوں کبھی یہ نہیں کہا کہ حسین ہوتی ہیں۔۔خیر اپنی اپنی پسند۔۔مگر یہ بیٹا میرا۔۔بالکل اچھی نہیں لگتی اس کے ساتھ۔۔گندمی سے ہیں ہم۔۔اور وہ بھی گہرے گندمی نہیں۔۔مگر نین نقش تو ان سے کہیں۔۔مطلب اس سے کہیں اچھے ہیں۔۔اچھے نین نقش وہاں بھی ہوتے ہوں گے۔۔اب اسے یہ ہی پسند آ گئی۔'

وہ ذرا اونچی آواز میں بولنے لگیں۔

'مگر اس کے ابا تو۔'

بیگم خوشید کا دل ذرا سا گھبرایا۔

اب تو اسے روکنا ہی ہوگا۔'

وہ کچھ اور اونچی آواز میں بولیں۔

'نہیں ۔۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا۔۔ منہ پھٹ اور صاف گو بیٹے نے کہہ دیا ہوتا کہ شادی کر لی ہے۔۔ ابھی صرف پسند کیا ہوگا۔۔'

باہر سے جمال بٹ کی کلہاڑی کے لکڑیوں پر چلنے کی آواز آ رہی تھی جو بہت سویرے سے چولہے، حمام اور آتش دانوں کے لئے لکڑی کا دوسرا ڈھیر لگانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس بار سردیوں نے کچھ طوالت پکڑ لی تھی۔ چالیس روز پر مشتمل سردی کے دنوں کا بڑا حصہ 'چلۂ کلاں' گزر چکا تھا اور قاعدے سے بعد کے 'چلۂ خورد' کی سردی میں اس قدر شدت نہیں ہونا چاہیئے تھی۔ مگر ایسی کوئی بات فی الحال نظر نہیں آ رہی تھی۔

ٹھک ٹھک۔ ٹھیک ٹھاک۔ ٹھک ٹھک۔

بیگم خورشید کو لکڑی چیرنے کی آواز ہمیشہ اسی طرز میں سنائی دیا کرتی تھی۔ آواز کچھ دیر کے لئے بند ہوئی تو ان کے کان باہر کی طرف لگ گئے۔ جمال بٹ نے گھاس سے بُنے جوتوں کے اندر بھیڑ کے اون سے کاتے گئے موٹے کپڑے کی چوڑی سی پٹیاں بنا لی تھیں اور انہیں اپنے گھٹنوں تک لپیٹ رکھا تھا۔ کلہاڑے کے لکڑی سے ٹکرانے کی ضرب نے بھی زمین پر کانچ کی تختی کی طرح بچھی جمی ہوئی سخت برف کا کچھ نہیں بگاڑا تھا جب کہ کل بھی جمال بٹ اسی مقام پر لکڑیاں چیر تا رہا تھا۔

بیگم خورشید کی آنکھوں میں باہر کا منظر گھوم گیا۔

کانگڑی سینکنے کے بہانے چلم سلگائے گا اب یہ۔ اور پھر باورچی خانے کے پچھلے صحن کی صفائی آج بھی رہ جائے گی۔ اگر یہی رفتار رہی جمال بٹ کی تو۔ کتنا خراب لگتا ہے جمی برف پر لکڑی کا چورا سا گرا ہوا۔ جیسے صفائی ہی نہ ہوئی ہو۔ پھر زیبا کتنی مشکل سے سمیٹ پاتی ہے لکڑی کے ڈھیر کی طرف یہ چورا۔ بیگم خورشید نے ہونٹوں کو سکیڑ کر دائرہ سا بنایا اور گردن دو ایک بار نفی میں ہلائی۔

کب اٹھائے گا اس ڈھیر کو۔ اور برادے کی کوٹھری کے چھجے کی آڑ میں چار چار کر کے تہہ در تہہ لگائے گا سوکھنے کے لئے۔ یہ کام چور۔ اگر اور برف گری تو کہاں چیرے گا لکڑیاں پھر۔ سارے شیڈ میں بغیر چیری لکڑیاں بھری ہیں۔ برآمدہ تھوڑی تڑوانا ہے۔

بیگم خوشید نے سر جھٹکا تو کلہاڑے کی آواز پھر کانوں میں پڑنے لگی۔ اور ساتھ ہی پتھر کی ایک ایک سل سے تراشے گئے کشادہ زینے پر زیبا کے ننگے پیروں تیز تیز چلنے کی آواز سنائی دی۔ یعنی کپڑے

لینے زیبا اوپر آ رہی تھی۔

ٹھاک ٹھاک۔ ٹھیک ٹھاک۔ ٹھک ٹھک۔

باہر سے آواز سنائی دی۔

'ٹھیک ٹھاک۔ سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ کچھ نہیں بگڑا۔'

ہر حال میں خوش رہنے کو ترجیح دینے والی بیگم خورشید خوش دلی سے مسکرائیں۔

''میں نیچے ہی لا رہی ہوں کپڑے زیبی۔ تم مت آؤ۔''

انہوں نے پکار کر کہا کہ کون جانے پتنگ ایسی نازک اور ڈور ایسی لچکیلی زیبی، جسے اس کے ساتھ ہاتھ بٹانے والی پہاڑن بی بو نے، دھان کوٹتے وقت نظر بچا کر بار بار ثاقب کی کھڑکی کی طرف دیکھتے دیکھا تھا، سچ مچ ہی ثاقب سے بات کرتی ہو اور اسے بتادے کہ میں اس کے والیٹ میں کچھ دیکھ رہی تھی۔

یہ ثاقب میاں بھی اسی کے ہاتھوں کی لسی پسند کرتے ہیں۔ کیوں بھلا۔ کیا بی بو نے سچ کہا تھا۔؟ نہیں نہیں۔ ایسا نہیں ہوگا۔ خیر۔ مگر ایسا ہوگا نہیں۔ یہ تربیت نہیں ہے ہمارے بچوں کی۔ بیگم خورشید کے ماتھے پر ایک آدھ بل سا کھنچ آیا۔

''اچھا بی جی۔۔''

زیبا نے بھی پکار کر کہا۔ اور اس کے ننگے پیروں زینہ اترنے کی تیز تیز آواز آئی۔

بیگم خورشید نے نفی میں سر ہلایا اور ماتھے سے بل یک سر غائب ہو گئے۔

'تیرے سے تو میری زیبی اچھی ہے بے چاری۔ جو اس سردی میں ننگے پاؤں کام کرتی ہے میرا اتنا۔ اس جمال بٹ سے کہوں گی اپنی بیٹی کے لئے بھی بن دے دو چھوٹے چھوٹے جوتے گھاس کی بل کھائی رسیوں کے پُولہے۔ مگر اِسے تو جیسے سردی ہی نہیں لگتی۔ پچھلے دنوں اپنے سلیپر دیے تھے اسے۔ جانے کہاں پڑے ہوں گے۔'

بیگم خورشید نے زینے کی طرف نظر ڈالی اور واپس تصویر کی کو دیکھنے لگیں۔

زیبی سے ہی نہ پھر بیاہ کر دوں اپنے بیٹے کا۔ کاشتکار کی بیٹی سے۔ تجھ سے بہتر جچے گی اس کے ساتھ۔

یہ ایک جملہ بیگم خورشید نے ہونٹوں سے ادا نہیں کیا۔

'خیر یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'

انہوں نے پھر اپنے آپ سے بات کی۔

'یہ بھی کوئی مسئلہ ہے۔ بڑے بڑے مسئلے حل کیئے ہیں تو نے رشیدہ بانو، اس چھوٹی سی زندگی میں۔ اللہ کے فضل سے۔ اب اس کے ابا جی کو یہ بات سنا کر پریشان ہونے سے بچانے کے لئے جلدی سے نسخہ بھی سوچنا اور بتانا ہوگا۔ باپ بیٹا دونوں بچے ہیں اس گھر میں۔ ایک میں ہی بڑی ہوں۔ پیدائشی بڑی۔

'نی مائیں تیری شیداں تے پیدا ہی وڈی ہوئی سی۔'

سیالکوٹ کی پنجابن بیگم خورشید ہمیشہ پنجابی میں سوچا کرتیں اور اپنے آپ سے پنجابی ہی بولتیں کہ اور کسی کے ساتھ وہ گھر میں پنجابی نہیں بولتی تھیں۔ میاں انگریزی اور اردو بولنا اور سننا پسند کرتے تھے۔ کبھی کبھی پنجابی میں گنگنا ضرور لیتے۔ بس ایک آدھ مصرعہ۔ بیگم کان آواز پر لگا دیتیں کہ ذرا اور گا لیں۔ مگر وہ ایسے خاموش ہو جاتے کہ صاف ظاہر ہوتا پچھتا رہے ہیں۔ لیکن مادری زبان میں سنی لوریاں اور لوک گیت ہی تو ساری عمر یاد رہتے ہیں انسان کو۔ کتنا بھی اردو داں اور انگریز ہو جائے وہ۔ بیگم خورشید نے زیرِ لب کہا اور گنگنانے لگیں۔

'کھیڈن دے دِن۔۔ چار نی مائیں۔۔ گھر بابل دے مڑ کے نئیں آنا۔۔ وسر گیا گھر بارنی مائیں۔۔ بسر گیا گھر۔۔ کھے اے۔۔ اے۔ اے ڈن دے۔۔ کھیڈن دے دن چار نی مائیں'

خود باپ بن جانے کے بعد ثاقب خورشید نے اپنے بیٹے کے سامنے یہ نغمہ گنگناتے اور اپنی والدہ کی باتیں کرتے ایک دن بتایا تھا کہ کیسے ابا جی پر فالج کا حملہ ہوا تھا اور وہ خود ولایت نہیں جا سکے تھے۔ اماں جی نے ایک بار پوچھا بھی تھا کہ کہیں وہ مجبوراً تو نہیں رک گئے باپ کو بیمار دیکھ کر، مگر ثاقب نے نفی میں سر ہلا دیا تھا اور اپنی خالہ زاد سے شادی کر لی تھی۔

''کہ تم کو دنیا میں آنا تھا۔۔''

وہ محبت سے بیٹے کے چہرے کو نہارتے اور اسے مضبوط بازوؤں میں اٹھا کر گھما دیتے۔ پھر بڑے سُر میں گانے لگتے۔ ایسے ہی جیسے انہوں نے اماں جی سے سنا تھا۔

'کھیڈن دے دن چار۔۔ نی۔۔ مائیں۔۔'

خالہ زاد سے شادی کرنے کی مجبوری کا دبا دبا سا غصہ ابا جی کی موت کے بعد بیوی پر ظاہر ہونے لگا تھا کہ خرم نے بچپن میں کئی بار انہیں ماں صاحب سے یہ کہتے سنا تھا کہ اچانک سب کچھ چھوڑ کر وہ بہت جلد ولایت جا کر اُس فرنگن سے شادی کر کے اسے یہاں لے آئیں گے۔

''اور ماں صاحب اس خوف سے اکثر روتی نظر آتیں۔انہوں نے ابو کی خوشنودی میں کوئی کثر نہیں چھوڑی تھی۔وہ آتے تو میرا رونا تک بھول کر ان کی خدمت میں لگ جاتیں۔۔حالانکہ ابو میں کوئی ایسی خوبی نہیں تھی۔دادا حضور کی جائداد کا انہوں نے بیشتر حصہ فروخت کر دیا تھا اور یہ سلسلہ ان کی زندگی تک جاری رہا۔ماں صاحب نے کتنے دکھ اٹھائے ہیں شگوفہ بیگم۔۔تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔۔''

خرم دراز ہو گئے۔شگوفہ بیگم آہ بھر کر رہ گئیں۔

''ایسا ہوا ماں صاحب کے ساتھ۔۔اور مجھے کوئی خبر ہی نہیں۔۔کتنے ضبط سے جی ہوں گی ماں صاحب۔۔''

شگوفہ بیگم نے دھیمی سی آواز میں کہا۔

''اسی لئے تو چاہتا ہوں کہ ہر خوشی ان کے قدموں میں ڈال دوں۔۔''

''ہاں یہ ان کا حق بھی بنتا ہے۔۔مگر ابھی اللہ نے دو سال قبل حج کی سعادت عطا کی ہے نا۔۔''

''جانتی ہو۔۔اُس بارگاہ سے کسی کا جی نہیں بھرتا شگوفہ۔۔خدا بہتر جانتا ہے جب سے آیا ہوں وہی منظر آنکھوں میں گھوم رہا ہے۔۔آنکھیں بھر آتی ہیں۔۔دل تڑپ تڑپ اٹھتا ہے کہ ایک بار پھر کسی طرح۔۔کسی طرح ایک بار جا کر۔۔جان وہیں نکل جائے میری۔۔سچ شگوفہ یہ تجربہ ایسا روحانی سفر ہے کہ دنیا کے معنی صفر ہو جاتے ہیں۔۔تم گئی ہوتیں تو یہ بات ہی نہ۔۔''

''مگر وقت۔۔حالات۔۔اور حکم بھی یہ ہی ہے کہ فرائض سے سبک دوش ہو کر۔۔اور پھر خود وہاں کی سرکار نے کہلوایا ہے کہ جنہیں اللہ نے یہ موقع نصیب کیا وہ دوسروں کو موقع دیں۔۔بار بار جانے کی جگہ ایک بار جا کر ان کا بھی خیال کریں جو کبھی نہیں گئے۔۔کبھی بھیڑ بھی اتنی ہو جاتی ہے کہ بعض لوگ کچلے بھی گئے ہیں۔۔اور کمزور سی ماں صاحب کی جان۔۔یہ ثواب نہیں کہ کسی اور کو جانے کے لئے رقم دی جائے اگر ایسا ہی ہے تو۔۔؟۔۔یا کسی غریب کی مدد کی جائے۔کسی یتیم لڑکی کے بیاہ پر خرچ کئے جائیں۔۔''

''یہ عشق حقیقی ہے جناب۔۔عشق نہیں مانتا یہ عقل کی باتیں شگوفہ بیگم۔۔''

''اور اس کے اخراجات۔۔وہ بھی تو ایک پہلو ہے سوچنے کے لئے۔۔جو بچ رہا ہے کچھ کہیں بنکوں میں۔۔نکال دیجئے اور ماں بیٹا عمرہ کر آیئے۔۔آگے کا خدا مالک ہے۔۔ہے نا۔۔''

''تم اس قدر پریشان نہ ہو۔۔ایسا بڑا خرچہ نہیں ہے۔۔''

''مگر کچھ ایسی رقم ہے نہیں۔۔دیکھ لیجئے نا۔۔جا کر۔۔جوائنٹ تو ہے اکاؤنٹ ہمارا۔۔

زمینوں کی سالانہ انکم کا زمانہ تو چلا گیا نا۔۔ کاروبار ہے نہیں۔۔۔ لے دے کر تنخواہ ہی تو ہے۔۔ پھر بچوں کے بڑا ہوتے اخراجات کیسے پر لگاتے ہیں یہ آپ کو بیٹی کی شادی کے بعد بھی اندازہ نہیں ہوا۔۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ آپ ایسے لاپرواہ۔۔''

''ٹھیک ہے مگر۔۔ ماں صاحب کتنے دن جئیں گی۔۔ سوچتا ہوں۔۔ ایک پالیسی لی تھی۔۔ قیصر کی تعلیم کے لئے۔۔ وہ میچور ہونے والی ہے۔۔ اور ابھی کوئی اور ایمر جنیسی نہیں ہے۔۔ میں نہیں جاؤں گا۔۔ کچھ دیکھتا ہوں۔۔ یہ بھی ضروری ہے۔۔ خیر تم خود کو پلیز پریشان نہ کرو۔۔ یہ سب میری ذمہ داری ہے۔۔''

''آپ کے ذمہ ہے۔۔ وقت پر بات سمجھتے نہیں۔۔ بعد میں مہینوں بعد کہتے ہیں کہ تم ٹھیک کہتی تھیں۔۔''

شگوفہ بیگم دوسری طرف دیکھ کر بولیں۔

''وہ تو ہے جناب۔۔''

خرم ہنسے اور اٹھ کر غسل خانے میں چلے گئے۔

خرم کے دفتر کے ایک ساتھی اور ان کی بیگم جا رہے تھے۔ محرم کا مسئلہ حل ہو گیا۔

ماں صاحب خوش خرم لوٹیں مگر کمزور ہو گئی تھیں۔

رفتہ رفتہ ماں صاحب اور کمزور ہوتی گئیں۔

ان کے روز و شب حسب معمول ویسے ہی رہے۔ صرف بینائی کم ہو گئی تھی۔ ایک آنکھ میں موتیا بند اتر آیا تھا مگر ابھی پختہ نہیں ہوا تھا کہ آپریشن کیا جائے۔ گو کہ اب کچھ پہلے بھی آپریشن کیا جانے لگا تھا۔ مگر ماں صاحب نے خود ہی کچھ دیر انتظار کرنا مناسب جانا۔

قیصر ولایت چلا گیا تھا۔ اور کچھ خوش نہیں تھا۔

''یہاں کے لوگوں کو اپنے علاوہ کوئی دوسرا اپنے ملک میں پسند ہی نہیں ہے۔۔ بہت ساروں کو تو مذہب ہی شکایت کا سبب نظر آتا تھا۔۔''

''ہاں بیٹا۔۔ لیکن آپ کے کالج کی لیول میں تو ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔۔ پھر آپ کوئی نوکری کرنے تھوڑی گئے ہیں۔۔ دو سال کی بات ہے۔۔''

''ہر جگہ ایسا ہی ہے مام۔۔ کہیں کم کہیں زیادہ۔۔ میں خوش نہیں ہوں یہاں۔۔''

قیصر کی بجھی ہوئی آواز آئی تو شگوفہ کے دل کا شگوفہ یکلخت مرجھا گیا۔وہ خود ضبط کئے بیٹھی تھی کہ قیصر کے جانے کے بعد گھر میں صرف ماں صاحب کے کراہنے کی آوازیں آتیں۔۔کوئی قہقہہ کم کم ہی کانوں میں پڑتا۔خرم بھی خاموش سے ہو گئے تھے۔اور شگوفہ پر چڑچڑے پن کا الزام تھا۔

''جہاں یہ مہینے گزرے۔۔باقی بھی گزر جائیں گے میری جان۔۔۔یہ ڈگری تمہارے بہت کام آئے گی یہاں۔۔بس تم وہاں مت رہ جانا دوسروں کی طرح۔۔نہیں تو مر ہی جاؤں گی میں بیٹا۔۔''

''نہیں مام سوال ہی نہیں۔۔۔میں کسی سہولت کے لئے اپنے وقار سے سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔۔ دادی جان کہتی ہیں نا۔۔''

''ہاں بیٹا انہوں نے ہی تمہارے اس خواب کی تعبیر یہ نکالی تھی نا کہ تم بہت اونچی تعلیم حاصل کرو گے اور بڑے عہدے پر فائز ہو گے۔۔''

''ہاں۔۔وہ جب میں نے ایک دن صبح اٹھ کر انہیں خواب سنایا تھا۔۔جس دن میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ میں ایک ہرے بھرے باغ سے گزر رہا ہوں جس میں بے شمار چھوٹے پودوں کی قطاریں ہیں اور ان پودوں پر زرد رنگ پھول کھلے ہیں اور سارا ماحول خوشبو سے بھرا ہے تو انہوں نے کہا تھا کہ یہ تم نے زعفران کے کھیت دیکھے ہیں اور اتنی اچھی تعبیر نکالی تھی۔۔۔ہے نا مام۔۔''

''ہاں بیٹا۔۔تمہیں یاد بھی کرتی ہیں وہ۔۔کبھی تمہارا نام لے کر بلاتی ہیں اور پھر کسی اور کو بلانے لگتی ہیں۔۔''

''آئی مِس ہر ٹو۔۔مگر میں اداس ہو جاتا ہوں۔۔جی کرتا ہے بھاگ کر آ جاؤں۔۔''

''نہیں بیٹا۔۔ایسا مت کہونا۔۔''

''نہیں ماما۔۔ڈونٹ وری۔۔۔ابھی نہیں آؤں گا۔۔بس اگلی چھٹیوں میں۔۔یعنی چھ مہینے بعد۔۔یعنی پچاس بار شیمپو کرنے کے بعد۔۔ہے نا مام۔۔''

اس کی آواز میں ہنسی کی گونج سنائی دی تو شگوفہ بیگم کی آنکھیں بھر آئیں۔

''ہاں میرے بچے۔۔''

اس نے آواز کو بھیگنے نہیں دیا۔

وہ فون کے پاس سے اٹھ کر برآمدے میں آ گئی۔

ناز و نعم سے پلے بچے جانے کن خوابوں کے لئے یا والدین کی خوشی کے لئے وہاں ڈگریاں

لینے تک جاتے ہیں۔ قیصر کہتا تھا کہ وہ ان کی سخت جانی دیکھ کر حیران بھی ہوتا ہے اور پریشان بھی۔ کبھی جان کا خطرہ، کبھی مال کا۔ اور ہر وقت بے سبب بے عزت ہونے کا نفسیاتی تناؤ۔

شگوفہ برآمدے میں آہستہ آہستہ ٹہلنے لگی۔ خرم آیا تو اس نے اس بارے میں اسے کچھ نہیں بتایا۔

قیصر کی تعلیم زور و شور سے جاری تھی۔ اس کے کھاتے میں بار بار رقم جمع کرنا ہوتی تھی۔ جو دوسرے ملک کی کرنسی میں بدلنے کے بعد خاصی کم ہو جاتی تھی۔ گو کہ اب ڈالر روپے کی نسبت پہلے سے کچھ سستا بھی ہوا تھا۔ مگر پھر بھی وہ بات نہ تھی۔ خرم کا عہدہ مزید اونچا ہو گیا تھا۔ مگر روز روز کی مہنگائی اور عجیب عجیب اخراجات نے کسی قسم کی مثبت تبدیلی محسوس ہی نہ ہونے دی۔

اس دن دیر تک قیصر سے انٹرنیٹ سے رابطے میں بہت سی باتیں ہوئیں تھیں۔ شگوفہ اسے ویب کیم میں کبھی ہاتھ دکھانے کو کہتی تو کبھی پیر۔ کبھی سر کے پیچھے بال دیکھنا چاہتی کہ تناؤ سے اڑ تو نہیں رہے۔ اور کبھی ماتھے سے بال پیچھے کروا کر کہ پیشانی بھی ویسی ہی ہے نا جیسے پہلے تھی۔ اور خرم بھی ان سب باتوں سے محظوظ ہوتے رہے۔ کھانے کی میز پر سب ہشاش بشاش لگ رہے تھے۔ قیصر کے جانے کے بعد رفتہ رفتہ گھر کے لوگ اس کی غیر حاضری کو قبول کرنے پر آمادہ نظر آتے تھے۔

''میرے پاس کچھ رقم ہے بیٹا۔ تھوڑی تم مدد کر دو تو۔۔ میں عمرہ کر آؤں۔۔''

خرم کھانا ختم کرنے کے بعد بھی میز پر ہی بیٹھا رہتا تھا کہ جب تک ماں صاحب کھانا ختم نہ کر لیتیں۔ میز سے واش بیسن کی طرف جاتی شگوفہ کے قدم پل بھر کو ٹھٹھک کر تھم گئے پھر آگے بڑھنے لگے۔ مگر ٹھٹھک کر چلنے کے بعد رفتار غیر ہمواری ہو گئی تھی۔

''ماں صاحب بھی۔۔''

خرم اندر آیا تو شگوفہ شب خوابی کا لباس پہن کر مسہری کے کنارے پر بیٹھی تھی۔

''ابھی تک سوئیں نہیں۔۔''

خرم نے بات کاٹی اور الماری کی جانب بڑھا۔

''آخر ماں صاحب کیوں نہیں سمجھتیں ہماری پریشانیاں۔۔ کتنے تو لونز لے رکھے ہیں ہم نے بینکوں سے۔۔''

''ہم نے کہاں لئے ہیں۔۔بینک والوں نے دیے ہیں ہمیں۔۔''

''وہ تو ان کا بزنس ہے۔ہم منع بھی تو کر سکتے تھے نا۔۔خیر اب جو بھی ہے۔۔لونز تو ہیں نا۔۔ اور ادا بھی کرنے ہیں۔۔باہر کتنا پیسہ بھیجنا ہوتا ہے۔۔انہیں کوئی۔۔''

''کیوں پریشان ہوتی ہو۔۔یہ معمولی باتیں ہیں۔۔ماں صاحب کوئی غیر تو ہیں نہیں۔۔ان ہی کی دعاؤں کے طفیل گھر پھل پھول رہا ہے۔۔جو ہے سب ان کا ہی تو ہے۔۔''

''وہ مگر ہماری ضروریات سے بھی تو واقف ہیں۔۔''

''تو انہوں نے ایسی کون سی بے پروائی دکھائی ہے۔۔ایک ہی تو شوق ہے ان کا۔۔اور پھر ان کے پاس ہیں پیسے اپنے بھی۔۔میں وہ خرچ نہیں کرنا چاہتا۔۔''

''ہاں جسے وہ صرف خود پر خرچ کرنا چاہتی ہیں۔۔''

''ایسی کوئی بڑی رقم نہیں ہوگی ان کے پاس۔۔تم بھی نہ۔۔اور اگر ہو بھی تو وہ سب ان کا ہے۔۔مجھے اتنی بھی سعادت نصیب نہ ہوگی کہ جس ماں نے ہر حال میں گھر کا وقار قائم رکھا۔۔ہمیں خود داری سے جینا سکھایا۔۔کتنی خوش اصلوبی سے ذمہ داریاں نبھائیں۔۔میں ان کے لئے اتنا سا کرلوں۔۔ ہمارے لئے کیا نہیں کیا انہوں نے۔۔''

''ہاں وہ تو ٹھیک کہتے ہیں آپ۔۔مگر ایک تھوڑا سا کنسرن ہوتا ہے اپنوں کی طرف۔۔ انہیں تو جیسے اور کچھ۔۔''

شگوفہ نے اپنی طرف والی میز کی بتی گل کردی۔

''ایسا نہیں ہے۔۔تمہارا ردِعمل زیادہ شدید ہے۔۔وہ بہت کنسرنڈ ہیں اپنی فیملی کے ساتھ۔۔ اور کون ہے ان کا ہمارے علاوہ۔۔''

خرم بولتے بولتے غسل خانے کی طرف بڑھا تو شگوفہ کی آواز کانوں میں پڑی۔

''اچھا پھر صحت ان کی دیکھئے۔۔ہڈیوں کا ڈھانچہ ہوگئی ہیں۔۔نظر آتا نہیں اچھی طرح۔۔ دانت بھی جو بچے ہیں جھول رہے ہیں کیا کھائیں گی۔۔کیسے کریں گی۔۔ہم تو ان کے کھانے کا خاص خیال رکھتے ہیں۔۔''

''اللہ مالک ہے۔۔وہاں سب ملتا ہے۔۔پھر وہ اپنی صحت کا خیال رکھنا ہم سے بہتر جانتی ہیں۔۔''

وہ غسل خانے میں گھس گیا۔

اس بار ماں صاحب نے خود ہی محرم تلاش کرلیا۔انہیں رشتے دار تقریبات میں بڑے اہتمام سے بلاتے لے جاتے تھے۔

''نادرہ کی بیٹی اپنے شوہر کے پاس سعودیہ جارہی ہے۔۔اسی کے ساتھ جاؤں گی میں۔۔اور پھر وہ بھی ساتھ ہوگا۔۔اس کا شوہر۔عمرہ کے وقت۔۔''

ماں صاحب نے ناشتے کی میز پر گویا خوشخبری سنائی۔

شگوفہ ملازم کو دوپہر کے کھانے کے لئے سمجھارہی تھی۔

''ظفر دودھ لے آؤ ماں صاحب کے لئے۔۔پہلے۔۔''

خرم نے گردن موڑ کر کہا۔

''چھ مہینے تک رہے گی وہ وہاں۔۔''

ماں صاحب نے مسکرا کر کہا۔

''کون نادرہ کی بیٹی۔۔اور آپ۔۔''

شگوفہ نے مڑکر دیکھا۔

''میں جلدی آجاؤں گی انشااللہ۔۔رمضان کے فوراً بعد۔۔''

''رمضان میں بڑی بھیڑ ہوگی وہاں ماں صاحب۔۔''

شگوفہ نے پھر گردن موڑی۔

''تو میں کون سا کسی غیر کے ساتھ ہوں گی۔۔نادرہ کی بیٹی ساتھ ہوگی۔۔''

''نادرہ کی بیٹی کا نام کیا ہے ماں صاحب۔۔''

شگوفہ نے مسکرا کر پوچھا تو خرم جلدی سے بولا۔

''اس کا نام نادرہ کی بیٹی ہے۔۔''

وہ زور سے ہنسا تو سب کی ہنسی میں برابر میں باورچی خانے کے اندر سے ظفر کے ہنسنے کی آواز بھی آئی۔ماں صاحب مسکرائیں۔

''سچ مچ مجھے تو پتہ ہی نہیں۔۔میری بھانجی کی نند کی بیٹی ہے۔۔وہاں سب اس کا ذکر اسی نام سے کرتے ہیں۔۔تو میں۔۔''

''فون پر پوچھتی ہوں ابھی ماں صاحب۔۔آپ فکر نہ کریں۔۔''

سفر کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔حج کے بعد سے ماں صاحب اپنا طواف والا لباس ساتھ رکھا کرتیں تھیں۔کہتیں بلاوا آئے گا تو اسی میں دفن ہونا ہے مجھے۔میری وصیت ہے یہ۔پہلا عمرہ بھی اسی میں ادا کیا۔اس دفعہ بھی ہی یہ لباس ان کے ساتھ تھا۔

کچھ دن بعد ماں صاحب نادرہ کی بیٹی کے ساتھ خیر خیریت سے سعودیہ پہنچ گئیں۔فون پر بات ہوئی تو خوش تھیں کہ صبح زیارت کے لئے جارہی ہیں۔دو دن بعد بات ہوئی تو آواز میں نقاہت صاف نمایاں تھی۔

''میں۔۔جلدی آؤں گی بیٹا۔۔اگلے بدھ کی فلائٹ ہے۔۔''

ماں صاحب نے رک رک کر کہا۔

''مگر آپ۔۔خیریت سے تو ہیں نا ماں صاحب۔۔''

خرم کی تشویش بھری آواز ابھری۔

''ہاں۔۔ٹھیک ہوں میں۔۔آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔''

ماں صاحب کی آواز میں عجب یاسیت تھی۔

''پھر اتنی کمزور کیوں معلوم ہو رہی ہیں۔۔''

خرم کو خیال آیا کہ ماں صاحب اداس بھی ہیں۔شاید اس لئے کہ اس دفعہ بھی ان کی دلی آرزو پوری نہ ہوئی تھی کہ وہ زندہ لوٹنا نہیں چاہتی تھیں وہاں سے۔

''ٹھیک ہوں بیٹے۔۔''

''ماں صاحب بتایئے نا کیا ہوا۔۔؟''

فون کے سپیکرس آن تھے۔شگوفہ نے جلدی سے پوچھا۔

''میں۔۔میں گر گئی تھی۔۔''

ماں صاحب کی آواز میں آنسو شامل ہوگئے۔

''کب کیسے۔۔چوٹ تو۔۔کہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔۔میں۔۔''

خرم کی بے قرار آواز ابھری تو دوسری طرف سے کسی مرد کی آواز آئی۔

''نہیں فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔۔ ذرا سا کلائی پر زور پڑا ہے۔۔''

دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

''یہ نادرہ کی بیٹی کے شوہر ہونگے۔۔''

شگوفہ نے آہستہ سے شوہر سے کہا۔

''کوئی فریکچر تو نہیں ہے نا۔۔ وہ تو درد میں بری طرح مبتلا معلوم ہوتی ہیں۔۔''

خرم نے تشویش سے پوچھا تو اس آدمی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

''ارے نہیں صاحب ایسی کوئی بات نہیں۔۔ ہم نے ڈاکٹر کو دکھادیا ہے۔۔ ایکسرے بھی ہو گیا ہے۔۔ ٹکٹ بھی ہوگیا ہے ان کا۔۔ لیجئے بات کیجئے۔۔''

''کچھ نہیں بس۔۔ سوجن ہے کلائی پر بہت۔۔ اسی لئے درد ہو رہا ہے زیادہ۔۔ نادرہ کی بیٹی نے بڑا خیال رکھا۔۔ لو بات کرو۔۔''

''میں نے خود ٹکٹ بک کروایا ہے ان کا۔۔ آپ بس وقت سے انہیں لینے آجایئے گا۔۔ پھر تسلی سے ڈاکٹر کو دکھایئے گا۔۔ او کے۔۔؟''

''جی۔۔''

نادرہ کی بیٹی کا شوہر بولا۔

''چلئے تو پھر خدا حافظ۔۔''

''جی اچھا خدا حافظ۔۔''

ایر پورٹ پر دیکھا تو ماں صاحب آدھی رہ گئی تھیں۔ اور درد کو بڑے ضبط سے چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ خرم کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔ ایر لائنز کی خوبصورت وردی میں ملبوس ایک دبلا سا نوجوان ایک بھاری بھر کم ادھیڑ عمر آدمی کو ویل چیر پر بٹھائے اسی طرف آرہا تھا۔ خرم نے جلدی سے ماں صاحب کی جانب گردن موڑی۔ ماں صاحب آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر چل رہی تھیں۔ اس نے لپک کر بازو تھام لیا۔ اس کے چہرے پر اطمینان کی لہر سی دوڑ گئی۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی خرم نے ماں صاحب کی ایکسرے رپورٹ دیکھی۔ ماں صاحب کی کلائی کی دو ہڈیوں میں سے بڑی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور ایکسرے میں صاف نظر آتا تھا۔ یعنی اس کو بھی جو ڈاکٹر نہ

ہو۔خرم کو پھر تشویش نے گھیر لیا۔وہ انہیں ائرپورٹ سے گھر لانے سے پہلے ہسپتال لے گیا۔وزن میں نسبتاً نہایت ہلکا،عمدہ قسم کا پلستر کروایا گیا اور درد کی گولیاں دی گئیں۔

ماں صاحب تڑپتی کراہتیں سی گھر پہنچیں۔اور دیوار کے سہارے آہستہ آہستہ چلتی سیدھا وضو کرنے چلی گئیں۔ پھر کچھ دیر بعد کمرے سے ان کی سسکیاں باہر سنائی دینے لگی۔خرم کچھ مزید طاقت کی دواؤں کے لئے باہر گیا تھا کہ کسی مصدقہ وسیلے سے دوا آئے اور کہیں نقلی نہ ہو کہ نقلی دواؤں کا خفیہ چلن سا چل نکلا تھا۔شگوفہ ان کے دروازے تک جا کر لوٹ آئی۔ ماں صاحب بلک بلک کر رو رہی تھیں اور بزعم خود چھپ کر رو رہی تھیں۔وہ ان کا بھرم توڑنا نہیں چاہتی تھی۔مگر جب تک ان کے رونے کی آواز آئی وہ بے قراری آس پاس ہی رہی۔

ماں صاحب کے روز و شب میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔نہ عبادت میں نہ کھانے پینے کے معمول میں۔کبھی کبھار ان کی کوئی کراہ کانوں میں پڑتی کہ گلے میں لٹکے بازو کے بوجھ سے کمزور سے شانے کا جوڑ دکھنے لگتا تھا۔

پلستر اترا تو ہڈی کچھ ٹیڑھی جڑی تھی۔ہاتھ،کلائی سے پیچھے کی طرف بالکل نہ جاتا تھا۔کلائی کا قدرتی خم تبدیل سا ہو گیا تھا۔انگلیوں کے درمیانی جوڑ مستقل طور پر خمیدہ رہتے تھے۔طبی اصطلاح میں اس طرح کے جوڑ کو کھانا کھانے والے کانٹے کی شکل سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

مگر ماں صاحب کو اس کا کوئی ملال نہ تھا۔البتہ ہاتھ کی آزادانہ جنبش سے محرومی سے پریشان سی ہو جاتیں۔درد بھی رہتا تھا۔ہاتھ کو گرم نمکین پانی سے دھوتیں۔اس پر زیتون کے تیل سے مالش کرتیں۔ پھر ذرا راحت ہوتی تو مطمئن سی نظر آتیں۔خرم دیکھتا تو اداس ہو جاتا۔ ماں صاحب کے بال بکھرے بکھرے رہتے تھے۔چوٹی بنانے کے لئے دو ہاتھوں کی ضرورت پڑتی ہے اور ماں صاحب کا ایک ہاتھ ٹھیک سے کام نہیں کرتا تھا۔خرم دفتر جاتے وقت اجازت لینے گیا تھا تو ان کے پاس سے گلِ یاسمین کی وہ مہک بھی نہیں آ رہی تھی جو ان کی شخصیت کا حصہ معلوم ہوا کرتی تھی۔جس کے بارے میں ماں صاحب نے برسوں پہلے کہا تھا کہ پہلی بار خرم کے ابو نے ان کے لئے یہ عطر ایران سے لایا تھا۔ابو کے تعلق سے ماں صاحب کی واحد مثبت یاد۔خرم اور شگوفہ بھی ان کے لئے یہ خوشبو لایا کرتے۔اب ان سے عطر کی شیشی نہیں کھلتی ہوگی۔خرم سوچتا۔

"ماں صاحب کے بال بکھرے دیکھتا ہوں تو دل دکھنے لگ جاتا ہے۔"

اس نے شام کی چائے کے دوران برآمدے سے باہر کی طرف جانے کہاں دیکھ کر کہا تھا۔

''وقت ہی نہیں ملتا مجھے۔۔ان کے ہمیشہ سجے سجائے بال دیکھ کر مجھے بھی برا لگتا ہے۔۔جب میں آتی ہوں اس وقت وہ مغرب میں مصروف ہوتی ہیں۔ پھر عشا کی نماز تک جانماز پر ہی رہتی ہیں۔ صبح فجر کے بعد سے بہت دیر تک جانماز پر ہوتی ہیں۔ پھر کچھ وقت آرام کرتی ہیں۔ ادھر میرے جانے کا وقت ہوتا ہے۔ ہفتے کو ہی کہیں وقت مل پاتا ہے مجھے۔ جب جا کر کہیں کر پاتی ہوں یہ سب تھوڑا بہت۔۔''

شگوفہ بھی باہر درختوں کی طرف دیکھ کر بولی۔

''ہاں۔۔وہ تو ان کا معمول ہی رہا ہے ساری زندگی۔۔''

''الگ گلٹی فیل ہوتا رہتا ہے کہ مجھ سے کہیں کوتاہی تو نہیں ہوئی۔۔یہ ہی سوچتی رہتی ہوں۔۔''

''نہیں تم ایسے مت سوچو۔۔اپنی طرف سے تو۔۔''

''انہیں۔۔سب سے پہلے نادرہ کی بیٹی کے ساتھ جانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔۔؟''

''تو پھر کس کے ساتھ جاتیں۔۔تم بھی حد کرتی ہو شگوفہ۔۔''

''جانے کی ہی کیا ضرورت تھی خرم۔۔حج بھی کر لیا تھا۔عمرہ بھی۔۔پھر ایک اور عمرہ کیا ایسا ہی ضروری تھا۔۔بس ایک ضد سی پکڑ لیتی ہیں بچوں کی طرح۔۔''

''ضد نہیں ہے یہ۔۔بس وہاں مرنے کی دعا مانگتی ہیں۔۔اور اسی لئے لوٹ کر بہت دنوں تک اداس رہتی ہیں۔۔''

''یہ بھی تو ایک طرح کی ضد ہے۔۔خدا انہیں حیات عطا کرے۔۔کون جانتا ہے اپنا وقت۔۔کہ کب جانا ہے۔۔اور۔۔''

''چلو چھوڑو شکر ہے خیریت سے گھر تو پہنچ گئیں۔۔ورنہ۔۔''

''کیا خیریت۔۔زخمی اور اپاہج کر کے بھیجا ہے نادرہ کی بیٹی نے انہیں۔۔اور بجائے پلستر لگوانے کے ٹوٹی ہڈی لئے درد سے بلکتی ہوئی حالت میں روانہ کیا۔۔بے رحموں نے۔۔کتنا درد ہوتا ہوگا۔۔اب خود ٹھیک سے نہاتی دھوتی نہیں۔۔چڑچڑی سی ہوگئی ہیں۔۔''

''انہوں نے زندگی کے ہر سٹیج پر، وقار سے جینا سکھایا ہے ہمیں۔۔ہم اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ۔۔''

''کر تو رہے ہیں۔۔بس مجھے رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ بھانجی کی نند کی بیٹی کے شوہر کے سہارے گئیں اور کلائی تڑوالی۔۔''

''بس اب بھول بھی چکو یہ سب۔۔سب ٹھیک ہوگا انشاءاللہ۔۔''

"ہاں ۔۔انشااللہ۔۔"

ماں صاحب کو مٹھی بند کرنے اور کھولنے کے قابل ہونے میں سال بھر کا وقت لگ گیا۔ان کا سراپا سکڑ سا گیا تھا۔جسم کی تمام ہڈیوں کی ساخت چھوٹی ہوتی جا رہی تھی۔ان کا قد شگوفہ کے برابر ہوا کرتا تھا۔اب کم ہو گیا تھا۔

ماں صاحب پچاسی کے قریب ہو گئی تھیں۔اب ان کی غذا ذرا زیادہ ہو جاتی تو طبیعت خراب ہونے لگتی۔کبھی ایک چیز موافق آتی تو کبھی دوسری۔ادھر ایک منفی بات یہ ہوئی تھی کہ جس چیز سے انہیں کچھ فائدہ ہوتا،اس کے کم پڑ جانے کی صورت میں انہیں شک گزرنے لگتا کہ گھر کا ملازم بھی کھاتا ہے اور ان کی شکایت وہ وقتاً فوقتاً شگوفہ سے کرتیں۔دو ملازم اسی سبب نوکری چھوڑ گئے تھے جن میں سے ایک ظفر بھی تھا۔بڑی مشکل سے شگوفہ نے نئے ملازم کا انتظام کیا تھا۔یہ باتیں خرم سے کہنے میں اور الجھن ہوتی تھی کہ تھوڑا سا تناؤ بٹ بھی جاتا پھر بھی کوئی فائدہ نہ ہوتا کہ ماں صاحب اب باتیں بار بار بھولنے لگی تھیں۔اور اس فراموشی میں کبھی کبھی کھانا پینا بھی شامل ہو جاتا۔شگوفہ نے پریشانی سے سوچا۔اس پریشانی میں دکھ کی آمیزش بھی تھی۔

اس دن شگوفہ جانے کیا تلاش کر رہی تھی کہ شادی کا البم سامنے آ گیا۔ہرے لباس اور ہلکے ہلکے زیورات میں ماں صاحب،سرخ جوڑے میں لپٹی بھاری زیوروں سے سجی شگوفہ سے کچھ کم حسین نہیں لگ رہی تھیں۔بلکہ کسی کسی تصویر میں اس سے کم عمر اور اس سے زیادہ جاذب بھی۔

کبھی ماں صاحب بھی چھوٹی سی لڑکی ہوں گی۔پھر بڑی ہو گئیں اور بدلتی گئیں۔جیسے لڑکیاں بدل جاتی ہیں۔بدل دی جاتی ہیں۔بدلتے حالات انہیں بدل دیتے ہیں۔

شگوفہ کی نظریں تصویر میں اپنے مہندی رچے پیروں سے ہوتی ہوئی ادھ کھلے گھونگھٹ تک چلی گئیں۔جسے ماں صاحب مہندی رچے ہاتھوں سے کھول رہی ہیں۔شگوفہ کا چہرہ رو رو کر کچھ سوج بھی گیا ہے مگر میک اپ نہیں اترا ہے۔

کیسے بابل کا گھر چھوٹ گیا تھا اچانک۔

اسے اچانک شدت سے اپنا بچپن یاد آنے لگا۔اس گھر میں اب کوئی نہیں رہتا تھا۔بھائی کسی دوسرے ملک کا شہری ہو گیا تھا۔دو چار برس میں کہیں ایک آدھ چکر لگاتا تھا۔اس نے وہاں ایک چوکیدار رکھ چھوڑا تھا جس نے باغیچے کے کونے میں ایک کٹیا سی بنا رکھی تھی۔اور مکان رفتہ رفتہ بوسیدہ ہوتا

جار ہا تھا۔ وہ سسکیاں لے کر رو دی۔ کسی پرانی فلم کا گانا شگوفہ کے ذہن میں گونج گیا۔

اب کے برس بھیج بھیا کو بابل ۔۔ ساون میں لیجو بلائے۔

آنکھیں بھیگ سی گئیں۔ ٹھنڈی سانس لے کر اس نے نظریں ماں صاحب کی تصویر پر مرکوز کر دیں۔

ہونٹوں کو داہنی جانب خم دے کر مسکراتی ماں صاحب، موجود بیبیوں کی جانب فخر سے دیکھ رہی ہیں گویا کہتی ہوں کہ دیکھو میری پسند۔ ان کی ہنستی ہوئی آنکھوں کی چمکتی پتلیوں کے نیچے ذرا سے خم کھائے نتھنے میں جگ مگ کرتی لونگ بھی مسکرا رہی تھی۔ شگوفہ کے ذہن میں ماں صاحب کا موجودہ سراپا گھوم گیا۔ تصویر میں چہرے کے حسن کو دوبالا کرنے والی مسکراہٹ سے پیدا ہونے والی حسین قوس اب گہری جھری بن کر، جبڑے کے سکڑنے اور دانتوں سے سہارا ٹوٹ جانے کے سبب لٹکتے ہونٹوں کو اور نیچے لٹکاتی چہرے کا سب سے زیادہ غیر جاذب حصہ معلوم ہوتی تھی۔ تصویر کے مہندی رچے ہاتھوں میں اب بے شمار چھوٹی بڑی نسیں ابھر ابھر کر وقت کے اپنی رفتار سے چل کر خاموش ستم برپا کرنے کی بے رحم داستاں سنا رہی تھیں۔ تصویر میں پہنے، کلائیوں میں پھنسے جا رہے بڑے بڑے دو منقش کڑے اب وضو کے وقت ہاتھ اوپر تک دھوتے ہوئے ماں صاحب کی کہنیوں تک جا کر چپ چاپ لوٹ آتے ہیں۔ پتلیوں کی چمک برسوں پہلے کھو گئی تھی۔ بلکہ داہنی آنکھ کے آپریشن کے بعد سے اس پتلی پر ماں صاحب کی آنکھوں کے کمزور پٹھے اپنا قابو کافی حد تک گنوا بیٹھے تھے اور صحت مند آنکھوں میں کتھک کی ہم رکاب رقاصاؤں کی طرح مشترکہ رخ پر تھرکنے والی پتلیاں اب بھینگی ہو گئی تھیں۔ دہائیوں سے نتھنے میں پڑی مکئی کے دانے جتنی بڑی لونگ کے بوجھ سے نیم بند سا ہو رہا نتھنا اب ان کی شناخت بن گیا تھا۔ چہرے پر رفتہ رفتہ بنتی ہوئی جھریاں اب گہرا گئی تھیں۔ ان سے پیدا ہونے والی سلوٹوں میں بھی لکیریں پڑ گئی تھیں۔ رخساروں کی چربی ختم ہونے سے ڈھیلی پڑنے والی جلد نے ناک کو سہارا دینا چھوڑ دیا تھا اور ناک ہونٹوں کی طرف جھک آئی تھی۔ دانتوں کے غائب ہونے سے مسکراتے وقت ہونٹ دہانے کے اندر گم ہو جاتے تھے اور ناک اور ٹھوری کے درمیان کا فاصلہ نہ ہونے کے برابر ہو گیا تھا۔

شگوفہ نے ایک گہری سانس لی۔

ایسا ہر سن رسیدہ چہرے کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسی لئے بڑھاپے میں لوگوں کی شکلیں ملتی جلتی نظر آتی ہیں۔ گو کہ ماں صاحب کے صاف رنگ اور دبلے سے سراپے کے ساتھ اب بھی ایک الگ طرح کی خوبصورتی اور ایک مخصوص سا وقار جڑا تھا۔ مگر تصویر والی ماں صاحب اور اس وقت کی ماں صاحب دو الگ انسان معلوم ہوتی تھیں۔

اس خیال کے آتے ہی شگوفہ البم سے نظریں ہٹا کر ذرا پیچھے کو جھکی کہ سنگھار میز کے آئینے کے سامنے ہو جائے مگر اسے اپنا چہرہ پورا دکھائی نہیں دیا۔

اب کے برس بھیج۔۔ساون میں لیجو۔۔

وہ دوبارہ تصویروں کی طرف پلٹ آئی کہ بھاری بھرکم بدن سے اٹھ کر آئینہ دیکھنا اتنا ضروری نہ تھا اور دوسرے آئینہ دیکھنے کا خیال بھی کہیں لاشعوری طور پر ابھر اڈوبا تھا۔

کیوں ہوتا ہے انسان بوڑھا۔

وہ تصویریں پلٹتی رہی۔

اور کیوں بڑھ جاتا ہے اس کا وزن۔

اس کے سامنے ایک اور تصویر کھل گئی جس میں وہ خرم کے ساتھ کھڑی کیمرے میں دیکھ رہی ہے۔ زندگی سے لبریز آنکھوں میں مستقبل کی متوقع مسرتیں لئے اپنے حسن اور کھڑے رہنے کے باوقار انداز سے مکمل واقف۔

زندگی گزارنے میں ہر طرح کے ضابطوں کی پابند ماں صاحب، جب بدل کر ایسی نظر آسکتی ہیں تو شگوفہ ایسے لاپرواہ لوگ کیسے لگیں گے۔

وہ پھر آئینے کی جانب جھکی۔ اس وقت بھی اسے اپنا آدھا ہی چہرہ نظر آیا۔ وہ جلدی جلدی البم پلٹنے لگی۔ ماں صاحب کی اور بھی کئی تصویریں تھیں۔ خورم کے دیو قامت والد کے ساتھ۔ چھوٹے سے خرم کے ساتھ۔ جوان خرم کے ساتھ۔ اور خود شگوفہ اور خرم کے بچوں کے ساتھ۔ ادھیڑ ہو رہے بیٹے بہو کے ساتھ ماہم کی شادی کی تصویریں۔ حج کی تصویریں اور عمرہ کی۔

ماں صاحب دھیرے دھیرے بالکل بدل گئی تھیں۔ نہیں بدلا تھا تو ان کے روز و شب کا معمول۔ باغیچے میں کچھ کام۔ مگر پہلے سے کچھ ہلکا۔

عبادت پہلے سے ہی انداز میں ہوتی۔ یعنی شگوفہ کی طرح بیٹھ کر نہیں۔ ہمیشہ کی طرح کھڑے ہو کر اور باقاعدہ رکوع میں جھکنا، دوزانو بیٹھنا بھی ویسے ہی۔ یعنی سب پہلے کی طرح۔

اب ماں صاحب بچہ سی ہو گئی تھیں۔ بچے کی طرح ناراض اور روٹھنے اور پھر مان جانے والی۔ گویا وہ ایک ضعیف بچہ ہوں۔ اور یہ بات بھی اب گھر کے سب لوگوں کے سمجھنے کی تھی۔ اب وہ جو بات کرتیں عام طور پر ان کی اپنی ہی ضرورت کی ہوا کرتی۔ خوراک، دوائی یا شکایت۔ چھوٹے بچے کی

طرح۔ خرم کا مگر اس طرف دھیان ہی نہ گیا تھا کبھی۔ وہ اپنا فرض نبھانے میں خوش ہوتا تھا۔ خود شگوفہ اسے ان کا بزرگانہ بچپن جان کر خوش اسلوبی سے نبھانے کی کوشش کرتی۔

اس دن بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔

''ماں صاحب کتنی سیلفش ہوگئی ہیں ماما۔۔''

قیصر نے ماں صاحب کا جملہ سن لیا تھا کہ وہ ابھی بچہ ہے اور انہیں اس کی ٹریننگ سے زیادہ اپنے تیسرے عمرہ کی فکر ہے۔

بھاری بدن کا داہنے بائیں جھکتا توازن سنبھالے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی شگوفہ کے پیچھے پیچھے ہفتہ بھر پہلے لوٹا قیصر بھی کمرے کے اندر داخل ہوا۔

''نہیں ایسا نہیں ہے بیٹا۔۔''

شگوفہ مسہری کے کنارے پر بیٹھ گئی۔

''تو پھر کیسا ہے مام۔۔ سنا نہیں ابھی کیا کہہ رہی تھیں ڈیڈ سے۔۔ اب اگر عمرہ کا پروگرام بنا تو میرا تو سال برباد ہوگیا نا۔۔ آئی نیڈ منی ماما۔۔ میں ڈیڈ پر بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔۔ ایک سکالرشپ تو مجھے ملے گا ہی۔۔ پوار ڈیڈ۔۔ پہلے سے انہوں نے لونز لے رکھے ہیں۔۔ اور پھر کچھ سیونگ بھی تو چاہیئے نا۔۔ ریٹائر بھی ہونے والے ہیں۔۔''

''تم اس کی فکر مت کرو۔۔ وہ سب منصوبہ بند طریقے سے ہو رہا ہے۔۔ اور نہیں ہوگا تمہارا سال برباد انشا اللہ۔۔ دوسرا وظیفہ بھی میرے ذہین بچے کو ہی ملے گا۔۔''

''مگر اب ماں صاحب کو کتنے عمرہ کرنے ہیں ماما۔۔ یہ تو کوئی حکم نہیں۔۔ یہ کیسی عبادت ہے۔۔''

''ایسا نہیں کہتے بیٹا۔۔ پھر انہوں نے کیا نہیں کیا ہم لوگوں کے لئے۔۔ وہ کوئی غیر تھوڑی ہیں۔۔ ہم اپنے ہیں ان کے۔۔ کتنے دن رہتے ہیں بزرگ زندہ۔۔''

''کتنے دن۔۔؟۔۔ اتنی ہیلدی ہیں وہ اپنی عمر کے لحاظ سے۔۔ ہر چیز میں ڈسپلنڈ۔۔ بوڑھے تو آپ اور ڈیڈ لگتے ہیں۔۔ شی از ایبسو لیوٹلی فٹ۔۔ اینڈ آئی اپریسیٹ دیٹ آف کورس۔۔ کوئن مدر کی طرح۔۔ فیڈل کاسترو کی طرح۔۔ وقت کو پیچھے چھوڑنے والی۔۔ وہ تو اچھا ہے۔۔ مگر ایسے میں تو لوگ خود گدیوں تک سے دست بردار ہو جایا کرتے ہیں چھوٹوں کی ضروریات اور خوشیوں کا خیال کر کے سب ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔۔ مگر ان کے شوق ہی ختم نہیں ہوتے۔۔''

''یہ شوق نہیں ہے بیٹا۔۔وہ ایک بچے کی طرح ہوگئی ہیں۔۔''

''ہاں صرف اپنی پڑی رہتی ہے انہیں ہر وقت۔۔بالکل چینج ہوگئی ہیں۔۔آئی کانٹ بی لیو کہ یہ وہ ہی ماں صاحب ہیں جو ہم سے اتنا پیار کرتی تھیں۔۔اب تو انہیں ہماری فکر ہی نہیں۔۔''

''اب بھی پیار کرتی ہیں بیٹا۔۔یہ سب بڑھتی عمر کے سبب ہے۔۔''

''خاک پیار کرتی ہیں۔۔آپ کو ان کا اٹیچوڈ برا نہیں لگتا۔۔؟''

''لگتا ہے کبھی کبھی۔۔مگر پھر سوچتی ہوں کہ بچے ایسے ہی ہوتے ہیں۔۔اور کے دن جئیں گی۔۔کوئی حسرت نہ رہ جائے۔۔''

''حسرت۔۔؟۔۔یہ ہر سال عمرہ کریں گی۔۔حج کو جائیں گی اور کبھی ان کی یہ حسرت پوری نہیں ہوگی۔۔کچھ jealous سی بھی ہوگئی ہیں۔۔اگر انہیں کوئی چیز نہیں چاہیئے تو اس کو کریٹسائز کرتی ہیں۔۔''

قیصر نے اپنا سر جھٹکا۔شگوفہ اس کے بالوں کو دیکھ کر مسکرائی۔صحت مند بال لہرائے تھے تو ایک ایک بال ہوا میں الگ الگ اڑتا نظر آیا تھا۔

''نہیں بیٹا۔۔ایسا کچھ نہیں۔۔شی از لائک اے چائلڈ۔۔جسٹ اے چائلڈ۔۔''

''ماما۔آپ بچہ نہ کہئے انہیں۔۔یہ لوگ بڑے پریکٹیکل اور میٹر آف فیکٹ ہو جاتے ہیں۔۔وہاں ایک گرینڈ مدر نے اپنی پوتی کا مرڈر کروا دیا تھا پتہ ہے۔۔؟''

''ری اے لی۔۔؟''

''ہاں ماما۔۔وہ جاب کرتی تھی تو اُن کے پاس اپنے پیسے جمع رکھا کرتی تھی۔اس نے اپنی شادی کے لئے وہ پیسے ان سے مانگے تو انہوں نے نہیں دیے۔۔جھگڑا ہوا لڑکی نے دادی کو پیٹ دیا۔۔''

''ہاتھ اٹھایا دادی پر۔۔؟''

''جی ہاں۔۔اور پھر دادی نے کسی سے اس کو قتل کروا دیا۔۔''

''گڈ گاڈ۔۔مگر۔۔ایسا کیسے ممکن ہے۔۔؟''

''اِٹ اِز ٹرُو مام۔۔اور پھر یہ نہیں کہ سیلف ڈیفنس میں مارا ہو۔۔جیسے لڑکی نے اٹیک کیا تو انہوں نے اپنے بچاؤ میں یہ فوری قدم اٹھالیا ہو بے سوچے سمجھے۔۔نو۔۔شی پلینڈ اِٹ لائک اے کریمینل۔۔باقاعدہ منصوبہ بنا کر۔۔آپ سوچ سکتی ہیں۔۔؟''

''نہیں۔۔ہاں۔۔یہ تو باقاعدہ کسی مجرم کی طرح۔۔کیا پتہ لڑکی نے اس وقت کہا ہو کہ وہ اس کی جان لے لے گی۔۔جو ہاتھ اٹھا سکتی ہے۔۔جانے کیسی ہو وہ۔۔کیسی تربیت ہو اس کی۔۔دادی ڈر گئی

ہو گی کہ اگر وہ اسے نہیں مارے گی تو لڑکی اسی کی جان لے لے گی۔۔مگر پھر بھی جان سے مارنے کا کیسے سوچ سکتا ہے کوئی۔۔اور اپنی اولاد کو ہی۔۔کیا پتہ دادی پہلے سے ہی ایسے کام کرتی ہو اور پکڑی نہ گئی ہو۔۔یا سزا کاٹ چکی ہو۔مگر اپنی پوتی۔۔''

''وہی تو ماما۔۔اس ایج میں انسان اگر اپنے دماغ اور جسم کو ایکٹو نہ رکھے تو بہت لیزی ہو جاتا ہے۔۔اور دوسروں پر ڈیپنڈنٹ ہونے کی وجہ سے صرف اپنے ہی بارے میں سوچتا رہتا ہے۔۔اسے بس اپنی ہی فکر ہوتی ہے۔۔اور پھر وہ دوسروں سے لاتعلق۔۔اور شدید معاملات میں اتنا خود غرض ہو جاتا ہے کہ جان تک لے سکتا ہے کسی کی۔۔''

''نہیں تم سب کے بارے میں ایسا نہیں کہہ سکتے۔۔یہ انسان کی بچپن کی تربیت پر منحصر ہے۔۔چاہے وہ کتنا ہی بوڑھا ہو۔۔ناراض ہوگا۔۔عاق کر دے گا۔مگر جان صرف وہی لے سکتا ہے جو اسی نیچر کا ہو۔تخت کے لئے لوگوں نے کیا قتل نہیں کروائے۔۔؟ باپ کا قتل کروا دیا۔۔بھائی کو مار ڈالا۔۔اب بھی کرسی کے لئے قتل ہوتے ہیں۔۔وہ تو الگ معاملہ ہے۔۔اور پھر وہ جرائم پیشہ ذہنیت ہوتی ہے۔۔کریمنل لوگوں کی بات تو الگ ہے۔۔''

''مگر اس ایج کا انسان۔۔ایک بزرگ۔۔؟''

''کیا معلوم اُس کی نفسیاتی حالت کیا رہی ہوگی۔۔اس عمر میں ذہن کو اگر بیدار نہ رکھا جائے تو degeneration کی رفتار اور تیز ہو جاتی ہے۔۔پھر اس کا بلڈ پریشر زیادہ ہو۔۔اور کوئی بیماری ہو۔۔یادداشت بھی متاثر ہوتی ہے۔۔اور لیزی ہو جانے والا آدمی اس عمر میں کچھ زیادہ بھولنے لگتا ہے۔۔کئی فیکٹرس ہو سکتے ہیں بیٹا۔۔''

''ہاں یہ بھی آپ ٹھیک کہتی ہیں۔۔''

''پھر بوڑھے اور بچے ایک سے ہوتے ہیں۔۔بچوں کو بھی تو اپنی ہی پڑی ہوتی ہے۔۔بھوک لگے تو روتے ہیں۔۔پیٹ بھرے تو ہنستے ہیں۔۔کھلونا نہ ملے تو روٹھ جاتے ہیں۔۔مل جائے تو مان جاتے ہیں۔۔اُن کی اِن اداؤں پر ہمیں پیار آتا ہے۔۔اور بوڑھوں پر غصہ۔۔جنہوں نے ہماری انہی اداؤں پر ہمیں بھی کتنا پیار کیا ہوگا۔۔ہم یہ بھول جاتے ہیں۔۔''

اس نے قیصر کے ماتھے پر آرہے بال پیچھے کو سنوارے۔

''شکر ہے کہ اس عمر میں اپنے ہاتھ پیر استعمال کر پاتی ہیں۔۔نہیں تو سوچو ہمیں ہی کتنی پریشانی ہوتی۔۔ہے نا۔۔ہم اولڈ ہومز میں رکھنے والے لوگ تو ہیں نہیں۔۔''

''جی مام۔۔وہ تو ہے۔۔مگر۔۔''

''مگر کچھ نہیں بیٹا۔۔سب ٹھیک ہوگا۔۔چلو۔۔تمہاری پسند کے اچار کے لئے انہوں نے بہت سی سبزیاں منگوائی ہیں۔۔ان کے پاس بیٹھتے ہیں۔۔اور ان کی ہیلپ بھی کرتے ہیں۔۔دیکھو ابھی بھی کچھ نہ کچھ کرتی ہیں۔۔کرنا چاہتی ہیں۔۔انہیں وقت دینا بھی ضروری ہے۔۔ شی شُڈ ناٹ فیل اَن وانٹڈ۔۔اِٹس ویری اِمپارٹنٹ۔۔''

شگوفہ بیگم نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''اوکے مام۔۔بے چاری ماں صاحب۔۔''

قیصر دھیمے سے مسکرایا اور ماں کا بازو تھام کر کھڑا ہوگیا۔

''چلئے۔۔''

وہ کمرے سے باہر نکلنے ہی والے تھے کہ خرم داخل ہوئے۔کشادہ سی پیشانی پر جو سامنے سے بال اڑنے کے سبب مزید کشادہ نظر آنے لگی تھی، کئی شکنیں ابھری ہوئی تھیں۔

''کیا ہوا ڈیڈ۔۔آپ بھی پریشان ہیں۔۔ہیں نا۔۔؟''

قیصر والد کے چہرے کے طرف دیکھ کر مسکراتا ان کے قریب چلا گیا۔

''میں بھی۔۔مطلب۔۔؟۔۔کہو کہ میں ہی۔۔''

بیٹے کے اس محبت بھرے عمل سے پل بھر میں ماتھے کی شکنیں غائب سی ہوگئیں اور وہ بھی مسکرائے۔

''تم لوگوں نے تو اس وقت ان کا یہ برتاؤ دیکھا ہے نا۔میں صبح سے اپ سیٹ ہوں۔۔''

''اپ سیٹ ہونے والی کوئی بات نہیں ہوا کرتی اس عمر کے لوگوں کو لے کر۔۔یہ تو بچے ہو جاتے ہیں۔۔مگر ایسا کیا ہوا۔۔؟''

شگوفہ نے مسکرا کر کہا تو خرم بھی مسکرائے۔

''کتنی ذہین ہوگئی ہیں آپ ہماری کمپنی میں۔۔''

''کیا ہوا تھا ڈیڈ۔۔''

خرم باپ کے جملے سے محظوظ ہو کر مسکرایا۔

''صبح میں اتنے اچھے موڈ میں ان کے پاس اپنا خواب سنانے گیا کہ ہمیشہ سے ہم سب ان سے ہی تعبیریں پوچھتے ہیں کہ اچھی تعبیریں سنا کر دل خوش کر دیتی تھیں۔۔''

''تو۔۔؟''

''تو کچھ نہیں۔۔میں تو وہی یاد رکھے تھا کہ ماں صاحب کا کہنا ہے کہ کسی ہمدرد کو خواب سنانا چاہیئے کہ سب سے پہلے جو تعبیر کی جاتی ہے۔۔وہی سچ ہو جاتی ہے۔۔''

''وہ تو ڈیڈا یسے ہی پیار میں کہتی ہوں گی۔۔ایسا سچ تھوڑی ہوگا۔۔''

''اب جو بھی ہو بیٹا۔۔میں نے دیکھا کہ علی الصباح کسی نے ایک روپہلی سینی میں بہت سے سرخ سرخ سیب بھیجے ہیں۔تو میں پوچھتا ہوں کہ کس نے بھیجے ہیں۔اور وہ آدمی کہتا ہے آپ کے کسی ہمدرد نے اور چلا جاتا ہے۔میں خواب میں ہی سوچتا ہوں کہ ماں صاحب کے لئے رکھیں گے کہ اس موسم میں ابھی سیب اتنے سرخ نظر نہیں آتے۔ اور جا کر کشتی ڈائننگ ٹیبل پر رکھ دیتا ہوں۔۔ جاگا تو ماں صاحب کو خواب سنایا کہ کچھ اچھی تعبیر سے کوئی امید بندھوا دیں گی۔یہ اتنے سارے لونز۔۔ان بڑے بڑے خرچوں نے تھکا دیا ہے۔۔سب نبٹانے میں سال بھر لگ سکتا ہے۔۔کچھ دل کا بوجھ تو ہلکا ہو گا ماں صاحب کی باتوں سے۔۔بھلے جھوٹی تسلی ہی صحیح۔۔مگر۔۔''

''پھر کیا بولیں ڈیڈ۔۔؟''

''غور سے خواب سنا اور وہ بھی ہمیشہ کی طرح خوش دلی سے نہیں۔۔بڑی سنجیدگی سے۔۔پھر بولیں کہ میرے تو دانت ہیں نہیں جو سیب کھا سکوں۔۔''

شگوفہ اور قیصر زور سے ہنسے۔

''اور آگے بولیں کہ تعبیر اس کی یہ ہی ہے کہ تم مجھے عمرہ کے لئے لے جاؤ گے۔۔اور مسکرانے لگیں۔۔آئی ونڈر۔۔وہ شفیق،محبتوں سے بھری۔۔دوسروں کی خوشی کے لئے اپنی ضرورت کی قربانی پر تیار ماں صاحب کہاں چلی گئیں۔۔''

''پھر آپ نے کیا کہا ڈیڈ۔۔؟''

قیصر نے آنکھیں پھیلائیں۔

''انہوں نے کیا کہا ہو گا میں بتاتی ہوں مگر پہلے آپ لوگ یہ سمجھ لیجئے کہ ماں صاحب کہیں نہیں گئیں۔۔بس بڑھاپے نے ممتا کو کہیں دبا دیا ہے۔۔جو کبھی کبھی ابھر آتی ہے۔۔کمزور ہوتا ہوا جان و جسم ہر حال میں اپنا دفاع چاہتا ہے۔۔وہ سمجھتی ہیں کہ ان کے علاوہ سب اپنا خیال رکھ سکتے ہیں۔۔اس میں حیران ہونے والی بات کوئی نہیں۔ ڈوبنے والا پانی سے باہر آنے کے لئے اکثر اُسے ہی دھکیے دیتا باہر آنے کی کوشش کرتا ہے۔اسے خیال نہیں آتا کہ خود بچانے والا ہی اُس کی اس حرکت سے ڈوب سکتا ہے۔۔یا کبھی اگر انسان خطرے میں اچانک گھر جائے تو اُس وقت وہ گود کا بچہ پھینک کر جان بچانا چاہتا

ہے۔۔اسے کچھ سیکنڈ کے بعد ہی اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ بچہ کہاں ہے۔۔جب پھر وہ چلاتا ہے کہ میرا بچہ کہاں ہے اور واپس بھاگتا ہے۔۔یہ ہی بات ایسے معاملوں پر بھی صادق آتی ہے۔۔''

''مگر پھر بھی بھئی۔۔انسان کی کچھ امیدیں وابستہ ہوتی ہیں۔۔اپنوں سے۔۔''

''وہ امیدیں آپ کو ایک ایسے انسان سے جس کی عمر پچاسی کے آس پاس ہو رہی ہو، اور جو تھوڑی جسمانی اور زیادہ دماغی کثرت سے، یعنی مینٹل ورک سے نہ جڑا رہے، نہیں لگانی چاہیئے۔۔یہ ان کی نہیں ہماری غلطی ہے۔۔اس عمر میں انسان غیروں سے اولاد جیسی محبت کر سکتا ہے اور ناپسندیدہ اولاد سے نفرت۔۔یا پھر اس کے اچھے سلوک کی وجہ سے سب بھول بھال کر دوبارہ پہلے سی محبت۔۔ہمیں انہیں صرف اور صرف ایک معصوم بچہ سمجھ لینا چاہیے جو کبھی کبھی اپنے بچپن سے نکل آتا ہو ورنہ اکثر اسی میں رہتا ہو۔۔''

''یہ بھی تم ٹھیک کہتی ہو۔۔''

اب میں بتاتی ہوں آپ نے ماں صاحب سے کیا کہا ہوگا۔۔؟ شگوفہ نے قیصر کی طرف دیکھا۔

''اِنہوں کہا ہوگا۔۔بہت اچھا ماں صاحب۔۔انشا اللہ۔۔ایسا ہی ہوگا۔۔''

شگوفہ مسکرائی۔

''ایسا کہا تھا ڈیڈ۔۔؟''

قیصر ہنسا۔

''ہاں یار یہی کہا۔۔''

خرم نے گردن کاندھے کی طرف خم کی اور مسکرا دیا۔

◆❖◆

مرارخت سفر آنسو

''ذرا اُدھر دیکھونا۔۔۔ نئے زمانے کی طرف۔''

مسز ملہوترا نے سبزی سے بھری ہاتھ گاڑی سے سبزیاں چن کر ترازو میں رکھ رہی کُسم کو کہنی سے ٹھوکا دیا اور دوبارہ مشرق کی جانب کھڑی لمبی سی چمکیلی نیلی گاڑی کی طرف دیکھا جہاں ڈرائیور نے کار کا دروازہ تھام رکھا تھا اور منی اس میں بیٹھنے والی تھی۔ بیٹھنے سے پہلے اس نے انگلیوں سے اپنے نہایت ہلکے رنگے بھورے بال ماتھے سے سر کی طرف سنوارے اور ایک قدم گاڑی میں رکھا مگر فوراً ہی پاؤں واپس نکال کر گھر کے پھاٹک کی جانب نظر ڈالی۔ پھر چار، چھ قدم چل کر پھاٹک کے قریب گئی اور اس کے ستون میں لگے ڈور فون پر نفاست سے ترشے ذرا ذرا سے بڑھائے گئے ناخنوں والی سبک سی انگلی رکھ کر ہٹا دی تو لال بتی والے چھوٹے سے سپیکر سے آواز گونجی،

''آئی بیٹا۔۔بس ایک سیکنڈ۔۔تم بیٹھو گاڑی میں۔''

''quick mama...''

منی نے دھیرے سے کہا اور گاڑی کی طرف بڑھی۔

پھاٹک کے باہر کچھ دور تک گہرے سبز سنگِ مرمر کی ٹائلیں نصب تھیں اور پھر گلی نما سڑک پر کنکریٹ بچھا تھا جس پر اس کی اونچی ایڑھی والے نازک سے جوتوں کی کھٹ کھٹ بڑی بااعتماد آواز بن کر ابھری تو کسم نے جڑاؤ کنگنوں اور ہیرے جڑی انگوٹھیوں میں پھنسی گوری بھری بھری انگلیوں والے ہاتھوں میں تھاما گوبھی کا پھول جلدی سے ترازو میں ڈالا اور منی کو دیکھنے لگی۔ منی کی بالشت بھر چوڑائی والی لمبی سی کمر جہاں ختم ہوتی تھی وہاں اس نے 'ڈینم' کے چھوٹے سے 'شاٹس' پہن رکھے تھے اور کشتی کی ساخت کے گریبان والے بغیر آستین کے 'ٹاپ' میں سے اس کا ایک نازک سا شانہ جھانک رہا تھا۔ اس نے کلائی میں سے گجرے کی طرح پہنا ہوا پلاسٹک کے پھولوں والا 'ہیر بینڈ' نکالا اور بال سمیٹ کر اس میں پھنسا دیے۔ بال، 'پونی ٹیل' کی شکل میں سمٹ آنے سے گردن کی دو ایک نازک ہڈیاں ابھری نظر آ کر اسے مزید نزاکت عطا کرنے لگیں تو کسم نے ہونٹوں کو بھینچ کر سیکنڈ بھر کے لئے بائیں جانب خم دیا اور سر ہلکے سے جھٹک کر دیکھتی رہی۔ جب تک رُوہنی بھی گاڑی کے قریب پہنچ گئی۔ گہرے بھورے رنگ کے ٹراؤزرس' پر آدھی آستینوں والا ہلکا بھورا 'ٹاپ' اور کانوں میں گریبان کی ہڈیوں کو چھوتے ہوئے لمبے سیاہ آویزے اس کی سنہری مائل سفید جلد پر جاذب سا تضاد پیدا کر رہے تھے۔ ہینڈ بیگ اور سینڈلز بھی سیاہ تھے۔ گاڑی گلی سے باہر کو روانہ ہوئی۔

''بتاؤ جرا۔۔یہ ماں بیٹیاں ہیں۔۔''

مسز ملہوترا ایک دن پہلے 'مینی کیئور' کیے گئے ہاتھوں سے بے داغ آلو چن چن کر پلاسٹک کی تھیلی میں ڈالنے لگیں۔

(انہوں نے اور سبزی فروش نے ابھی تک پلاسٹک کی تھیلیوں کو 'No' نہیں کہا تھا۔)

کسم کی سبزیاں جب تول لی جاتیں تو ان کی باری آنے والی تھی۔

''اور نہیں تو کیا۔۔کیا پریورتن آیا ہے روہنی میم ساب میں۔۔بھیا۔۔دھنیا کبھی تاجی نہیں ہوتی تمہاری۔''

کسم گاجر کی ڈھیری کی طرف متوجہ ہوئی۔

''ارے بی بی جی روج بھر کے بوری لاتا ہوں منڈی سے۔ اسی کلونی میں کھتم ہو جاتی ہے۔ باسی کہاں ہوتی ہے جی۔۔''

''اچھا چل۔۔تول اب جلدی۔''

کسم نے اپنی 'ٹیلکم پاؤڈر' لگی بھاری سی گردن پر بکھرے تازہ تراشے بھیگے بال ذرا سا ہاتھ

میں اٹھا کر پھیلاتے ہوئے چھوڑے اور چھوٹے سے بٹوے میں سے پیسے نکال کر گننے لگی۔

''کیا 'مینٹین' کیا ہے۔ بیٹی سے تھوڑی سی ہی موٹی ہوگی۔۔۔ ہے نا کسم۔۔''

مسز ملہوترا میتھی کا ساگ گٹھی میں سے نکال کر ترازو کی طرف بڑھانے لگیں۔

''کب سے موسم بدلا ہے اور ایک دن بھی میتھی کے پراٹھے نہیں بنے ہمارے گھر میں۔ کل میں نے 'فریزر' میں رکھی ساری ملائی نکلوائی۔ آدھی کا گھی بنوایا، آدھی کا مکھن۔۔''

''اور نہیں تو کیا۔۔کوئی کام تو ہے نہیں اس سوائے خود کو سنوارنے کے۔۔ میں صبح سے 'واکنگ شوز' ہی پہنے ہوں کسم۔۔''

مسز ملہوترا نے اپنے پیروں کی جانب نظر ڈالی۔

''اور میں بھی۔۔''

دونوں نے قہقہہ لگایا اور اپنے اپنے گھروں کی طرف لپکیں تو مسز ملہوترا نے کسم کی طرف گردن موڑی۔

''میں بھی بنا رہی ہوں آلو کے۔ تُو وہیں آ جانا نا جب للت چلا جائے تو۔۔ مل کر ناشتہ کریں گے۔ ہری 'بنا ناشیک' بہت اچھا بناتا ہے۔۔''

''آپ ہی آ جایئے نا مسز ملہوترا۔۔ وہ 'سیریل' بھی آنے والا ہے۔ آج بدھ وار ہے نا۔۔ اسی ٹائم۔۔ تو ساتھ دیکھیں گے۔۔ پھر کل صبح ایک چکر 'ایکسٹرا' لگا لیں گے پارک کا۔۔ پر کچھ ہونے والا نہیں ہے ہمارا۔ ہے نا؟

''لے کیوں نہیں۔۔ پر آنا تو ہی۔ تُو چھوٹی ہے نا۔۔''

''چھوٹی تو آپ بھی ہیں۔۔ روحی سے۔''

''چھوٹی صحیح۔۔ پر موٹی بھی تو ہوں۔۔ دم پھول جاتا ہے میرا۔ تیری سیڑھیاں چڑھتے۔۔ اور تجھ سے تو بڑی ہوں نا۔۔''

''دم تو میرا بھی۔۔ پھولتا ہے۔۔''

دونوں مسکرا دیں۔

چندر کانت ناگ پال جب بالکنی میں آیا تو ایک کونے والے مکان کی چھت پر بھر چکی ٹنکی

کے اوپر والے بغیر ٹونٹی کے ٹپکتے ہوئے نل سے پانی پینے کی کوشش کر رہا تھا۔ چندر کانت نے کوّے سے نظریں ہٹا کر سامنے ٹیسو کے درخت کو دیکھا۔ اس کی ٹہنیوں پر جا بجا لمبی ہری ڈنڈیوں کے ساتھ نہایت حسین بڑے بڑے قرمزی پھول لٹک رہے تھے ۔ اس نے پھولوں سے نظریں ہٹائیں اور آسمان کی جانب دیکھتا ہوا پھر سامنے دیکھنے لگا۔ اس کے بعد پتلون کی جیب سے موبائل فون نکال کر اس کے دو ایک بٹن دبائے اور واپس جیب میں رکھ دیا۔ وہ لوہے کے جنگلے پر ہاتھ رکھے کھڑا رہا اور دور کہیں دیکھنے لگا۔ جیب سے رومال نکالا اور آنکھوں پر لگا چشمہ صاف کر کے دوبارہ پہن لیا۔ اس کے بعد کہیں اور دیکھنے لگا۔

وہ اونچے قد کا چست آدمی تھا۔ اس کے چہرے سے اس کی عمر کا اندازہ لگانا مشکل تھا تاہم وہ جوان سا شخص لگتا تھا۔ کئی برس پیشتر وہ ایک خوبصورت بیوی اور ایک پانچ چھ سالہ بچے کے ساتھ اس علاقے میں رہنے آیا تھا۔ اس نے والدین کی مرضی کے خلاف شادی کی تھی۔

ملک کے بٹوارے کے بعد جب اوم پرکاش ناگپال انڈیا آیا تھا تو 'کسٹوڈین' سے اپنی حیثیت سے کہیں زیادہ مالیت کی جائداد اپنے نام کروانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اُن دنوں لاہور کی جب کی بھگوان سٹریٹ انارکلی (اور اب کی بھی) میں اس کی دودھ مٹھائی کی چھوٹی سی دوکان تھی۔ اب یہاں وہ رفتہ رفتہ ایک اچھے خاصے ہوٹل کا مالک ہو گیا۔

چندر کانت ناگپال کا، گھر میں بھائیوں بھابیوں کے ساتھ رہنا جب مشکل ہوتا گیا تھا تو ایک دن وہ کرائے کے گھر میں منتقل ہو گیا۔ ان دنوں اس کے نام ایک لوہے کے سامان کا کارخانہ تھا جہاں باہر سے آئے لوہے کے کباڑ کو وہ مختلف شکلوں میں ڈھلوا کر سپلائی کیا کرتا تھا۔ اسے جُوے کی لت بھی تھی۔ وہ ریس کے گھوڑوں پر پیسے لگاتا اور اکثر جیت جاتا۔

گھر میں ایک ننھی سی بیٹی کا اضافہ ہو گیا تھا۔

ایک دن اس نے وہ گھر خرید لیا جس میں وہ کرائے پر رہتا تھا۔ بعد میں ایک عمدہ گاڑی بھی۔

بچے عمدہ سکول میں پڑھ رہے تھے۔ ایک اور گاڑی بھی آ گئی۔ شیئرز خریدے گئے، کام پھیلتا گیا۔

چندر کانت کو گھر سے باہر جا کر کام کرنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ اکثر سارا سارا دن گھر میں رہ کر ٹیلیفون سے ہدایات دیتا رہتا۔

دو گھریلو ملازمین میں ایک عورت تھی دوسرا ایک نوجوان تھا۔ دونوں مل کر گھر اور بازار کے

کام سنبھالتے تھے۔ جبکہ اس کی بیوی کو کئی دفعہ خیال آتا تھا کہ چندر کانت کو کام کی نگرانی خود بھی کرنا چاہیئے۔

زندگی ایک ڈگر پر چل نکلی تھی۔ مگر جانے کب کیا ہوا کہ ریس میں پیسے لگانے کے لئے چندر کانت نے ایک گاڑی فروخت کر دی۔ پھر اسے فیکٹری بھی رہن رکھنا پڑی۔ مگر بات بگڑتی ہی گئی۔ یہاں تک کہ دوسری گاڑی بھی جاتی رہی۔

ادھر بچے بڑے ہو رہے تھے۔

وہ پریشان رہنے ہی لگا تھا کہ اس کی بیوی نے جو بہت پہلے زنانہ لباس کی تراش خراش میں ڈپلومہ کر چکی تھی، زیورات کے بدلے رقوم حاصل کر کے ایک اعلیٰ درجے کے کاروباری علاقے میں شوروم کھول لیا۔ ان دنوں مغربی طرز کے زنانہ ملبوسات کی مانگ تھی اور یہ بات اس نے ذہن میں رکھی۔ شوروم چل نکلا۔ ریشمی شلوار سوٹ الماریوں میں بند کر کے وہ خود بھی وہی لباس پہننے لگی تھی۔

برسوں تقریباً چوبیسوں گھنٹے گھر پر شوہر کے ساتھ گزارتے وہ مطمئن سی جی رہی تھی کہ اسے اپنی دنیا سے باہر آنا پڑا۔ اور باہر کی دنیا بھی بری نہیں تھی۔ اسے اپنے گھر کی بنیادیں اور مضبوط معلوم ہوئیں، بچوں کا مستقبل اور محفوظ نظر آنے لگا۔ وہ جٹ گئی اپنے کام میں۔ وقت کے ساتھ اسے بھی اپنا طرزِ زندگی بدلنا پڑا۔ اپنے وزن کا خیال رکھنا لازمی ہو گیا کہ ایسے پہناوے فروخت کرنے کے لئے اُس پر ان کا اچھا لگنا بھی ضروری تھا۔ اپنی مرضی سے بجنا سنورنا اسے اچھا لگنے لگا کہ پہلے وہ صرف شوہر کی پسند سے سجا کرتی۔ اُسی کی پسند کے گہرے چمکیلے رنگ، طرزِ لباس وغیرہ اس کی اپنی پسند بن گئے تھے مگر اسے اس بات کی غالباً خبر ہی نہ تھی۔ یہ دریافت اسے دلچسپ معلوم ہوئی کہ وہ ہلکے رنگ پسند کرتی ہے۔ قمیص شلوار دوپٹے کی نسبت مغربی پہناوے میں زیادہ آسانی سے کام کر سکتی ہے۔

چندر کانت کو پہلے بھی گھر میں رہنا اچھا لگتا تھا، اب بھی۔ مگر اب وہ گھر میں اکیلا رہتا تھا۔ ٹیلیوژن دیکھتا رہتا۔ کئی دفعہ اس کا جی چاہتا کہ اس کی بیوی کچھ دیر بعد جائے۔ مگر وہ جلدی میں ہوتی۔ شوروم کھلنے کا وقت نکلنے کا خدشہ ہوتا اور رُک نہ پاتی۔ یہ بات چندر کانت کو بالکل پسند نہ تھی۔

اس نے شراب کچھ زیادہ مقدار میں پینا شروع کر دی تھی۔

بالکنی پر کھڑے چندر کانت ناگپال کو شراب کی طلب ہونے لگی۔ حالانکہ وہ صرف

رات کو بیا کرتا تھا اور ابھی صبح کے تقریباً گیارہ بجے تھے۔ آج بھی وہ گھر میں اکیلا تھا۔ کل شوروم کی چھٹی تھی تو سارا دن اس کی بیوی اس کے سامنے تھی۔ اس کا جی چاہا کہ اس کی بیوی کبھی شوروم نہ جائے۔ بلکہ صبح جب وہ تیار ہو رہی تھی تو اسے ایک سیکنڈ کے کسی حصے میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ شوروم میں آگ لگ جائے اور دن بدن مزید جاذب ہوتی جا رہی اس کی بیوی اس کی نظروں کے سامنے رہے۔

مگر شوروم میں آگ نہیں لگی الٹا مزید روشنی کا انتظام ہو گیا۔

کچھ روز پہلے مسز نا گپال نے اپنے شوروم کی خاطر نئی 'ڈمیز' کے لئے اشتہار دیا تھا، کیونکہ اس کی خواہش کے مطابق ایسی 'ڈمیز' مارکیٹ میں دستیاب ہونا ممکن نہ تھا۔ پلاسٹک کی ایسی گڑیاں جو 'ریپر آنز' اور 'لانگ سکرٹس' کی نمائش کے کام آسکیں۔ اور جن کی ساخت جل پریوں سی ہو۔ پیروں کی جگہ مچھلی کا نچلا دھڑ مختلف رنگوں سے سجایا گیا ہو۔

اشتہار کے جواب میں ایک دلچسپ اور سودمند تجویز آئی۔

''ہماری لڑکیوں کو 'ایکسپوجر' ملے گا اور ہمارے مشہور 'بینر' تلے آپ کے 'ڈیزائنز' کی 'ماڈلنگ' ہوگی۔''

آفر پیش کرنے والے سینتیس اڑتیس سالہ طویل قامت، خوش لباس اور گہری گہری آنکھوں والے شخص نے 'دی مرمیڈ' شوروم کے سفید مرمری کاؤنٹر کے دوسری جانب کھڑی سنہرے بالوں والی خوب صورت لڑکی سے مسکرا کر کہا۔ کاؤنٹر پر جس جگہ اس نے اپنی گوری سی کہنی ٹکائی تھی، وہاں 'دی مرمیڈ' کے کاروباری 'ٹریڈ مارک' میں جہاں انگریزی سے لکھے 'مرمیڈ' کا 'آئی' لکھا تھا، کسی روپہلی دھات سے ننھی سی جل پری بنائی گئی تھی اور 'آئی' کے اوپر والے نقطے کی جگہ جل پری کے سر پر سنہرے رنگ کا تاج بڑی مہارت اور نفاست سے جوڑا گیا تھا۔

''سوچ لیجئے میم! ایسا آفر مشکل سے ملتا ہے۔''

اس نے جیسے کہ سرگوشی میں کہا۔

''ہماری 'سلم اینڈ سمارٹ' ماڈلز، آپ کے اس ٹریڈ مارک کے ساتھ سچ مچ کی مرمیڈز نظر آئیں گی۔ حسین چلتی پھرتی جل پریاں۔ آپ ہماری بات کرائیے نا 'اونر' کے ساتھ۔''

''آپ بیٹھیے۔''

لڑکی نے ایک طرف رکھی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

''میں جگنو کو بلاتی ہوں۔ وہی دیکھتی ہے یہ سب۔''

اس نے دوسری طرف کے کاؤنٹر کے قریب ایک لڑکے کو کچھ اشارہ کیا جو کسی گاہک کو 'پُل اووَرز' دکھا رہا تھا۔

جگنو اس کاروبار میں ماہر تھی۔ ہنستی مسکراتی کہیں سے آن پہنچی۔

''ہئے۔۔مائی سیلف جگنو۔۔۔''

وہ ہونٹ بھینچ کر مسکرائی۔

''او ہیلو۔۔ آئی ایم شوکمار شریواستو۔۔ لووِنگلی کالڈ شوشری۔۔یعنی آپ مجھے شوشری بلا سکتی ہیں۔''

اس نے گرم جوشی سے مسکرا کر ہاتھ مصافحے کے لئے آگے بڑھایا۔

''ایک عمدہ آفر ہے میم۔۔''

اس نے آفر دوہرایا۔

''بھئی ویسے' نفع تو ہوگا ہی کچھ۔۔اس پر دونوں کمپنیز کا برابر کا حق ہوگا۔''

''یہ بات آپ نے پہلے نہیں بتائی۔۔''

کاؤنٹر کے عقب میں کھڑی لڑکی مسکرا کر بولی۔

''اس لئے کہ یہ بات جگنو جی ہی سمجھ سکتی ہیں۔''

وہ ہنسا۔

''مگر آپ بھی ہماری موڈلز میں شامل ہو سکتی ہیں۔''

وہ ہنسا۔

''او نو۔ شوشری۔۔ یہ تو اونر ہیں ہماری۔اس شوروم کی مالک۔۔''

جگنو جلدی سے بولی۔

''او مائی مائی۔۔یعنی کہ مسز روہنی ناگپال۔۔''

وہ بشاشت بھری حیرت سے بولا۔

''جی ہاں۔۔وہ ان کی بٹیا بھی آرہی ہیں۔۔''

جگنو بھی مسکرائی۔

سکول کی وردی میں ملبوس ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکی اسی طرف آرہی تھی۔اس نے لمبی سی پٹی والا کتابوں کا بیگ کندھے سے لٹکا رکھا تھا۔

اس کی صورت روہنی سے خاصی شباہت رکھتی تھی۔

''اوہ۔۔یعنی بال وِ واہ۔۔''

اس نے سنجیدہ صورت بنا کر جیسے کہ افسوس سے سر ہلایا تو سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

''ہیلو بیٹا۔۔''

شوکمار شریواستو نے ہاتھ بڑھایا۔

''آئی ایم شوشری۔۔دے مرمیڈز نیو پارٹنر۔۔''

''او ہائے انکل۔۔آئی ایم منی۔''

''ٹمپرری پارٹنر۔۔آئی مین۔۔''

وہ مسکرایا اور پھر سنجیدہ صورت بنالی۔

''بٹیا کی شادی کی بات تو نہیں چل رہی ہے نا۔۔؟''

اس نے ماتھے پر سلوٹیں ڈال کر پوچھا۔

''ایکس کیوزمی۔۔؟''

منی کچھ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

اوکم آن شوشری۔۔''

جگنو ہنسی۔

''آئی مین۔۔یو نو وٹ آئی مین۔۔''

وہ بھی ہنسا۔

''کافی پی جائے۔''

روہنی نے کافی کی طرف اشارہ کیا اور ہلکے سے مسکرادی۔ ایک سمارٹ سا نوعمر لڑکا کافی کے پیالوں والی کشتی ہاتھوں میں تھامے مؤدبانہ کھڑا تھا۔

فیشن شو واقعی 'ہٹ' ثابت ہوا۔ مگر شراکت عارضی ثابت نہیں ہوئی۔ 'دی مرمیڈ' کو مزید 'آفرز' ملے۔ کام پھیلتا گیا۔ شوکمار شریواستو اچھے دوست کی طرح نیک مشورے دیتا جو سودمند ثابت ہوتے۔ بلکہ اب رفتہ رفتہ 'دی مرمیڈ' کے ہر مسئلے کا حل شوکمار شری واستو کے پاس ہوتا۔ کاروبار ترقی کی راہ پر گامزن تھا۔

پھر ایک دن روہنی ناگپال نے گاڑی خرید لی۔ بچے جو گاڑیوں کے اچانک چلے جانے سے

ٹیوشن وغیرہ کے لئے آٹو رکشا سے کام چلاتے تھے، نہ صرف بوکھلا گئے تھے بلکہ اپنی خام عمر کے باعث اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا بھی تھے۔

اس شام گھر پہنچنے پر روہنی نے نئی گاڑی کی چابی شوہر کے ہاتھ پر رکھ دی۔

''مام۔؟ نیو کار؟''

راہل کی خوشی اور حیرت میں ڈوبی آواز چیخ کی طرح ابھری۔

''یس۔ مائی چائلڈ۔''

روہنی مسکرائی۔

''اَوَر نیو کار۔''

منی نے تالی بجائی تو راہل نے ماں کو گود میں اٹھایا اور ایک دائرہ گھما کر نیچے رکھ دیا۔ وہ کھلکھلا کر ہنستی رہی۔ راہل نے لپک کر باپ کے ہاتھ سے چابی لی اور باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے منی اور پھر روہنی تھی۔ نکلتے وقت روہنی نے پلٹ کر شوہر کو دیکھا تھا اور شاید بلایا بھی تھا۔ مگر بچوں کی خوشی میں شرکت اسے شوہر کو اسرار کر کے لانے میں مانع ہوگئی اور وہ گاڑی میں ایک ڈرائیو لینے نکل گئے۔

وہ تینوں ماں بیٹے جب سرشار سے گھر پہنچے تو چندر کانت جیسے کہ سکتے کے عالم میں اسی صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ جیسی کسی شے کے کوئی آثار نہ تھے۔ منی آ کر باپ کے برابر بیٹھ گئی۔

''تھینکس ماما۔ بہت مزا آیا پاپا۔ آپ نہیں آئے۔''

اس نے جیسے کہ روٹھتے ہوئے کہا۔

''کل چلیں گے گھومنے۔۔''

روہنی نے چندر کانت کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

''ہے نا۔۔''

وہ بولی۔

''دیکھتا ہوں۔۔ اگر۔۔ وقت ہوا تو۔۔''

وہ بمشکل بولا۔ فوراً ہی اسے لگا کہ اس نے کچھ غلط کہہ دیا۔

''میرا مطلب ہے اگر۔۔ مُوڈ ہوا تو۔۔''

روہنی نے اس بے تعلقی کا کوئی نوٹس نہ لیا۔

''جانتی ہو بہت مائلیج دیتی ہے۔۔''

راہل منی سے کہہ رہا تھا۔

''بلوُ ویلویٹ' کے 'کور' چڑائیں گے 'سیٹس' پر۔''

منی بولی۔

''بلو۔۔ویل وَیٹ۔۔''

راہل نے ایک ایک لفظ کھینچ کر کہا۔

''کیوں کہ تیرا 'فیورِٹ کلر' ہے۔۔میرا کیوں نہیں 'میرُون'۔۔''

پرانی دونوں گاڑیوں میں الگ 'کلرس' تھے نا۔۔''

وہ کچھ سنجیدہ سا ہو گیا۔

''دوسری بھی آجائے گی۔۔آئی ہوپ۔۔تم لوگ اپنے پڑھنے میں دھیان لگاؤ بیٹا۔۔اینڈ سٹاپ وریئنگ۔۔کسی قسم کی کوئی فکر کرنا تم لوگوں کا کام نہیں ہے۔۔رائٹ؟''

''لیس مام۔۔۔''

دونوں نے ساتھ ساتھ کہا اور کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

روہنی نہانے چلی گئی۔

وہ نہا کر لوٹی تو چندر کانت کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔

''آیئے نا کہیں گھوم آئیں۔۔بہت پہلے کی طرح۔۔جب آپ نے مرسیڈیز لی تھی۔۔اور ہم دونوں۔۔''

روہنی کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی چندر کانت کھڑکی سے ہٹ کر فون کی جانب لپکا۔

''یہ تمہاری گاڑی ہے میری نہیں۔۔''

اس نے منہ پھیر کر کہا اور کوئی نمبر ڈائل کرنے لگا۔روہنی کچھ لمحے اس کی جانب دیکھتی رہ گئی۔ پھر اس کے ابروؤں کے درمیان ایک دو طویل سی لکیریں کھنچ گئیں جنہیں اس نے سر جھٹک کر بھگا دیا اور بچوں کے کمروں کی طرف چلی گئی۔

دوسری صبح جب روہنی شوروم جانے لگی تو چندر کانت نے اس کے 'بائے' کہنے کا جواب نہیں دیا۔اور ہونٹ بھینچے اسے سر سے پاؤں تک دیکھنے لگا۔

''یہ جینز۔۔یہ ٹاپ۔۔یہ کیا ڈریس پہننے لگی ہو تم۔۔'ولگر' لگتی ہو ان کپڑوں میں۔''

''آپ بھی حد کرتے ہیں۔۔ویسٹرن آؤٹ فٹس کا شوروم ہے میرا۔ساری یا سلوار سوٹ پہنوں گی تو کسٹمرس پر کیا امپریشن پڑے گا۔ویسے انڈین ڈریسز رکھنے کا بھی ارادہ ہے میرا کچھ وقت بعد۔۔پھر خود بھی پہنوں گی۔۔''

رونی کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

''اور ولگر کیوں کہا۔۔''

اس کی آواز میں گلہ شامل ہو گیا تھا۔

''تو اور کیا کہوں۔۔یہ ہماری سبھتا نہیں ہے۔تمہاری عمر کی عورتیں تو۔۔تم تو منی جیسے کپڑے پہننے لگی ہو۔''

رونی کی شکوے بھری آواز اس کے لہجے میں کوئی تاثر پیدا نہ کر سکی۔

''کتنے کرڈ ویل ہو تم۔۔''

رونی نے آہستہ سے کہا اور باہر نکل گئی۔

شوروم میں شوکمار شری واستو اور جگنو مرمریں کاؤنٹر کے اُسی کونے کے قریب کھڑے تھے جہاں 'دی مرمیڈ' کا سفید اور سنہرا 'لوگو' نصب تھا۔یعنی طلائی تاج والی نقرئی جل پری بڑی ادا سے ایستادہ تھی۔وہ دونوں بڑی سنجیدگی سے کوئی بات کر رہے تھے،رونی کو دیکھا تو اسی کی طرف بڑھے۔

''ارے۔۔یہ اداس صورت۔۔؟کیا معاملہ ہے۔''

شوکمار شری واستو جلدی سے بولا۔

'کیا ہوا میم۔۔''

جگنو نے تشویش سے کہا۔

''کچھ نہیں۔۔''

وہ جیسے کہ بمشکل بولی اور اپنی نشست پر جا بیٹھی۔

''ہم تو آج ایک فینٹاسٹک آئیڈیا لے کر آئے تھے۔۔''

شوکمار شری واستو نے کہا۔

''مگر آج آپ اداس ہیں۔۔اس لئے آپ کے دماغ پر کوئی بوجھ نہیں ڈالنا چاہئے۔۔ویسے 'یو نو سمتھن'۔۔؟''

وہ سرا ثبات میں ہلا کر ہلکے سے مسکرایا تو رونی اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''یو لُک گورجیس ان براؤنز۔۔ ویسے بھورے رنگ کے سارے 'شیڈس' آنکھوں کو بھلے لگتے ہیں۔۔ ہیں نا۔۔ باوقار لوگوں کی پسند۔۔''

شوکمار شریواستو کی آواز میں ہلکی سی اداسی تھی۔ یا شاید رونی کو ہی ایسا محسوس ہوا ہو۔

اس نے نظر اٹھا کر اسے پل بھر دیکھا۔ اور پھر میز کی دراز کھول کر اس میں کچھ ڈھونڈنے لگی۔

ایک تصویر پر اس کی نظریں ٹھہری رہ گئیں۔ کسی عمدہ مکان کے باغیچے میں کرسی پر بیٹھی ایک پروقار سی ادھیڑ عمر خاتون کی گود میں ایک پانچ چھ سالہ صحت مند بچہ مسکرا رہا ہے اور کرسی کے قریب عورت کے گھٹنے کا سہارا لئے کھڑی ایک ننھی سی قدرے چھوٹی اور دبلی بچی کچھ روٹھی سی کیمرے کو دیکھ رہی ہے۔

رونی کئی لمحے تک تصویر کو دیکھتی رہ گئی۔

مکان اس کی آنکھوں میں گھوم گیا۔ بڑے سے باغیچے میں چھوٹے چھوٹے پیروں سے بھاگتی منّی سی لڑکی بھی۔

اتنے بڑے مکان میں صرف تین مکین تھے۔ منّی سی بچی کے والد اور دادی ماں۔

اس کی جلد ماں کی طرح ہی سنہری سی رنگت لئے تھی۔ اس نے کئی دفعہ گھر میں یہ بات سنی تھی۔ حالانکہ اس بات سے پھوپھی بالکل خوش نہیں ہوتی تھیں۔ لیکن ماں اس کی کم عمری میں ہی دنیا سے چلی گئی تھی۔ اور منّی سی بچی کم عمری سے ہی باتیں اچھی طرح سمجھتی تھی اور دیر دیر تک ان پر سوچا کرتی تھی۔

اس کی پرورش دادی ماں نے کی تھی۔ مگر برابر کے گھر میں رہائش پذیر اس کی پھوپھی بھی اکثر سارا سارا دن ان کے گھر میں گزارا کرتی تھی۔ اور اس کے ساتھ سَنی بھی آتا تھا۔ وہ اس سے بڑا تھا پھر بھی دادی ماں اسے گود میں لئے لئے گھومتیں۔ جب کہ اس کی اپنی ممی بھی تھی۔ دادی ماں کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔

منّی سی لڑکی سوچوں میں کھو جاتی۔

پہلے پہل جب وہ اور بھی چھوٹی تھی تو بول ہی نہیں سکتی تھی۔ کیسے دادی ماں کو ان کی غلطی کا احساس دلاتی۔ اور جب اسے بولنا آ گیا تو بھی اسے بولنا نہ آیا۔ ایک تو سَنی اسے مارتا تھا دوسرے دادی ماں کی گود سے کھینچ کر اتار دیتا اور خود جا چڑھتا۔ دادی ماں اسے ایسی بری بات پر بھی نہ مارتیں۔ بس کہتیں

کہ ایسا نہیں کرتے، اور وہ بھی ہنس کر۔ پھر بھلا اتنی چھوٹی سی وہ لڑکی انہیں کیا سمجھاتی۔ اور پھوپھی تو بالکل اچھی نہ تھیں انہیں تو سمجھانے کی کوشش کرنا ہی بیکار تھا۔ بس ایسے میں وہ چپ چاپ روتی تھی۔ جب بابا کی چھٹی ہوتی تو کہیں گھومنے کا پروگرام بنتا، مگر اس کا بھی کوئی فائدہ نہ ہوتا کہ سنی وہاں بھی ساتھ ہوتا۔ اور جب بابا اسے گود میں لیتے تو پیچھے پڑ جاتا کہ اسے ہی اٹھایا جائے۔ اگر بابا ذرا سا کہہ دیتے کہ ابھی لیں گے تو روتا ہوا جا کر دادی ماں کی گود میں چڑھ کر کھی کھی کر کے ہنستا اور چھوٹی سی لڑکی کا منہ چڑاتا۔ پکنک کا سارا مزا خراب ہو جاتا۔

کبھی بابا سے اس کی شکایت کرتی تو وہ کہتے کہ وہ کچھ دن بعد انگلینڈ جائے گا تو سب لوگوں کا پیار صرف اسی کو ملے گا مگر بہت سارے سال گزر گئے، وہ گیا ہی نہیں۔ وہ بہت دن تک سوچتی رہی۔

بڑی مشکل سے جب کہیں سنی کے لندن جانے کا وقت آیا تو اس وقت چھوٹی سی لڑکی بڑی ہو گئی تھی۔ وہ خواتین کے کالج میں طالبہ تھی۔ دبلی پتلی ہو کر بھی اس کا چہرہ بھرا بھرا سا تھا۔ ایکدم گول سا ہو گیا تھا۔ اسے یہ سب معلوم نہیں تھا، لڑکیوں نے بتایا تھا۔

پھوپھی بضد تھی کہ گریجویشن کے بعد اس کی شادی کرا دی جائے۔ کہتی تھی بن ماں کی بچی ہے کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو لوگ ہمیں الزام دیں گے۔ ہماری تربیت میں نقص نکالیں گے۔ ہم منہ دکھانے لائق نہ رہیں گے۔

اسے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ سکول میں ذرا بھی وقت ملتا، کتب خانے میں جا بیٹھتی۔

آپ سب کے مسئلے حل کر دیتے ہیں۔۔ میرے کیوں نہیں۔۔ میں نے کچھ غلط سوچ لیا کیا۔۔ اس دنیا کو جاننا چاہتی ہوں۔۔ اگر مجھے کوئی بتائے تو۔۔ کوئی انسان۔۔ یا کتابیں۔۔ کوئی غلط ہے ایسا چاہنا۔۔

فصیل بند شہر پانی پت کے پندرہ دروازوں سے ہر راستہ اس شکستہ مگر پر شکوہ قلعے کی اور جاتا تھا جس کے برابر میں تقریباً سات سو برس پرانا ایک، مزار تھا۔ صوفی بزرگ شاہ قلندر کا۔

اس نے اداسی کم کرنے کا اپنے تئیں ایک آسان طریقہ ڈھونڈ نکالا تھا۔ خواجہ کی دہلیز کا بوسہ لے کر وہ ایک طرف دیوار سے لگ کر بیٹھ جاتی اور آتے جاتے لوگوں کے چہروں کو پڑھنے کی کوشش کرتی رہتی۔ لاشعور میں غالباً اس کے اپنے مسئلے ابھرتے ڈوبتے رہتے۔

ایک سکھ نوجوان سلیٹی رنگ کا صافہ باندھے سلیٹی واسکٹ کے اندر کرپان لٹکائے اپنی نئی نویلی

دلہن کے ساتھ خواجہ کا آشیرواد لینے حاضر ہوا تھا۔اس کے ساتھ سر پر گوٹے کناری والی چنری اوڑھے چاند سے چہرے والی ایک نوعمر لڑکی مہندی رچے ننگے پیروں کو سنبھل سنبھل کر فرش پر دھرتی ہاتھ جوڑے آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔

سیاہ قمیص پائجامہ پہنے ایک لمبے قد اور چھوٹی داڑھی والا لڑکا مزار کی چادر تھامے سر جھکائے زاروقطار رو رہا تھا۔اس کے سر پر قروشئے سے بنی گئی سفید ٹوپی تھی جس کے نیچے سے اس کے گھنے بال گویا بغاوت کر کر کے ماتھے پر آ جاتے تھے جنہیں ٹوپی کے اندر کی طرف سنوارنے کے بہانے وہ آنسو پونچھ لیتا تھا۔

پتلون پہنے دو سفید فام سیّاح خواتین سروں پر چھوٹے چھوٹے رومال باندھے، کیمرے گلے میں لٹکائے پرسکون نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی آگے بڑھ رہی تھیں۔

اگر اسے پڑھنے نہ دیا گیا۔۔تو۔۔وہ کیا کرے گی۔۔

اپنے محبوب مضمون کے بحرِ بے کراں کے کسی کنارے تک کیسے پہنچے گی۔۔

اس نے کچھ نیا سوچ رکھا تھا۔۔ایک ایسا کام جو اس سے پیشتر شاید ہی کسی نے کیا ہو۔۔ دیانت داری سے تاریخی حقائق کا بیاں ضرورت سے کتنا کم ہوا ہے۔۔وہ ایسی تاریخ لکھے گی جو کسی قومی، مذہبی، مسلکی یا کسی گروہ کے موقف میں نہ ہو۔۔بلکہ ایک سچی اور کھری تحقیق پر مبنی ہو۔۔اسے واقعات کو گلیمرایز یا فکشنایز نہیں کرنا ہے۔۔مگر تاریخ کا یہ لازمی حصہ۔۔یعنی خون خرابہ۔۔

کیا کیا اصطلاحات گڑھ رکھی ہیں لوگوں نے۔۔ان بہت سے تاریخ دانوں نے۔۔

جنگِ عظیم۔۔

گھمسان کی لڑائی۔۔

کشتوں کے پشتے۔۔

خون کی ندیاں۔۔

یعنی پانی جیسی شفاف اور روح پرور چیز۔۔اور بہتے خون کا خوفناک منظر۔۔

سروں کے مینار۔۔

خون سے میدان لالہ زار۔۔یعنی پھول اور خون۔۔

اپنی جان کو دنیا کی ہر شے سے عزیز رکھنے والے انسان کو دوسروں کے بریدہ سر کاغذ کے صفحات پر سجانے میں ذرا تامّل نہیں۔۔جنگ جیسی شے اگر لازمی ہے تو اس کی ان جزیات کا بیان انسان اس طرح کیسے کر سکتا ہے۔۔

کیسی کیسی تشبیہات دی گئی ہیں کہ۔۔خون ریزی کے ذکر سے لطف اندوز ہونے کی کوشش یہ انسان ہی کر سکتا۔۔ خون بہانے والا شر پسند انسان۔۔اقتدار کا دیوانہ انسان۔۔طاقت کا شیدائی انسان۔۔حکومت کرنے کے لئے جان لینے والا انسان۔۔

وہ ایسے نہیں لکھے گی۔۔اسے کوئی زیادہ سے زیادہ قاری بٹورنے یا چونکانے کے لئے تھوڑے ہی لکھنا ہے۔۔اسے بس سچ لکھنا ہے۔۔

اور سچ کے سوا کچھ نہیں۔۔

اس نے ایسی اپنائیت بھری نظروں سے مزار کی جانب دیکھا جیسے شاہ قلندر اس کی بات سن کر مسکرائے ہوں۔

ایک جملہ بھی نہیں۔۔یوئرآنر

ایک لفظ بھی نہیں۔۔یوئر۔۔آنر۔۔

وہ خود بھی مسکرادی۔

بڑے شاہ قلندر کی اس درگاہ میں تقسیم سے قبل میلے کا ساسماں ہوا کرتا تھا۔ایک دن دادی نے کہا تھا۔مگر پھر ادھر بس آنے والوں نے بھی بابا سے پہلے جیسے لوگوں کی سی عقیدت رکھی۔شردھا رکھتے ہیں ہم بھی اپنے بابا کے لئے۔وہ پھر مسکرا کر ادھر دیکھنے لگی۔

بہت کام کرنے ہیں۔۔بابا۔

اسے، تاریخی حیثیت سے عظیم، اپنے اس شہر پانی پت کی تاریخ سے شروعات کرنا ہوگی۔۔تاریخی عظمت کی شروعات۔۔یعنی تاریخ کا ایسا کارنامہ کہ جس دور میں انسان نے ترقی کی۔۔امن وامان سے رہا ہو۔یعنی جنگ وجدل کے بغیر باقی سب۔۔مگر کوئی کسی ملک پر حملہ کرے گا تو۔۔تو کیا وہاں کا سلطان تھوڑی اپنی سلطنت اس کے حوالے کردے گا کہ آ، بھائی تیرا ہی انتظار تھا۔۔اور مجھے اپنی غلامی میں کوئی مقام عطا کر۔۔

وہ زیر لب مسکرادی۔

مگر ایسی مثالیں بھی تو ہیں نا کہ۔۔

ہاں جب حملہ آور کے پاس ایسی طاقت ہو کہ اس کا مقابلہ نہ کیا جاسکے تو دانش مند لوگ بغیر انسانی جانیں ضائع کئے خودسپردگی کر دیتے ہیں۔۔

کیوں آیا تھا بابر، ابراہیم لودھی سے ناخوش امیروں وزیروں اور رشتہ داروں کی دعوت پر

لڑنے۔

اگر ابراہیم لودھی نے بابر کے آگے ہتھیار ڈال دیئے ہوتے۔اس کی لاکھوں کی فوج بابر کے بارہ ہزار فوجیوں سے ہار گئی کہ بابر نے بندوق کا استعمال کیا تھا۔اس سرزمین پر پہلی بار گولی بارود۔۔اور اس کے پاس کتنی ہی ہاری اور جیتی ہوئی جنگوں کا تجربہ تھا۔۔

لڑکی کی نظر سے کل ہی کسی کتاب میں اس بات کی مزید تفصیل گزری تھی۔

فرغانہ اور آخسی کے حکمراں اور اپنے والد عمر شیخ کی اچانک وفات سے نوعمر تخت نشیں بابر کو ایسے کاموں یا کارناموں میں کہاں دلچسپی تھی۔۔جو وقت نے اس کے سپرد کردی۔

اور پھر اچھا بھلا تو تھا وہ اپنے اندجان، اپنے سمرقند و بخارا، تاشقند و ہرات جیسے مقامات کو آتا جاتا جیتتا ہارتا۔۔دریائے 'قوا' کے آر پار رہتا۔۔گھوڑی کے دودھ کا 'قمیز' پی کر تازہ دم رہتا۔نثر نگار بابر۔۔شاعر بابر۔۔کسی۔۔قارہ کوز، یعنی سیاہ چشم۔۔کسی سیاہ چشم حسینہ کے ساتھ۔۔زندگی گزار لیتا۔۔اپنے حرم سے مطمئن۔۔خون خرابے سے دور۔۔مگر۔۔تخت کی ذمہ داریاں۔۔طاقت کے تقاضے۔۔حکومت کے تقاضے۔۔حکومت کا نشہ۔۔

مغل بادشاہ کہا جاتا ہے اسے۔

اسے تیموری کہلانا پسند تھا۔۔مغلوں سے اس کی لڑائی رہتی تھی۔۔اور ہمارے یہاں وہ دور مغلیہ دور کہلایا۔۔کیوں۔۔اسے یہ سب تحریر کرنا ہوگا۔۔

وہ سب لکھے گی۔۔منفی بھی اور مثبت بھی۔

اسی کے شہر میں لڑی تھی اس نے لڑائی۔۔پانی پت کی پہلی لڑائی۔

وہ کھڑی ہوگئی۔اس نے خواجہ کے مزار کی سیاہ مخملی چادر پر الوداعی نظر ڈال کر پرنام میں ہاتھ جوڑے اور چار پیچھے الٹے قدم اٹھاتی واپس مڑ گئی۔

اس کے بعد اس نے کسی طرح اپنے والد کو منا کر کچھ وقت اور پڑھنے کی اجازت حاصل کر لی، مگر مضامین اس کی خواہش کے مطابق نہ ہو کر اس کی پھوپھی کی مرضی کے تھے۔

کل کو یہ ہنر اس کے کام بھی آسکتا ہے۔تاریخ پڑھ کر اس کا کیا بھلا ہوگا۔

پھوپھی نے جواز دیا تھا۔اور دادی ماں نے بھی تائید کی تھی۔

سنی بابر نہ گیا ہوتا تو اسے سرے سے آگے پڑھوانے ہی کی مخالفت کرتا۔ اس کی غیر حاضری میں پڑھنے کی اجازت مل جائے۔۔ کچھ بھی۔۔ تاریخ تو اس کا شوق ہے اسے پورا کر ہی لے گی کسی طرح۔۔

وہ سوچا کرتی۔۔

پھر بابا کو اس پر وشواس رکھنا چاہیئے تھا۔ یہ اونچ نیچ کیا ہوتی ہے۔ سکول بھی تو کتنا دور تھا۔ کبھی کبھی جب ڈرائیور بھی نہیں ہوتا تھا۔۔ سنی اور بابا دونوں ہی مصروف ہوتے تو۔۔ اکیلی ہی تو آجاتی تھی وہ بس یا آٹو رکشا پکڑ کر۔۔ اور کسی دن تو کوئی لڑکی بھی نہ ہوتی تھی اس کے ساتھ۔۔ اونچ نیچ۔۔ کسی سے ایک غیر ضروری بات تک نہ کی تھی اس نے کبھی۔۔ کتنا مصروف اور بھیڑ بھاڑ والا شہر ہو جاتا تھا سکول کے اوقات میں۔۔ کاروباری اداروں سے بھرا شہر۔۔ ٹرکوں میں سامان آ جا رہا ہے۔۔ کپڑے اور اُون کی مصنوعات۔۔ کہیں فوجیوں کے لئے کمبل جا رہے ہیں۔۔ کہیں بستروں کی آرائش کے سامان سے لدا ٹیمپو۔۔ کہیں قالین۔۔ غالیچے۔۔ کہیں رنگ برنگے اون کے بے شمار نرم نرم گولے پالیتھین کی شفاف تھیلیوں کے عقب سے جھانکتے، ڈبوں میں ٹھنسے گاڑیوں میں بھرے ہیں۔ اور اس کے علاوہ اور بھی جانے کیا کیا۔۔ اور ملک کے نہ جانے کون کون سے کونے سے روزگار کی تلاش میں آئے لوگ۔ کارکن، تکنیکی ماہرین، انجینئیر۔۔ الگ الگ صورت والے، جدا جدا رنگت والے۔۔ مختلف زبانیں بولنے والے۔۔ مختلف قد کاٹھی کے۔۔ اور کہتے ہیں کہ۔۔ ان کی تربیت۔۔ اور وہ کیسے تباہ ہوں گے۔۔

اسے ہنسی آجایا کرتی تھی کبھی کبھی سوچتے ہوئے۔۔ وہ پانی پت کی چوتھی لڑائی لڑنے جا رہی تھی کسی کے ساتھ کیا۔۔

اسے اس بات پر زور سے ہنسی آئی اور کچھ دیر اس کے ہونٹوں پر ہی ٹکی رہی۔

کہتے ہیں مہا بھارت کی لڑائی میں دریودھن نے جن پانچ گاووں کی مانگ کی تھی ان میں ایک۔۔ پن پت تھا جو بعد میں بگڑ یا سنور کر پانی پت ہو گیا۔ یعنی سنور کر۔۔ پن پت کیسا عجیب لگتا ہے کہنے میں۔۔ سوچتے سوچتے وہ ہلکے سے مسکراتی۔۔ مگر کیا معلوم عجیب نہ لگتا۔ اگر ہمیں پن پت کہنے کی عادت ہوتی تو پانی پت کہنا عجیب لگ سکتا تھا۔۔ جنگ سے پرانا رشتہ ہے اس کے اس شہر کا۔۔ اکبر اعظم نے ہیمو سے لڑ کر اپنے راج کو اور مضبوط کر دیا تھا۔۔ پھر احمد شاہ ابدالی مرہٹوں سے لڑا اور مرہٹے ہار گئے تھے۔۔ ان تین بڑی۔۔ یعنی خطرناک جنگوں نے ہندوستان کی تاریخ کو ایک نیا موڑ دیا ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اگر یہ تین جنگیں نہ ہوئی ہوتیں تو اس ملک کی تاریخ کیا ہوتی۔۔ اس نے پل بھر کو

سنجیدگی سے سوچا۔ مگر اسے اپنا یہ خیال ایسا بے تکا محسوس ہوا کہ وہ دوبارہ ہنس دی۔۔

کاش وہ۔ اس سب کو کاغذ پر اُتار سکتی۔۔

وہ سنجیدہ ہوگئی۔

خیر اب ایک جنگ۔۔ ایک اور جنگ اسے لڑنا ہوگی۔ ان سب سے جو یوں ہی اسے۔۔ جس سے اس گھر کے مکینوں کو ذرا عقل آئے۔۔ اور یہ سمجھ جائیں۔۔ کہ۔۔ نہیں وہ ثابت کردے گی کہ اسے خود کو سنبھالنا ان سے بہتر طرح آتا ہے اور کوئی اونچ نیچ کا اس کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اور تھا بھی تو نہیں۔۔ پھر۔۔؟ بلاوجہ۔۔!

اس دن انسٹیٹیوٹ میں اس کا غالباً تیسرا دن تھا۔ جس بس سٹاپ پر اینسٹیٹیوٹ کی بس آنا تھی وہاں اِدھر اُدھر اور لوگ بھی منتظر کھڑے تھے۔ سکول کا بستہ لئے ایک چھوٹے سے بچّے کے ساتھ ایک نوجوان سکول بس کے انتظار میں کھڑا لڑکی کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا۔ لڑکی اس طرح کے کسی واقعے سے اس وقت تک دوچار نہ ہوئی تھی اور یہ بات تو اسے لڑکیوں نے بتائی بھی نہ تھی، بس سٹپٹا کر رہ گئی۔ آخر کسی طرح بس آئی اور اس نے سکھ کا سانس لیا۔

مگر سکھ کا سانس کچھ عارضی ثابت ہوا کہ اگلے دن نوجوان پھر اسے دیکھ رہا تھا۔ لیکن بچے کی بس جلد آ گئی اور وہ نوجوان چلا گیا۔

اس کے بعد ہفتے اور اتوار کی دو چھٹیاں تھیں۔ اس کے ذہن سے یہ بات محو ہوگئی۔ مگر پیر کے روز معاملہ کچھ اور مشکل نظر آنے لگا۔ بچے کو بس میں بٹھانے کے بعد بھی نوجوان وہیں کھڑا اسے رہ رہ کر دیکھتا رہا اور وہ بظاہر سڑک کے اس پار آم کے بڑے سے درخت کے تنے کے پاس 'ہیلمیٹ' فروخت کرنے والے شخص کے پاس آتے جاتے خریداروں کو دیکھتی رہی اور بے خبر بنی اندر اندر الجھتی رہی۔ اس کے بعد سارا وقت وہ پریشان سی سوچوں میں گم رہی۔

اس نے ایک آدھ کلاس سے بھی ناغہ کر لیا۔ یہاں تک کہ اس کی ایک ہم جماعت اسے تلاش کرتی لائبریری کے اس کونے تک پہنچ گئی جہاں وہ ایک کتاب 'انڈس ویلی سویلائی زیشن' کا وہ صفحہ کھولے بیٹھی تھی جو دو روز قبل اس نے آدھا پڑھا تھا۔ اور جانے کتنی دیر سے آنکھیں پھاڑے اسے گھور رہی تھی۔

"کیا سوچا جا رہا ہے۔"

ہم جماعت اچانک بولی تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"میم پوچھ رہی تھیں تم کو بھائی۔ یہاں کیا کر رہی ہو۔ کلاس نہیں چلنا کیا؟"

لڑکی خاموش اسے دیکھتی رہی۔

''کچھ بولو بھی تو۔۔ کیابات ہے۔۔''

''کچھ نہیں رادھیکا۔۔''

لڑکی کی اداس آواز ابھری۔

'' کچھ کیسے نہیں ۔۔ جلدی بتاؤ۔ کوئی پرابلم ہوگی تو حل کرلیں گے ۔ایسے بت کی طرح تمہارے چپ رہنے سے میں بھی پریشان ہوسکتی ہوں نا۔۔چلو باہر چلیں۔''

خاموش لائبریری سے وہ لوگ باہر آئے تو رادھیکا نے دیکھا کہ لڑکی کی آنکھوں میں آنسو لبالب بھرے تھے۔اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ ہچکیاں لے کررو پڑی۔

''رادھیکا اب میرا آگے پڑھنا مشکل ہے۔۔''

وہ مدھو مالتی کی بیل کے قریب پتھر کے بنچ پر بیٹھ گئیں۔سامنے کینٹین سے کچھ طالبات ضائع کردئے جانے والے گلاسوں میں چائے لے کر اسی طرف آرہی تھیں۔مگر دور سے انہیں کچھ اورلڑکیاں آتی نظر آئیں۔

انہیں دیکھ کراس کے چہرے پر بیچارگی سی چھائی ہی تھی کہ انہیں دوسری طرف جاتے دیکھ کر وہاں اطمینان کی ایک لہرسی آکر چلی گئی۔

ساری بات سن کر پہلے تو رادھیکا کو ہنسی آگئی مگر پھراس کے گھر کی فضا جان لینے کے بعد وہ بھی سوچ میں پڑ گئی۔

''گھر میں بتادوں تو میرا باہر نکلنا تک بند ہوجائے گا،وہاں کسی کو سوائے حکم دینے کے میری کہاں پرواہ ہے جو میرے شوق کے لئے میرا ساتھ دیں۔۔پڑھائی کا تو پھر سوال ہی نہیں۔۔اور اگر انہیں نہ بتاؤں تو یہ آدمی میرا جینا مشکل کردے گا۔''

وہ بے بسی سے بولی۔

''مگر تم نے کیسے سوچ لیا کہ وہ کبھی تمہارا پیچھا ہی نہیں چھوڑے گا۔تم لفٹ نہیں دوگی تو اپنے آپ ہی باز آجائے گا۔''

''نہیں۔ مجھے ایسا نہیں لگتا۔ مجھے تو ڈر سا لگتا ہے اس کے اس طرح ہاتھ دھو کر پیچھے پڑجانے سے۔جیسے کہ اس نے پیچھا نہ چھوڑنے کی ٹھان لی ہو۔

''ضروری نہیں تمہاری بات سچ ہی نکل آئے۔۔''

''ہاں ہوسکتا ہے۔مگر پتہ نہیں کیوں مجھے۔۔۔کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔۔کیا کروں۔۔''

کافی سوچ بچار کے بعد طے ہوا کہ گھر میں خاموش اور بس سٹاپ پر قطعی لاتعلق رہنا ہی دانش مندی بلکہ مسئلے کا واحد حل ہے۔گو کہ مشکل مگر کارگر ہونے کی امید سے پُر۔

تاریخ کو اپنے اندر کہیں غالباً عارضی طور پر دفن کر کے اس نے انسٹیٹیوٹ میں دل لگانے کی بھرپور کوشش کی۔

وہ بڑی محنت سے اپنی تربیت جاری رکھے ہوئے تھی۔فیشن ڈِزائننگ کے کڑھائی والے پیریڈ میں اس کا دل لگ ہی جاتا۔

کبھی بغیر پتوں کی خمدار بیلوں کے ساتھ ننھے ننھے پھول جوڑ دیتی۔کہیں بغیر ڈنڈی کے بہت سی کلیوں کے درمیان برابر کی پتیوں والا ایک بڑا سا پھول سجا دیتی۔ایک پوری آستین پر بے شمار ستاروں کی ساخت کی کڑھائی ہے تو دوسرے مونڈھے پر ایک دائرے میں کڑھے ستاروں کے درمیان بڑا سا نقشین بادام پھر بادام کے درمیان بہت سے ستارے۔اور اسی طرف گریبان کے آدھے حصے پر کچھ ستارے کچھ بادام۔ورنہ پھر صرف دامن پر جیومیٹریکل ڈِزائن والا بڑا سا پھول اور پھول سے لگے دو بڑے پتے جو بادام جیسے نظر آتے۔

تین برس کے ٹریننگ کورس کا دوسرا سال ختم ہونے والا تھا۔دو برس میں مشکل سے ہی کوئی دن ایسا گزرا ہوگا جب اس نوجوان کی نظروں نے لڑکی کا تعاقب نہ کیا ہو۔کبھی کبھی تو بچہ اس کے ساتھ غالباً سکول میں چھٹی کے باعث نہ ہوتا مگر وہ خود بس سٹاپ پر موجود نظر آتا۔نوجوان نے اس سے بات کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی گو کہ اب لڑکی کو پہلے کی طرح اس کی موجودگی سے خوف نہیں آتا تھا۔ادھر کبھی لڑکی کا جی چاہتا وہ پیارے سے ہنس مکھ بچے سے دوستی کرلے کہ سکول بس دیر سے آنے کی صورت میں اس نے کئی دفعہ لڑکی کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا جسے لڑکی نے نوجوان کے رویئے کے باعث قبول نہیں کیا تھا۔بس چپکے سے ذرا سا مسکرا کر دوسری جانب سرک جایا کرتی تھی۔

اس دن چوتھے سمسٹر کے امتحان کا پہلا دن تھا۔لڑکی نے بس سٹاپ پر پہنچ کر چھاتہ بند کردیا

مگر سیمنٹ کی مختصر سی سیلنگ سے پانی کے قطرے ٹپ ٹپ کر اس کے بال بھگونے لگے۔ جیسے ہی اس نے اوپر کی جانب دیکھا۔ ایک موٹا سا قطرہ ٹپ سے اس کی آنکھ میں آ گرا۔ اس نے جلدی سے چھتری سر پر تان لی۔ آس پاس ساری نشستیں خالی تھیں اور سیمنٹ کے بنچ نہ صرف بھیگے ہوئے تھے بلکہ ان میں پانی بھی جمع ہو گیا تھا۔ کہیں بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی۔ وہ کھڑی رہی۔ تین دن سے بے موسم کی بارش جیسے کہ کسی سازش کے تحت مسلسل برس رہی تھی۔ لڑکی کے ماتھے پر سلوٹیں ابھر آئیں۔ سڑکوں پر پانی بھر آیا تھا اور ابر کے پہاڑ نما دیو ہیکل ٹکڑے کسی بدمست ہاتھی کی طرح رہ رہ کر چنگھاڑ رہے تھے۔ صبح کے دس بجے کے وقت شام کا سا نیم اندھیرا چھا گیا تھا۔ سیاہ فام آسمان کی مسلسل گرج سے سنسان سٹاپ پر کھڑی لڑکی کی نظریں بے اختیار اپنی داہنی جانب اُٹھ گئی تھیں۔ آج پہلی بار نوجوان بس سٹاپ سے غیر حاضر تھا۔ سٹاپ کے مغرب کی طرف کنکریٹ کے ستون کے پاس لڑکی نے جس مقام پر اسے پچھلے دو برس تک بلا ناغہ کھڑا دیکھا تھا، آج خالی تھا۔ لڑکی نے پل بھر کو ستون کی جانب دیکھا اور نظر دوسری طرف کر لی۔

اس دن پرچے کے دوران اس کی نظروں میں ایک آدھ بار ستون کا خالی احاطہ گھوم گیا تھا اور وہ دوبارہ کام میں مشغول ہو گئی تھی۔

امتحانات دو دو تین تین دن کے وقفے سے تھے، اس دوران نوجوان اسے بس سٹاپ پر نظر نہیں آیا۔ اسے اس کا انتظار تھا، یا وہ اس کے نہ آنے سے پرسکون تھی، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

رزلٹ آنے میں ایک مہینہ تھا۔ وہ بابا اور دادی ماں کے ساتھ چھٹیاں گزارنے کہیں پہاڑوں پر چلی گئی۔

(پھوپھی ان دنوں بیٹے سے ملنے لندن گئی تھیں۔)

پہاڑ پر چند ایک دفعہ اس کی نظروں میں خالی ستون اور بہت سی دفعہ ستون سے لگ کے کھڑا نوجوان گھوم گیا۔ پتہ نہیں کس خیال کے تحت۔

جس شام وہ لوگ پہاڑوں سے لوٹے، اس نے ملگجی روشنی میں گھر کے پھاٹک سے کچھ دور اس نوجوان کو ٹہلتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کی انگلیوں میں سگریٹ بھی دبی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ لمحہ بھر کو ٹھٹھکی تھی۔ لڑکی کو دفعتاً خیال آیا کہ اس سے پہلے اس نے کبھی اس کے ہاتھ میں سگریٹ نہیں دیکھی تھی۔ پھر اگلے پل وہ سر جھٹک کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

دوسرے دن وہ بس سٹاپ پر موجود تھا۔ آج بچہ بالکل خاموش سا، نوجوان کی ٹانگوں سے لگا کھڑا تھا۔ لڑکی نے آہستہ سے نظر بچا کر اسے دیکھا۔ وہ بےحد کمزور نظر آ رہا تھا۔ پھر اس نے نوجوان کی

طرف دیکھا تو وہ بھی کچھ پریشان حال سا نظر آیا۔لڑکی فوراً دوسری جانب دیکھنے لگی۔نوجوان نے اسے اپنی طرف دیکھتے ہوئے دیکھا تھا، وہ اس کے قریب چلا گیا۔

''اس کی ماں۔۔نہیں رہی۔۔''

وہ آہستہ سے بولا۔

لڑکی جو اتنے برس میں پہلی دفعہ اس کے اچانک مخاطب ہونے سے کچھ ٹپٹا سی گئی تھی، اس کی بات سن کر ہکا بکا سی ایک آدھ سیکنڈ اسے دیکھتی رہ گئی۔ابھی اس نے بچے کی طرف گردن موڑی ہی تھی کہ اس کی بس آ گئی۔وہ بچے کی طرف دیکھتی ہوئی بس میں سوار ہو گئی۔اس کا منہ ادھ کھلا تھا اور وہ بس میں بیٹھ کر بھی بچے کی طرف دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔سٹاپ کا منظر جب پیچھے رہ گیا تو اسے احساس ہوا کہ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا ہے۔اس بات کا خیال آتے ہی اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

اس رات وہ سو ہی نہ پائی تھی اور اگلی صبح وقت سے کچھ پہلے ہی بس سٹاپ پہنچ گئی۔

نوجوان کے آتے ہی وہ بچے کے قریب چلی گئی۔جس وقت تک اس کی بس آئی وہ اس سے باتیں کرتی رہی۔اگلے دن بھی وہ بچے کے پاس چلی گئی۔رفتہ رفتہ اس کا معمول بن گیا کہ وہ صبح کچھ جلد جا کر بچے کے ساتھ وقت گزارتی۔بچہ کبھی جواب دیتا کبھی گم سم سا دیکھتا رہ جاتا۔

نوجوان کی موجودگی سے گھبرانا اب پرانی بات ہو چکی تھی۔وہ اس سے بات کرنے کی دانستہ کچھ ایسی کوشش نہ کرتا تھا مگر کبھی کبھار بات ہو جایا کرتی تھی۔وہ اسے اسی انداز سے چپ چاپ دیکھا کرتا۔

بچہ اب اس سے کچھ کھل گیا تھا بلکہ مانوس بھی ہو گیا تھا۔اب وہ اپنی ننھی ننھی باتیں اس سے کیا کرتا تھا۔

پھر ایک صبح نوجوان بس سٹاپ پر اکیلا آیا۔اس نے بچے کے بارے میں پوچھا تو پتہ چلا کہ وہ بیمار ہے۔

اگلے دو دن نوجوان ہی آیا اور نہ بچہ۔لڑکی بے چین سی منتظر رہی۔اس کے بعد کے دو دن ہفتہ اور اتوار کے تھے۔لڑکی پر اداسی کا حملہ سا ہو گیا تھا۔وہ ٹھیک سے سو پائی نہ ڈھنگ سے کچھ کھا پائی۔ان لوگوں کے بارے میں کچھ جانتی بھی نہیں تھی۔

معاً اسے خیال آیا کہ اگر وہ لوگ کبھی نہ آئے تو؟

تو کیسے تلاش کرے گی ان کو؟

''اس بچے کو؟

اور اس۔۔اس نو جوان کو۔۔خاموش، سنجیدہ سے، ثابت قدم سے اس نو جوان کو۔۔

اور۔۔اگر اس بچے کی بھی۔۔اگر کوئی پھوپھی ہوئی تو؟۔۔تو سب پھوپی کی ہی بات مانیں گے۔۔اور۔۔اور۔۔''

اس نے بالکل بچوں کی طرح سوچا تھا۔

بچے کا بھولا سا چہرہ اس کی آنکھوں میں گھوم گیا۔

پیر کے روز نو جوان پھر اکیلا آیا تھا۔لڑکی کی بے قراری نگاہیں اس کے اطراف گھوم گئیں۔

''اس کی طبیعت۔۔کیا اب بھی خراب۔۔''

لڑکی نے نو جوان کے چہرے پر بے چینی سے تھرکتی ہوئی پتلیاں دوڑائیں۔

''ہاں۔۔راہل اپنی ماں کو بہت یاد کرتا ہے۔۔''

نو جوان پریشان سا بولا۔

''اور گھر میں کیا۔۔ کوئی نہیں جس سے وہ مانوس ہو۔''

''سب ہیں۔۔دادا دادی چچا پھوپھی۔۔مگر اس کی اداسی کسی صورت۔۔''

نو جوان۔کے چہرے پر کرب اتر آیا تھا۔

''اور اس کے فادر۔۔؟''

لڑکی کچھ حیرت زدہ سی فوراً بولی۔

میں۔۔میرا بیٹا ہے وہ۔۔''

نو جوان پہلے جیسے ہی لہجے میں رک کر بولا۔

لڑکی کے چہرے کی حیرت اس کا جواب سننے سے پہلے ہی غائب ہوگئی تھی غالباً اس کے چہرے کا کرب دیکھ کر اسے اچانک اس جواب کی توقع ہوگئی تھی۔۔اس نے سر جھکا لیا۔اور سنجیدہ سی اپنے پیروں کی جانب دیکھتی رہی۔

''تم۔۔شادی کر لو۔اگ۔۔ر۔۔مجھ سے تو۔۔اس کو۔۔اس کو۔۔ماں۔۔مل جائے گی۔۔اور میں۔۔تم۔۔میں۔۔میں۔۔''

چندر کانت نے لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے اسی لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر کہا۔لڑکی نے اپنا سنجیدہ چہرہ اوپر کیا اور اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔

چندر کانت ناگپال کے گھر کا کوئی فرد اس رشتے پر رضا مند نہ تھا۔اور روہنی ساہنی کی دادی ماں اور والد اپنی نوعمر اور غیر شادی شدہ بیٹی کی زبان سے ایک بچے کے باپ سے شادی کرنے کے ذکر پر مارے غصّے کے کھول رہے تھے۔

لیکن روہنی جیسے کہ فیصلہ کر چکی تھی۔گھر والوں کی ہر بات خاموشی سے مان جانے والی روہنی کو اس کے اس ارادے سے کوئی باز نہ رکھ سکا۔

''اتنے غور سے۔۔اتنی دیر تک کیا دیکھا جا رہا ہے۔۔میز کے اندر۔۔''

شوکمار شرواستو مسکرایا تو روہنی ناگپال نے ایک لمبی سی آہ بھر کر دراز بند کر دی اور ہلکے سے مسکرائی۔

''سوری۔۔کچھ خاص نہیں۔آپ اپنا آئیڈیا سنائیے۔''

اس نے مسکراہٹ چہرے پر قائم رہنے دی۔اور دونوں کہنیاں میز پر ٹکا کر ہتھیلیوں میں ٹھوڑی تھام لی۔

جگنو پچھلی تقریب کی تصاویر ہاتھ میں لئے ہنستی مسکراتی کاؤنٹر پر آ گئی۔انگریزی سے لکھے 'مرمیڈ کے دونوں 'ایم' اور 'آئی' کا نقطہ جو بجلی کے بلبوں سے تاج کی صورت روشن 'لوگو' میں دمکتے رہتے،تقریباً تمام تصویروں میں جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔

کچھ دیر کے لئے روہنی کو یقین نہیں آیا کہ یہ تصویریں اسی کی منعقد کردہ تقریب کی ہیں۔۔یہ بڑے بڑے 'ڈزائنرس' اسی کے تشہیری جلسے میں شریک ہونے آئے ہیں۔کیا واقعی تقدیر اس پر مسکرا اٹھی ہے۔کیا واقعی وہ بیکاری کے خیال،بے روزگاری کے خدشے،اور بے شناخت ہونے کے انجانے خطرے سے نکل آئی ہے۔۔(شناخت کا خیال اسے اُسی لمحے آیا تھا۔)۔کیا سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے۔۔ٹھیک ہو رہا ہے۔۔اس کا۔۔اس کے گھر کا مستقبل محفوظ ہو گیا ہے۔۔ہو۔۔رہا ہے۔۔پھر یہ کیا ہے جو اچانک ابھی ابھی ذہن میں کھنچ آئی ست رنگی قوسِ قزح کے بیچ دھوئیں کی لکیر سا لہرا گیا تھا۔۔

ولگر لگ رہی ہو۔۔اس لباس میں۔۔

کتنی کوشش کی تھی اس نے کہ چندر کانت ہر عام انسان کی طرح۔۔ایک اچھے باپ کی طرح۔۔ایک اچھے شوہر کی طرح۔۔اپنے کام میں بذاتِ خود دلچسپی لے۔۔ورنہ۔۔ ان دل دکھانے والی باتوں کی۔۔نوبت کیوں آتی۔۔

ولگر۔۔ ولگر۔۔یعنی۔۔بے حیا۔۔یا برہنہ۔۔ یا بے شرم۔۔یا آوارہ یا۔۔یا عیاش۔۔ یا۔۔یا۔۔؟

یا۔۔کچھ نہیں۔۔وہ ایسی کچھ نہیں ہے۔۔وہ ایک انسان ہے۔۔ایک ماں ہے۔۔جو کسی نہ کسی طرح اپنی گھر جنت میں خوش تھی۔۔اسے فیشن ڈزائننگ میں ڈپلوما ہی یاد تھا نہ اپنا محبوب مضمون تاریخ۔۔وہ دو معصوم اذہان کی ماں ہے۔۔دو خوابوں بھری زندگیوں کی۔۔دو مستقبلوں کی۔۔ جن کو عمر کے اس حساس موڑ پر وہ اندیشوں میں مبتلا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ معمولی آسائشوں کے لئے ان کا حالات کے ساتھ مجبور سمجھوتا کرنا اسے ریزہ ریزہ کئے دیتا تھا۔

وہ تصویروں کو بغور دیکھتی رہی۔ چھوٹے ترشے بالوں اور کچھ دبلے ہو گئے بدن میں وہ اچھی لگ رہی تھی۔

شوکمار شریواستو کا نیا آئیڈیا گو بالکل ہی نیا نہ تھا مگر رہنی کی جیولری ڈزائن میں مہارت کے سبب اس میں نئے امکانات ضرور تھے۔

''کچھ زیادہ بوجھ نہیں ہو جائے گا۔۔''

شہر کے 'میریڈئین' میں ڈنر کے دوران اس نے 'پرپوزل' سن کر سوال کیا تو شوکمار شریواستو کی بجائے جگنو نے ہاتھ میں تھاما کانٹا جس میں اس نے ابلی مٹر کا ایک دانہ ابھی ابھی پرویا تھا، پلیٹ میں رکھ دیا۔

''نہیں رہنی۔۔ذرا سوچو شوشری ٹھیک کہتے ہیں۔۔یہ کچھ اتنے بوجھ والا کام نہیں۔۔ بلکہ تمہارے ڈپلوما میں چار چاند لگانے والا ہے۔۔وہ ایسے کہ۔۔''

شوکمار شری واستو نے ہاتھ سے ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔

''وہ ایسے کہ۔۔''

اس نے پلٹ کر بار کی طرف نظر دوڑائی تو بار کی ہلکی روشنی میں ویٹر کلف لگے سفید براق جگمگ جگمگ کرتے کپڑے میں لپٹی آدھی بھری بوتل ٹرے میں لئے لپکا اور شوکمار شریواستو کے جام میں چند قطرے انڈیل کر خواتین کی طرف دیکھنے لگا۔

''سم موو وائن میم ؟''

وہ آدھی کمر اور پورے شانے جھکا کر بولا۔

''او۔نو۔۔''

روہنی نے جلدی سے کہا۔

''او۔یس۔''

جگنو نے ہنس کر کہا تو روہنی اور شوکمار شریواستو بھی ہنسے۔ویٹر نے ہونٹ بھینچ کر مسکرانے کے انداز میں پھیلائے اور نہایت ادب سے سر کو بیک جنبش خم دے کر جھکایا اور فوراً سیدھا کیا۔

''شیور میم۔''

اس نے ان دونوں کے خالی جام جو ہلکے ہرے گل بوٹوں والے کانچ سے بنے تھے، اپنے دستانے والے ہاتھوں سے اٹھا کر سفید رومال سے ڈھکی کشتی پر بے آواز رکھے۔ پھر سر کو ہلکی سی جنبش دے کر پھرتی سے ایک قدم پیچھے ہٹا اور واپس مڑا۔

''ویٹر۔۔''

شوکمار شری واستو نے جلدی سے مگر دھیمی آواز میں پکارا۔

''ہماری بلو لیبل کہاں لئے جا رہے ہو یار۔۔ ہم اپنی سیوا خود کرنے کے موڈ میں ہیں بھائی۔۔''

اس نے خوش دلی سے کہا۔

''ہاں تو ہم کہاں تھے۔۔ ینگ لیڈی۔۔''

وہ روہنی کی طرف پلٹا۔

''ویٹر دو لے آنا۔ میم ریلیکس ہو جائیں گی۔۔''

جگنو جلدی سے بولی۔

''او۔یس۔''

شوکمار شری واستو نے مسکرا کر سر کو اثبات میں خم دیا۔

''یس میم۔۔''

ویٹر نے پھرتی سے پلٹ کر سر جھکا کر کہا۔

''جگنو بس کرو۔۔ میں کہاں ڈرنک کرتی ہوں۔۔''

''یہ کون سی ایسی ڈرنک ہے بھائی۔ کم آن۔۔ تم ریلیکس ہو جاؤ گی۔۔ ٹینس ہو۔۔''

جگنو نے سر ہلا ہلا کر کہا۔

''ہئے۔۔ اٹ وِل ہیلپ یو ٹیک دی رائٹ ڈیسیزن۔۔''

شوکمار شریواستو نے بھی سر ہلایا۔ اس وقت تک ویٹر سرخ وائین کی چھوٹی سی سبک بوتل لے کر آ چکا تھا۔

''ہوش اڑانے والی چیز فیصلہ کرنے میں کیا مدد دے گی۔''

روہنی نے آہستہ سے کہا۔

''اتنے دنوں بعد ہم خوش نصیبوں کو ذرا سا جشن منانے کا موقع ملا ہے اور آپ ہیں کہ۔۔''

گڈ وائن۔۔ اٹس ویٹنگ۔۔''

جگنو نے جام کو بغور دیکھا پھر اس کے اندر کنارے سے تہہ کی جانب دھیرے سے لڑھکتے ہوئے عنابی رنگ قطرے پر انگلی سے باہر کی طرف گویا لکیر کھینچی۔

''اچھا۔؟ وائن ایکسپرٹ۔۔''

روہنی ہلکے سے مسکرائی۔

''یس۔۔ دیٹ آئی ایم۔۔ اچھی نہ ہوتی تو قطرے کانچ پر ٹک ہی نہ پاتے۔۔''

وہ گلاس کو دیکھتی رہی۔

''تو اب کچھ کام کی بات ہو جائے۔۔ اگر اجازت ہو تو۔۔''

شوکمار شریواستو نے دونوں کو باری باری دیکھا۔

''آف کورس۔۔''

دو میں سے کسی نے کہا۔

''وہ ایسے کہ جیولری کے ڈیزائنز جو عام طور سے کانوں، گلے اور کلائیوں کی سجاوٹ کے لئے بنائے جاتے ہیں انہیں ذرا آگے لیجا کر بازو بند، کمر بند تک بڑھانا ہے۔ بالکل نازک سا کمر بند کہ صرف جلد پر بھی پہنا جائے تو ناف کے گرد دائرے کی شکل میں نگوں اور موتیوں سے سجا ہو۔۔''

''اس میں ایسی کیا اٹریکشن ہوگی شوشری۔۔''

جگنو نے گردن کو ذرا سا خم دیا۔

''کچھ خاص نہیں۔۔لیکن، جب سارے رنگوں میں میٹلک ٹچ ہو۔۔یعنی دھات ایسے نظر آنے والے رنگ ہوں جیسے پیتل، تانبے، چاندی اور سونے جیسے مگر سب ڈل شیڈس میں یعنی سیاہی مائل سے نظر آنے والے۔۔اور ان کے ساتھ انہی شیدز اور ڈیزائن سے ملتے جلتے جوتے ہوں۔۔اور فر، براؤن اور ڈارک براؤن کمپلیکشن کی لڑکیاں انہیں ماڈل کریں تو۔۔کون ایسی چیزوں کو نہ خریدنا ایفورڈ کر سکے گا؟''

وہ ان کے چہروں پر ردِعمل تلاش کرنے لگا۔

''یہ بات تو بالکل نئی ہوگی بوس۔۔مگر لیدر پر ویسی امبرائڈری بڑا مشکل معاملہ ہے سر۔۔کسی نے کچھ بدلنے کا آڈر دے دیا تو بہت دن لگ سکتے ہیں۔۔یا تو ہاتھ سے کڑھائی والا خیال چھوڑ دیا جائے۔''

جگنو نے سر جھلا کر کہا۔

''اتنے کمپیٹشن میں۔۔''

جگنو نے روہنی کی طرف دیکھا جو سر جھکائے وائن کے گلاس کو انگلیوں سے دھیرے دھیرے گھما رہی تھی۔

''ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی میم۔۔ موٹے کپڑے کے استر والے جوتے بنوائے جائیں گے یا ریگزین کے۔اور ہماری ڈیزائنر صاحبہ، یعنی۔۔مِس روہنی۔۔جوتوں اور ہینڈ بیگز پر بلکہ کبھی کبھی ہیٹ پر بھی، ویسا ہی ڈزائن بنوائیں گی، مگر گراف والا۔یعنی جیومیٹریکل۔۔اور پتھروں اور نگوں کا رنگ وہی ہوگا۔۔مگر وہ قیمتی پتھر نہ ہو کر رنگے ہوئے زرقان ہوں گے اور لباس کے مقابلے میں کچھ بڑے بھی۔۔امیریکن ڈائمنڈز۔۔اور قیمت بھی نسبتاً کم ہوگی۔ کسٹمر لینے سے پہلے سوچ میں نہیں پڑے گا۔''

اس نے دونوں کو باری باری دیکھا۔اور ابرو اوپر نیچے کرتا ہوا سر ہلانے لگا۔

''کچھ بنی بات۔۔یا میری انرجی یوں ہی ویسٹ ہو رہی ہے۔؟''

او۔یس۔۔''

جگنو نے روہنی کی طرف دیکھا۔

''بالکل بنی۔۔''

روہنی کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی۔

''اینڈ بیلیو می۔۔ نہ وقت ضائع ہوگا، نہ انویسٹمینٹ۔۔''

وہ مسکرایا۔

''سو۔۔ ڈن۔۔؟''

اس نے جام والا ہاتھ اوپر اٹھایا۔

''یس۔۔''

جگنو نے بھی جام اٹھایا۔

''شیور۔۔''

روہنی بولی۔

جام سے جام ٹکرائے۔ ایک دوسرے کو مبارکباد دی گئی۔

گھروں کو لوٹتے ایک بجنے لگا تھا۔

صبح روہنی کو شوروم چھوڑنے کے بعد گاڑی راہل لے گیا تھا۔

جس وقت شوکمار شریواستو روہنی کو گھر چھوڑنے گیا، برآمدے میں کھڑا چندر کانت ناگپال سگرٹ پھونک رہا تھا۔

شوکمار شریواستو گاڑی کی ڈرائونگ سیٹ سے پھرتی سے نیچے اترا اور بائیں ہاتھ سے برابر والی سیٹ کا دروازہ کھولے کھڑا رہا۔

''یس میم۔۔''

اس نے داہنا ہاتھ ٹائی کی گرہ سے ذرا سا نیچے سینے پر رکھ کر سر جھکایا اور مسکرا دیا۔

''یس سر۔۔''

وہ بھی مسکرائی۔

''تھینکس اے لاٹ۔۔ گڈ نائٹ۔''

وہ بولی۔

''گڈ نائٹ میم۔۔''

وہ کھڑا رہا اور ہاتھ آگے بڑھایا۔ روہنی نے غالباً سیکنڈ بھر کے توقف کے بعد اپنا چھوٹا سا ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا اور گھر کی طرف لپکی۔ اس نے جلدی سے زینہ طے کیا اور دروازے کا لاک کھولنے کے لئے پرس میں سے چابی نکالی ہی تھی کہ چندر کانت نے اندر سے دروازہ کھول دیا۔

''یہ کون تھا۔؟''

روبی پر نظر پڑتے ہی اس نے پوچھا۔

''اوہ۔وہ ہمارا بزنس پارٹنر تھا نا۔۔شوکمار شریواستو۔۔''

وہ اندر آتے ہوئے بولی۔

''مگر یہ تو کوئی لڑکا تھا۔۔''

وہ ماتھے پر بل ڈالے دروازے کے پاس ہی کھڑا رہا۔

''مجھ سے بھی کوئی دو سال بڑا ہو گا۔۔لڑکا کہاں ہے۔۔آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں۔۔''

''اتنی دیر کہاں لگائی۔۔؟''

''ہم لوگ ڈنر پر گئے تھے۔۔''

''تم لوگ۔۔؟ تم اور یہ آدمی۔۔''

''ہاں، اور جگنو بھی تھی۔۔''

روبی نے جوتے اتارتے ہوئے کہا۔

''اٹ واز اے بزنس ڈنر۔۔''

''مجھے تمہارے بزنس ڈنرس میں کوئی دلچسپی نہیں۔سمجھیں؟''

اس نے اچانک آواز کچھ اونچی کر دی۔

''مگر یاد رکھو اگر تم نے یہ طریقہ اپنایا تو میں یہ برداشت نہیں کروں گا۔۔''

''مطلب۔؟''

روبی ہاتھ میں پکڑے ہینگر پر کوٹ رکھتے رکھتے رک گئی اور ماتھے پر شکن ڈالے بولی۔

''تمہارا رات کو آنا مجھے بالکل پسند نہیں۔۔''

وہ دوسری جانب منہ کر کے ذرا آہستہ بولا۔

''کام نہیں کروں کیا۔۔شوروم پر ہی دس بج جاتے ہیں۔۔دن بھر کا حساب کرتے۔۔سب کچھ سمیٹتے۔۔ڈمیز کا ڈریس بدلتے۔۔''

''تمہارا مطلب ہے میں نکما ہوں۔۔''

وہ بھنویں سکیڑے نتھنے پھلائے اس کے چہرے پر جیسے کہ حقارت سے نظریں جمائے رہا۔

''میں نے کب کہا۔مگر گھر تو چلنا چاہیئے نا۔۔کام وام تو ہونا ہی چاہیئے۔۔''

رونی کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا کہ اس عجیب سے سوال کے جواب میں کیا کہے۔

''آج نہیں تو کل آپ کوئی نہ کوئی کام تو کرنے ہی والے ہیں۔ پھر نکما ہونے والی بات کیسے سوچ لی آپ نے۔۔ یہ تو ایک موڑ آ گیا ہے زندگی میں، چلا جائے گا۔۔ آپ کچھ کرنا شروع ہی کر دیں۔۔ میں چھوڑ دوں گی۔۔ ایسا کیا ہے۔۔''

وہ نرمی سے بولی تو اس کے چہرے پر ایک حسرت بھری مسکراہٹ جیسی کوئی شے چھا گئی۔

اگر چندر کانت سچ مچ ہی ہر عام انسان کی طرح گھر سے باہر جا کر باقاعدگی سے کام کرنا شروع کر دے تو اسے بھی خالی وقت مل جائے گا۔۔ اپنے دیرینہ شوق کی تکمیل کے لئے۔۔ وہ تاریخ کی بہت سی کتابیں خرید لائے گی۔۔ اور، بہت سی تحقیق کرے گی۔۔ اور۔۔ اور ایک۔۔ ایک ایسی کتاب تخلیق کرے گی جیسی۔۔ جیسی کسی نے بھی۔۔

چندر کانت کی دفعتاً اونچی ہوتی ہوئی آواز اس کی سماعت سے گزر کر ذہن میں سجے کورے اوراق پر سیاہ روشنائی کی صورت پھیل گئی۔

''تم مجھے مت سکھاؤ کہ کیا کرنا ہے مجھے۔۔ میں جانتا ہوں۔۔ تم بس اپنی حدوں کو پار کرنے کی کوشش مت کرنا۔۔ سمجھ گئیں۔۔''

اس نے دانت پیس کر کہا۔

رونی لباس تبدیل کرنے لگی تھی۔ وہ کپڑے ہاتھ میں تھامے الماری کی آڑ کے نسبتاً اوجھل حصے میں ہو گئی۔ چندر کانت کے سامنے کپڑے بدلنے کو اس کا جی نہ چاہا۔

اب کئی دنوں سے رونی ناگپال اور چندر کانت ناگپال کے گھر میں اسی طرح کی گفتگو ہوا کرتی۔

گھر سے باہر بھی رونی کے تصور میں جیسے کہ بے خیالی میں ہی چندر کانت کا چہرہ، غصّے، حقارت اور بیزاری بھرے تأثرات لئے اس کے سامنے آ جاتا۔ وہ اِدھر اُدھر کی بات پر دھیان دینے کی کوشش کرتی تو بچوں کے پھول سے چہرے اس کی نظروں میں گھوم جاتے۔ اس کی آنکھوں میں اداسی تیر جاتی۔ اگلے پل پھر ایک چہرہ اس کے حواس پر رنج اور ڈر کے حملے سے کرنے لگتا تو اس بے رحم برتاؤ کے تصور پر معصومیت غالب آ جاتی۔ پھر اُسے گھر جانے کے خیال سے خوف سا آنے لگتا۔ وہ طے نہ کر پاتی کہ ابھی گھر جائے یا کچھ دیر اور کسی کام میں لگی رہے۔

گھر سے سکون ہی رخصت ہو گیا۔۔

کب تک چلے گا ایسے آخر۔۔

شوکمار شریواستو کی گاڑی میں بیٹھی روہنی کے ہونٹوں سے دبی دبی سی آہ نکل گئی۔

''کیا سوچا جا رہا ہے۔۔کبھی کبھار تو موقع ملتا ہے آپ کو لفٹ دینے کا، اور آپ ہیں کہ ہم کو لفٹ ہی نہیں دیتیں۔''

شوکمار شریواستو بولا تو وہ ہنس دی۔ اسی لمحے اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔

''کہاں ہو تم۔۔؟ دو گھنٹے سے نیچے سڑک پر تمہارا ویٹ کر رہا ہوں۔۔''

چندر کانت کی گرجتی ہوئی آواز گونجی۔

''بس پہنچ رہی ہوں۔''

وہ جلدی سے بولی اور فون بند کر دیا۔

چندر کانت اتنی زور سے بولا تھا کہ اس کی آواز روہنی کے دوسرے کان سے ہوتی ہوئی شوکمار شریواستو کی سماعت تک بآسانی پہنچ گئی تھی۔

''کیوں کھڑے ہیں دو گھنٹے سے ناگپال صاحب نیچے بھلا۔۔آپ کی محبت میں۔۔؟ مگر اس آواز میں تو محبت نہیں دکھائی دے رہی تھی۔۔میرا مطلب سنائی نہیں دے رہی تھی۔۔ مجھے۔۔''

روہنی نے کچھ نہ کہا۔ گھنٹی پھر بجی۔

''ہو کہاں تم ؟ اس سالے شوکمار کے۔۔''

روہنی نے صرف ہیلو ہیلو کہا اور فون بند کر دیا۔ لیکن شوکمار شریواستو نے اپنا نام اور خطاب دونوں سن لئے تھے۔

''یہ آدمی گھر بیٹھ کر صرف گالیاں دے سکتا ہے نا۔''

شوکمار شریواستو اپنے غصے کو مکمل قابو میں رکھے سامنے کی جانب دیکھتا ڈرائیو کرتا رہا۔

''آئی ایم سوری۔۔''

وہ اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

''آئی ایم ری اے لی ویری سوری۔۔''

روہنی کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ اگر وقت دن کا ہوتا تو شوکمار شریواستو اس کے اچانک سرخ ہوئے چہرے پر گھبراہٹ، بے بسی اور ندامت کے تأثرات یکجا دیکھ سکتا تھا۔

گھر کی گلی کو مڑنے والے موڑ پر ہی روہنی نے گاڑی رکوا دی۔

''پاس ہی ہے۔۔چلی جاؤں گی۔۔''

وہ گاڑی کے رکتے ہی فوراً دروازہ کھول کر باہر آئی اور دروازہ عجلت سے بند کر کے گلی کی جانب مڑی۔ وہ کانپ رہی تھی۔ شائد ایر کنڈیشنڈ گاڑی کی حرارت سے باہر یکلخت دسمبر کی سردی میں نکل آنے کے سبب۔ مگر اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی چہرے پر آ رہے بالوں کو تھرتھراتی انگلیوں سے پیچھے کی جانب ہٹاتی تیز تیز چلنے کی کوشش میں گھبرائی ہوئی سی گھر پہنچی۔ دروازے کا قفل کھول کر خواب گاہ میں داخل ہوئی تو دیکھا کہ چندر کانت کے ہاتھوں میں نیند کی گولیوں کی شیشی تھی اور پانی کا گلاس بھی تھا۔ اس سے پیشتر کہ رونی کچھ سمجھ پاتی اس نے شیشی منہ میں انڈیل کر پانی پینا شروع کر دیا تھا کچھ گولیاں زمین پر بھی گر گئیں۔ رونی نے پاس پہنچتے ہی گلاس گرانے کی کوشش کی مگر وہ جب تک باقی گولیاں نگل چکا تھا۔

''میں یہ زندگی نہیں جی سکتا۔۔سمجھیں؟''

وہ چیخا۔

''تھوک دیجئے بھگوان کے لئے۔۔یہ کیا۔یہ۔۔یہ راہل۔۔''

اس نے چندر کانت کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی اور چیختی ہوئی بچوں کے کمرے کی طرف بھاگی۔

بروقت ہسپتال پہنچا کر اگر اس کا معدہ دھویا نہ گیا ہوتا تو وہ شاید بچ نہ پاتا۔

''ڈیڈ۔۔وائی۔۔؟ کیوں کیا آپ نے ایسا۔۔؟''

راہل نے مسہری پر پڑے باپ کے اترے چہرے کو بے چارگی سے دیکھ کر کہا۔

''اپنی ماں سے پوچھو۔۔''

اس نے دوسری طرف کھڑی رونی کو حقارت سے دیکھا۔ رونی نے راہل کی جانب نظر ڈالی۔ وہ سر جھکائے اپنے جوتوں کو دیکھتا رہا۔

انیس بیس برس کا وجیہہ شانوں والا بلند قامت لڑکا، ہسپتال کی چھوٹی سی تپائی پر اپنے جسم کو سمیٹے رکھنے کی کوشش کرتا ہوا گویا بے بس سا بیٹھا تھا۔

رونی کے دل میں جیسے کہ درد کی لہر سی اٹھی۔

''کیوں آپ بچوں کو ڈسٹرب کرنے والی باتیں کرتے ہیں۔۔آرام کیجئے۔۔پلیز۔۔''

وہ بے بسی سے بولی۔

''پاپا ٹھیک ہیں بیٹا۔۔جاؤ۔۔منی کو سکول سے لے آؤ پھر یہاں سے ہوتے ہوئے جانا۔۔ سب ساتھ گھر جائیں گے۔''

راہل اوپر دیکھے بغیر اٹھا اور باہر نکل گیا۔

''آپ پلیز سمجھنے کی کوشش کیجئے۔۔ایسا کچھ بھی نہیں جو آپ اتنے پریشان ہوتے ہیں۔۔ اس کی گریجویشن ہو جانے دیجئے۔۔سب خود ہی سنبھال لے گا۔۔دو سال کی ہی تو بات ہے۔۔بچے اس طرح 'اِن سیکیور' ہو جائیں گے۔۔''

وہ پلنگ کے قریب تپائی پر بیٹھ گئی تھی۔

اس کی ایک آنکھ سے آنسو ٹپکا تو دوسرا اس نے جلدی سے پونچھ لیا۔چندر کانت اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔اس نے کوئی بات نہ کی۔

منی آٹو رکشا میں بیٹھ کر ہسپتال آ گئی تھی۔دونوں بہن بھائی دروازے کے پاس چپ چاپ کھڑے اندر دیکھ رہے تھے۔حیران و پریشان سے۔روہنی کی نظر اس طرف اٹھی تو آنکھوں میں اور آنسو بھر آئے۔مگر اس نے چہرے پر کوئی تاثر نہ آنے دیا۔

اس کے بعد بہت دنوں تک یہ منظر رہ رہ کر بغیر چاہے روہنی کی آنکھوں کے سامنے آتا رہا تھا۔

ایسے میں اس کا جی چاہتا کہ دی مرمیڈ شوروم کے کاؤنٹر کے عقب میں آرام دہ کرسی کی گویا محفوظ سی پناہوں میں چھپی رہے۔کہیں نہ جائے۔اس طرح کے احساسِ محرومی میں گھری بے دست و پاسی وہ کبھی کبھی شوکمار شریواستو کی آمد سے اپنے اندر عجیب سی راحت محسوس کرتی۔جیسے ،ڈر، گھٹن، بحث یا ذلت ،جیسی کسی شے کا دنیا میں وجود ہی نہ ہو۔

عجب سا احساسِ تحفظ۔۔

اس نے سوچا۔

اور۔۔اگر تحفظ نہیں بھی ہوتا تو بھی کیا فرق پڑتا۔۔چاہیئے بھی نہیں اسے کسی کا تحفظ۔۔کچھ غلط تو کر نہیں رہی وہ۔۔کچھ غلط نہیں کیا اس نے۔۔پھر۔۔یہ خوف۔۔یہ ڈراونا سا احساسِ تنہائی۔۔روح کے کہیں اندر یہ دائمی سا غم۔۔کیوں۔۔کیوں۔۔آخر کیوں؟

گھر کی خاطر ہی تو وہ۔۔ورنہ۔۔بچے۔۔بچوں پر کیا اثر پڑے گا۔۔چندر کانت کی سمجھ میں یہ باتیں کیوں نہیں آتیں۔۔

وہ ماتھا کاؤنٹر پر ٹکا دیتی۔

ہسپتال سے آکر چندر کانت نے مے نوشی بڑھادی۔ وہ زیادہ وقت تک اور زیادہ مقدار میں پینے لگا تھا۔ شام ہوتے ہی وہ جام تھام لیتا اور بار بار رونی کو فون کرتا کہ وہ اس وقت کہاں ہے، کس کے ساتھ ہے اور کب آئے گی۔ بلکہ اس نے رونی سے کہا کہ وہ فون بند ہی نہ کرے۔ تا کہ اسے خبر رہے کہ وہ کب کب کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے۔

اس بات پر بھی بحث ہوئی اور چندر کانت اونچی آواز میں ناراضگی کا اظہار کرتا اوپر چھت کی جانب گیا۔ شور سن کر گھر کا ملازم اپنے کمرے سے باہر نکل آیا تو چندر کانت ریلنگ کی طرف دوڑ کر ایک پاؤں ریلنگ پر چڑھانے لگا۔ ملازم کی یہ دیکھ کر چیخ نکل گئی اور بھاگ کر اسے پکڑ لیا۔

''صاحب جی۔۔ صاحب جی۔۔''

وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

''ارے چھوڑ ایڈیٹ۔۔''

اس نے ٹانگ واپس اتار لی تھی اب وہ اونچی آواز میں ملازم کو ڈانٹ رہا تھا۔ بچے بھاگے بھاگے اوپر آ گئے تھے۔ نچلی منزل کے مکین مسٹر اور مسز ملہوترا چھت پر پہنچ کر چندر کانت کو نیچے لانے کی کوشش کر رہے تھے۔

''گھر کی بات گھر میں ہی رہنی چاہیئے۔۔ ایسے اچھا لگتا ہے کیا۔ آپ تو سمجھدار انسان ہیں۔''

ملہوترا صاحب نے چندر کانت کا شانہ تھپتھپایا۔

''ارے ہوتا ہے بھائی صاحب۔۔ ہر گھر میں جھگڑا ہوتا ہے۔ کہیں زیادہ کہیں کم۔۔ اچھا نہیں ہوا آپ کے ساتھ۔۔ بہت برا ہوا۔ مگر اب اپنی جان کیوں آپ اس طرح۔۔''

مسز ملہوترا زور زور سے بول رہی تھیں۔ آواز سن کر برابر والے گھر میں رہائش پزیر کسم اور اس کا شوہر للت بھی آ گئے تھے۔ ایک تماشا سا شروع ہو گیا تھا۔

رونی جلدی سے نیچے چلی آئی اور پوجا والے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بھیڑ دیا۔ بہت سی باہوں والی نقرئی مورتی کو وہ کچھ پل ٹکٹکی لگا کر دیکھتی رہی پھر اس نے اپنا سر مورتی کے ننھے ننھے پیروں پر رکھ دیا اور بلک بلک کر رو پڑی۔

چندر کانت کو مسٹر ملہوترا سہارا دے کر گھر تک لے آئے۔ راہل برآمدے میں کھڑا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہوئے باپ کی طرف دیکھتا رہا۔ اس اتوار کی شام کے لئے اس نے غالباً کچھ اور سوچ رکھا تھا۔

''ڈیڈ۔۔اگر آپ ایسے ہی کرتے رہے تو ہمیں آپ کو مینٹل ہاسپٹل میں داخل کرنا پڑے گا۔۔''
اگلی صبح راہل بیدار ہوتے ہی باپ کے کمرے میں داخل ہوا۔

''اس طرح آپ سارے گھر کو بدنام کر رہے ہیں ڈیڈ۔۔ ماما ہم سب کے لئے کام کر رہی ہے۔۔آپ ان کے پیچھے ہی پڑ گئے۔۔گھر میں خرچہ تک نہیں ہوتا تھا یاد ہے آپ کو۔۔ یہ سب مام کی وجہ سے ہے جو آپ شام ڈھلے ہی ووڈکا کی بوتل لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔کون کرتا ہے یہ سب۔۔ مائی مام۔۔ او کے۔۔؟''

''یوآر مام؟ ہنہ۔۔وہ تمہاری سوتیلی ماں ہے۔۔سوتیلی ماں ہے وہ تمہاری۔۔سمجھے؟''
چندر کانت نے نتھنے پھلا کر ماتھے پر شکن ڈالی۔

''نو۔نو۔۔آپ ہیں سوتیلے باپ۔۔وہ میری سگی ماں ہے۔۔منی سے بھی زیادہ چاہتی ہے مجھے۔۔آپ مجھے میری ہی ماں کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کر رہے ہیں ڈیڈ۔۔ڈیڈ۔۔آپ کو شرم نہیں آتی۔۔آپ۔۔آپ۔۔''

راہل غصے کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرنے لگا تو اس کے آنسو نکل آئے۔وہ کمرے سے باہر آیا تو منی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔وہ دروازے سے لگی چپکے چپکے سسک رہی تھی۔

''سکول نہیں گئیں تم۔۔''
اس نے منی کا سر چھاتی سے لگا لیا۔

''جا رہی تھی بھیا۔۔نیچے سبزی والے کے پاس ملہوترا آنٹی کسم آنٹی سے کہہ رہی تھیں کہ اگر وہ اور ملہوترا انکل کل ٹائم پر نہ پہنچے ہوتے تو ڈیڈ نے سوسائڈ کر لیا ہوتا۔میں گیٹ کے اندر تھی۔کچھ دیر رک گئی کہ وہ جائیں تو۔۔مگر اتنے میں میں نے سکول بس کو اس طرف سے واپس آتے دیکھا۔ان کے اندر جانے کے بعد دوڑتی بھی تو بھی نہ پہنچ پاتی۔۔سنڈے کے دن بھی جب میں ماما کے ساتھ شوروم جا رہی تھی نا اس وقت بھی دونوں ہماری باتیں کر رہی تھیں۔''

وہ دبی دبی ہچکیوں میں بولتی رہی۔

''بکنے دے ان کو۔۔وہ کیا جانے ہماری پریشانیاں۔۔چل میں چھوڑ آتا ہوں۔۔ مام دیکھیں گی تو اور پریشان ہوں گی۔چل آجا۔آجلدی۔۔''

دی مرمیڈ کی اوپر والی منزل تک اندر کی طرف سے زینہ نکلوا کر بالائی حصے میں قیمتی اور نیم قیمتی قسم کے پتھروں کے آرائشی سامان کا شوروم کھولنے کا ارادہ تھا۔رات کو شوکمار شریواستو اپنی نگرانی میں کام

کرواتا اور پھر صبح شوروم کھولا جاتا۔ کبھی جلدی بند کرنا پڑتا، کبھی دیر سے کھولنا پڑتا۔ روبنی اور جگنو بھی بہت مصروف رہتی تھیں۔ روبنی کے لوٹنے میں دیر ہوتی تو چندر کانت گھر کے سامنے ٹہلتا رہتا۔ کبھی گھنٹہ، کبھی دو گھنٹے۔ یا اس سے بھی زیادہ۔ موبائیل فون سے مسلسل پیغام بھیجتا رہتا۔ وہ یہ کام گھر کے اندر سے بھی کر سکتا تھا مگر گھر میں جانے کیا چیز اسے چین سے بیٹھنے نہ دیتی تھی۔

اب نوبت یہاں تک آگئی تھی کہ اگر اسے بیت الخلاء کے لئے اندر جانا ہوتا تو بلڈنگ کے گیٹ پر محافظ سے کہہ دیتا کہ میم صاحب کے آنے کا ایک ایک منٹ نوٹ کرلے۔

اور میم صاحب آتیں تو نہایت بیچارگی سے گارڈ سے کہتیں کہہ دینا اسی وقت آگئی تھیں اور مسز ملہوترا سے بات کر رہی تھیں۔

اب یہ باتیں دربان سے ڈرائیوروں تک ہوتی ہوئیں پاس پڑوس کے گھروں میں پھیل چکی تھیں۔

نوعمر بہن بھائی سر جھکائے نظریں چرائے آتے جاتے دکھائی دیتے۔ روبنی بھی نہایت سنجیدگی سے گاڑی میں بیٹھتی اترتی نظر آتی۔ اوپر سے چندر کانت برآمدے میں کھڑا دیکھا کرتا۔

بچے باپ سے کھچے کھچے رہنے لگے تھے۔ بلکہ زیادہ تر اپنے کمروں میں ہی رہتے تھے۔

اگلے دن جب روبنی کو آتے آتے اور دیر ہوگئی تھی۔ تو چندر کانت نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اس زور سے جھنجھوڑا تھا کہ اس کی چیخ نکل گئی تھی۔

''گلا دبادوں گا اگر پھر دیر سے آئی تو۔ نہیں چاہیئے تیری یہ حرام کی کمائی۔ سمجھی۔۔؟''

وہ زور زور سے چیخا تھا۔ راہل نے آکر ماں کو اس سے چھڑا لیا تھا۔

اس دن سے روبنی کو اپنی خواب گاہ میں سونے کے خیال سے کچھ خوف سا آنے لگا تھا۔ وہ منی کے کمرے میں سویا کرتی تھی۔ مگر سوتے میں اچانک اسے احساس ہوتا کہ چندر کانت بتی بجھائے کمرے میں ٹہل رہا ہے۔ کیونکہ قالین پر بغیر جوتوں کے ٹہلنے اور ایڑی کے فرش پر پڑنے کی صدا روبنی کو فرش سے ہوتی ہوئی مسہری سے لگے اس کے کان تک پہنچتی صاف سنائی پڑتی تھی۔ ایسے میں کسی انجانے خوف کی لہر سی اس کی ریڑھ کی ہڈی کے اندر سرائیت کر جاتی۔ وہ سوئی ہوئی منی سے لپٹ کر چھوٹے بچے کی طرح کانپنے لگتی۔ کبھی اچانک اٹھ کر اندر سے دروازے کی چٹخنی چڑھا دیتی۔ بلکہ اب وہ ہر روز اندر سے دروازہ بند کئے رکھتی تھی۔

پھر جانے کیا ہوا کہ چندر کانت کے روّیے میں اچانک تبدیلی نمودار ہوئی۔

وہ کچھ پرسکون سا نظر آنے لگا۔ اس نے روہنی کو بار بار فون کرنا بند کر دیا۔ دن بھر میں ایک آدھ بار پوچھتا کہ کب آ رہی ہے۔ اور کھانے پر منتظر ملتا۔ کوئی غصہ نہ تقاضا۔ روہنی کو تقدیر مہربان نظر آنے لگی۔ گھر میں سکون محسوس ہوا تو جگنو کے سپرد کام کر کے وہ گھنٹہ بھر پہلے ہی گھر آ جاتی۔ بچوں نے باپ کو پرسکون دیکھا تو ان کے چہرے کھِلے کھِلے نظر آنے لگے۔

روہنی کو محسوس ہوا کہ قدرت کو اس کے بچوں پر ترس آ گیا جو اس کے گھر کا سکون لوٹ آیا۔

جس دن چندر کانت نے بچوں اور دونوں ملازمین سے اپنے رویئے پر معافی مانگی، اس دن گھر کا سکون جیسے کہ یقینی ہو گیا۔

''میم صاب۔۔ آج صاب کمرے کا لائٹ نہیں بجھائے ہیں۔۔ جاگ رہے ہیں۔۔''

پرانی ملازمہ انو نے اس وقت روہنی سے کہا جب وہ کھانے کے قاب اٹھا کر ریفریجریٹر میں رکھنے میں اس کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔

''تو۔۔؟''

روہنی مسکرائی۔

''تو میم صاب آپ ادھر سونے کو نہیں جانا۔۔ میرے کو اس ج سے۔۔''

انو نے گلا صاف کیا۔

''میرے کو وشواس نہیں رہا۔۔ جب سے گلا پکڑے تھے آپ کا۔۔ آپ بے بی کے روم میں ہی سونا۔۔''

''ارے چپ پاگل۔''

روہنی زور سے ہنسی۔

اسی وقت راہل ٹھنڈے پانی کی بوتل لینے اپنے کمرے سے باہر آیا تھا۔ انو کی بات سن کر ٹھٹھک گیا۔

''مام۔۔ شی از رائٹ۔۔ آئی تھنک۔''

وہ دھیرے سے بولا۔

''کہیں پھر جھگڑا نہ کر لیں۔ اور ٹمپر لوز کر لیں۔۔ اور۔۔''

وہ ماں کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

''ارے نہیں بیٹا۔۔ وہ تو غصہ آ گیا تھا انہیں اس دن۔۔ ورنہ کیا سچ مچ تھوڑے ہی گلا دبا دیتے۔۔۔ جاؤ سو جاؤ۔۔ ریلیکس مائی چائلڈ۔۔''

روہنی نے اس کا رخسار تھپتھپایا۔

منی بھی اپنے کمرے میں سونے کی کوشش کر رہی تھی۔ گو کہ اسے ماں کا اس کے پاس سونا زیادہ اچھا لگتا تھا۔ مگر والدین کے درمیان تعلقات استوار ہونے سے وہ پرسکون تھی۔

انو اور راہل دونوں کا خیال غلط نکلا۔ رات کسی جھگڑے کی آوز نہ آئی بلکہ صبح بھی سہانی نکلی۔ اور اس سے اگلی صبح بھی پرسکون گزر گئی تھی۔

گھر کی خوشیاں رفتہ رفتہ لوٹتی دکھائی دے رہی تھیں۔

اس دن روہنی شوروم جانے لگی تو بہت خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ منی نے بڑے اعتماد سے ملہوترا آنٹی اور کسم آنٹی کو نظر انداز کر کے ڈور فون کی گھنٹی بجائی تھی۔ اور سپیکر سے روہنی کی کھنکتی ہوئی صدا بلند ہوئی تھی۔

'آئی بیٹا۔۔ بس! ایک سیکنڈ۔۔ تم بیٹھو گاڑی میں۔۔' اور وہ گہرے بھورے ٹراوزرس اور آدھی آستینوں والے ہلکے بھورے ٹاپ کے ساتھ بھورے رنگے بالوں میں کم عمر اور نہایت جاذب معلوم ہو رہی تھی۔

اس دن چندر کانت ناگپال کچھ دیر بعد برآمدے میں آ گیا تھا۔ نکڑ والے مکان کی رس رہی ٹنکی سے نظر ہٹا کر وہ سڑک کی دوسری طرف ایستادہ درختوں کی چوٹیوں کو دیکھنے لگا۔ رومال سے چشمہ صاف کر کے دوبارہ آنکھوں پر جماتے ہوئے اسے آج دن میں ہی شراب کی شدید طلب ہونے لگی تھی اور وہ اندر آ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد زینہ اتر کر بازار کی طرف نکل گیا تھا۔ آس پاس کبھی کسی نے چندر کانت ناگپال کو بغیر گاڑی کے گلی سے باہر پیدل جاتے نہیں دیکھا تھا۔ اس دن وہ پیدل سڑک پر نکل گیا تھا۔ اور دن ڈھلے تک گھر نہیں آیا تھا۔

راہل کالج سے شام کو جب گھر لوٹ رہا تھا تو ریلوے پھاٹک کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے باپ کو گھر کی جانب جاتے دیکھ کر گاڑی روک دی۔

''کم آن ان ڈیڈ۔۔ کہاں گئے تھے۔۔ ویٹ کر لیتے۔۔ میں تو آ ہی رہا تھا۔''

''نہیں بیٹا۔۔ آج میں ذرا ٹہلنا چاہتا تھا۔''

وہ مسکرایا۔

''تم چلو میں آتا ہوں۔۔لیزی ہو گیا ہوں۔۔ذرا سیر ہو جائے گی۔۔''

وہ ہنسا۔

''آر یو شیور ڈیڈ۔۔''

''یس ویری شیور۔۔''

''بائے۔۔''

راہل نے گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔

اگلے دن اتوار تھا۔گھر کے چاروں افراد دیر تک کھانے کی میز پر بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے۔پھر بچے اپنے اپنے کمروں کی طرف چلے گئے۔والدین کے کمرے سے دیر تک قہقہوں کی آوازیں سنائی دیں تو بچے بعد مدت کے پرسکون ہو کر سو گئے۔

دوسری صبح چھٹی کی وجہ سے کسی نے الارم نہیں لگایا تھا۔

دروازے کی مسلسل بجتی ہوئی گھنٹی سے راہل بیدار ہوا تھا۔دروازے پر پولیس کھڑی تھی۔

''یہ آپ کے فادر کا ڈرائیونگ لائسنس ہے؟''

انسپکٹر نے راہل کو رومال سے پکڑا کارڈ دکھایا۔

''ہاں۔ہاں۔''۔

''وہ کہاں ہیں۔؟''

انسپکٹر نے پوچھا۔

''سو رہے ہیں۔''

وہ گھبرایا سا فوراً بولا۔

''نہیں وہ وہاں نہیں ہیں۔ان کا ایکسیڈینٹ ہو گیا ہے۔ذرا آپ بیڈروم میں دیکھئے۔''

انسپکٹر کی بات سن کر راہل الٹے پاؤں والدین کی خواب گاہ کی طرف لپکا۔دروازہ اندر سے بند تھا۔اور جب کھٹکھٹانے پر نہ کھلا تو ڈرائنگ روم سے نکل کر وہ برآمدے کی طرف سے گیا۔اسے کمرا کھلا ملا۔

اس وقت تک سب کچھ بدل گیا تھا۔

اس کی ماں خون میں لت پت مسہری پر بے سدھ پڑی تھی۔

''ماما۔۔۔''

اس کی دلدوز چیخ ابھری۔اس نے ماں کو ہاتھوں سے ہلایا۔

''ماما۔''

وہ چیخ چیخ کر ماں کو پکارنے لگا۔

''نو۔۔ماما۔نو۔۔ماما۔ماما۔۔ماردیا میری ماما کو۔۔ماردیا پاگل نے۔۔''

اس کی چیخوں میں منی کی باریک باریک چیخیں شامل ہوگئیں۔

دونوں بہن بھائی جس وقت خون میں نہائی ماں کو اٹھا کر ہسپتال لیجانے کے لئے گاڑی میں رکھنے کی کوشش کر رہے تھے تو پاس پڑوس کے لوگ دور تماشائی بنے کھڑے تھے،جن میں پولیس والے بھی شامل تھے۔

''وہ تو پہلے ہی مر چکی تھی۔۔''

ایک پولیس والے نے دوسرے سے کہا تھا۔

ہسپتال میں روہنی کو مردہ حالت میں داخل کیا گیا قرار دیا تھا۔

چندرکانت ناگپال نے بیوی کے سر پر رات کے تیسرے پہر ہتھوڑے سے وار کر کے اس کا گلا تیز دھار والے ہتھیار سے کاٹ دیا تھا۔اور قتل کے آلات اور اپنے خون آلود کپڑے غسل خانے کے دروازے کے عین سامنے رکھ کر وہ گزشتہ شب حاصل کی ہوئی اطلاع کے مطابق صحیح وقت پر ریل کی پٹری پر لیٹ کر خودکشی کر چکا تھا۔

اس کی قمیص کی اوپری جیب میں سے خودکشی کے اعتراف کا پرچہ برآمد ہوا جس میں اس نے شوکمار شری واستو کو اس حادثے کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔

گلی میں سارا دن پولیس اور میڈیا کی گاڑیاں بھری رہیں۔گھر میں پولیس آتی جاتی رہی۔ جہاں صرف گھر کے ملازم انو اور نندن تھے۔ٹیلیوژن چینلوں والے مکان پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔

ایک تازہ وارد ٹائی پہنے آدمی نے انو کو جالیا۔اس کے عقب میں توپ خانے کی طرح دوسرا

شخص کیمرہ سنبھالے چل رہا تھا۔

''آپ کو کچھ پتہ چلا تھا جب حادثہ ہوا؟''

''نہیں جی۔۔شام کو صاحب لوگ ٹھیک سے کھانا کھائے۔۔ہنستے بولتے روم میں گئے تھے صاحب جی۔۔پتہ نہیں کیا ہو گیا۔۔''

اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔کیمرہ مین نے فوراً اس کی آنکھوں کو 'زُوم اِن' کیا۔

''مالک کی غلطی تھی۔۔آپ کو کیا لگتا ہے۔۔؟''

''ہاں جی۔۔اب ایسا کیا تو گلت کیا۔۔اچھا نہیں کیا۔۔''

وہ کہیں اور دیکھنے لگی تو سوال پوچھنے والا آہستہ آہستہ اس کی اور بڑھا، پیچھے پیچھے کیمرہ مین بھی۔وہ ایک قدم پیچھے کی جانب ہٹی تو وہ دونوں بھی آگے بڑھنے لگے۔یہاں تک کہ وہ منی کے کمرے کی دہلیز پر ٹھہر گئی۔پیچھے پیچھے اخبار روالوں کی بھی ایک فوج تھی۔دروازے کے اندر بائیں جانب میز پر کچھ تصویریں تھی۔ایک اخبار والے نے انو کے بالکل قریب سے ہی لمبا سا بازو اندر ڈال کر تصویر اٹھالی۔تصویر میں مُنی سی منی والدین کی گود میں مسکرا رہی تھی۔انو حیرت سے صحافی کی طرف دیکھنے لگی۔

''بعد میں واپس کر دیں گے۔''

وہ تصویر کو جیب میں رکھتا ہوا بولا۔انو بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

''اس شہر میں اور کون ہے ان کا۔؟''

کسی نے سوال کیا۔

''کوئی رشتے دار ہیں۔۔''

''صاحب کے یا میم صاحب کے؟''

''دونوں کے۔۔''

''یہاں آتے ہیں؟''

''نہیں جی۔۔''

''کیوں؟''

''معلوم نہیں جی۔۔''

''آپ کتنے سال سے ہو ادھر؟ کیوں معلوم نہیں؟''

''آپ میرے کو معاف کر دو جی۔۔میرا من دکھی ہے۔۔پریشان مت کرو آپ میرے کو۔۔

ادھر سے جاؤ۔''

انو رو پڑی اور ہچکیاں لیتی وہیں فرش پر بیٹھ گئی۔ کیمروں نے سارا منظر پل پل محفوظ کر لیا۔ سارا دن ٹیلیوژن کے کئی چینل اس خبر کو دہراتے رہے۔

''تم نے دیکھا تھا جب بچے اسے ہسپتال لے جا رہے تھے۔؟''

اگلی صبح مسز ملہوترا نے ہاتھ گاڑی میں سے سبزیاں پسند کرتے ہوئے کسم سے پوچھا تھا۔

''ہاں۔۔ لڑکی سی لگ رہی تھی۔''

''کیا پہنا تھا۔؟''

''ٹریکس میں تھی۔۔ شاید بیٹی کے ہوں۔۔ بالکل سلم کر دیا تھا اس نے خود کو۔۔''

''میرے کو تو بھیّا اس کے گھر کی طرف دیکھتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔۔''

مسز ملہوترا نے جیسے کہ شانوں میں سر چھپا کر کہا اور بند گوبھی کے ایک بڑے سے پھول کو الٹ پلٹ کر واپس رکھا اور دوسرا اٹھایا۔

''میرے کو بھی۔۔''

کسم نے آنکھیں گویا کہ خوف سے پھیلا کر مسز ملہوترا کی طرف دیکھا اور سر جھکا کر آلوؤں کی ڈھیری میں سے بڑے بڑے آلو علیحدہ کر کے ترازو میں ڈالنے لگی۔

چندر کانت ناگپال اور روہنی ناگپال کے جسد خاکی گھر نہیں لے جائے گئے۔ ہسپتال سے شمشان گھاٹ لے جائے گئے جہاں کچھ رشتہ دار موجود تھے۔ منی کو گھر سے ماں کا سہاگ کا جوڑا منگوانے کو کہا گیا۔ راہل کو پروہت رسوم کے بارے میں بتاتا گیا۔ وہ دونوں بہن بھائی روبوٹ کی طرح جیسا کہا جاتا ویسا کرتے۔

شمشان میں پہلے سے تین چتائیں جل رہی تھیں یا جل چکنے کے مراحل میں تھیں۔ ان کے لواحقین اگلے دن آ کر استھیاں لے جانے کے لئے جا چکے تھے کہ جل کر خاک ہونے کا عمل طویل ہوتا ہے۔ روہنی ناگپال کے خون نچڑے سیاہی مائل نیلے جسم کو پروہت کی ہدایت کے مطابق رشتہ داروں سے دلہن کا سنگھار کروا کر چتا پر رکھ دیا گیا۔ سہاگن کی مانگ میں سندور تھا۔ ماتھے پر بڑی سی سرخ بندیا لگی

تھی۔اور جسم پر زری کی سنہری ساری تھی۔ برابر میں چندر کانت ناگپال کی چتا تیار کر دی گئی تھی۔

چتائیں سجاتے ہوئے پروہت دھیمی آواز میں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔

راہل اور منی ماں کی چتا کے پاس تھے۔منی آنسو بہاتی ماں کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر دیکھتی۔ بیٹھتی کبھی کھڑی ہو جاتی۔پیروں کی طرف جاتی اور دونوں پاؤں تھام لیتی۔کوئی آ کر اسے اٹھا دیتا۔سہارا دے کر ذرا دور لے جاتا۔وہ وہاں سے ماں کے چہرے پر نظریں گاڑھ دیتی اور پھر قریب چلی جاتی۔ آہستہ آہستہ کانپتی ہوئی۔باریک سی آواز میں زیرِ لب ماما پکارتی سر کی جانب جاتی کبھی پاؤوں کی اور۔ ماتھے کا زخم اب سیاہ نظر آ رہا تھا۔ گلے کا زخم پوسٹ مارٹم کے دوران ڈاکٹروں نے ایسے سیا تھا جیسے کوئی کپڑے پر عجلت سے ٹانکے لگانے کے دوران دونوں اطراف جوڑ کر سوئی اوپر سے پروتا جائے۔منی نے گردن کے زخم پر ساری برابر کی اور جلدی جلدی ہچکیاں لینے لگی۔ پھر ماں کا بے جان ہاتھ سہلاتی رہی۔ اس کے بعد پیشانی۔اس کا اپنا سارا جسم ہچکولے سے کھا رہا تھا۔

راہل پتھر کے بت سا دانت بھینچے پروہت کا کہا کر رہا تھا۔باری باری دونوں چتاؤں کی طرف جاتا۔پھر منی کے پاس جا کر اس کا سر سہلاتا۔ آنسو اس کے چہرے کو بھگوتے ہوئے اس کے گریبان میں جذب ہو رہے تھے۔

چتاؤں کو بے شمار لکڑیوں سے ڈھک دیا گیا۔

پروہت جی نے چتاؤں کو اگنی دینے کا اعلان کیا۔

اور چتاؤں کو پرنام کرنے کو کہا۔وہ ہاتھوں کو جوڑے ماں کے قریب گئے، پھر باپ کے جو لکڑیوں کے پیچھے سے نظر نہیں آ رہے تھے۔رشتہ دار تھوڑی دور سے ہاتھ جوڑے نمسکار کر رہے تھے۔کچھ ہمسائے بھی موجود تھے جو انتم سنسکار کے بارے میں اطلاع حاصل کر سکے تھے۔کوئی خاموش تھا، کوئی رو رہا تھا۔

چتائیں جلنے لگیں۔۔

سہاگن کی چتا پر ذری کے جلتے ہوئے جوڑے نے دھنک رنگ شعلے بکھیر رکھے تھے۔

راہل نے منی کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"ماما کتنی سندر لگ رہی ہیں منی۔۔منی۔۔اَور مام از ڈائنگ بیوٹیفلی۔۔"

اس نے ایک زور کی ہچکی لے کر ہونٹ دوبارہ بھینچ لئے تھے۔

احاطے میں دھواں سا پھیل گیا تھا۔

چتائیں جلتی رہیں۔

رشتے داروں نے واپس جانا شروع کر دیا تھا۔

منّی اور راہل کے دوستوں کے علاوہ جگنو بھی وہیں تھی جو کبھی انہیں سہارا دینے کی کوشش کرتی، کبھی خود رو پڑتی۔ شوکمار شریواستو غالباً خودکشی نامے میں اپنے ذکر کے سبب وہاں موجود نہیں تھا مگر اس نے اوپری سطح پر مداخلت کروا کے ہسپتال سے دونوں جسدِ خاکی سیدھا کریا کرم کے لئے لے جانے کا کام کروایا تھا۔ جس وجہ سے پولیس اور میڈیا کے علاوہ پاس پڑوس کے لوگوں کے سوالات اور مداخلت کی ممکنہ پریشانی سے بچوں کو نجات حاصل ہو گئی تھی۔

چار روز کے وقفے کے بعد رسمِ پگڑی کے دن چندرکانت ناگپال اور روہنی ناگپال کی کسی زمانے میں ساتھ لگ کر کھچوائی گئی تصویر ایک بڑے سے فریم کے اندر تازہ سرخ گلابوں کی مالا سے مہکتی ان کی رہائش گاہ سے کچھ فاصلے پر تعمیر مندر میں بھگوان کے چرنوں کے پاس رکھی تھی۔ پاس ہی گلاب کی پتیوں سے بھری ٹوکری تھی۔

بڑی بڑی ذہین آنکھوں والی ایک متین سی سادھوی نیم مُندھی آنکھیں کہیں دور گاڑے نہایت سریلی آواز میں رام بھجن گا رہی تھی۔ اور پھر آنکھیں پوری بند کر کے زندگی اور موت کے فلسفے کو بڑی سادگی سے بیان کر رہی تھی۔ دکھ بھوگنے کی شکتی کی بابت سمجھا رہی تھی۔ شریر کے مٹی سے قریب ہونے کا ذکر کر رہی تھی۔

کچھ دیر بعد سادھوی نے آنکھیں کھول دی تھیں۔

۔۔ اور ہے ارجن، تم بھی یہ سمجھ لوگے کہ آتما لگاتار جنم لیتی اور مرتی ہے تو اس طرح غم سے نڈھال نہ ہوگے۔

کیونکہ جو جنم لیتا ہے اسے اوشئیہ موت آتی ہے اور مرنے والا جنم بھی اوشئیہ ہی لیتا ہے۔ سو، ایک نہ ٹلنے والے واقعے کا کیا غم کرنا۔

۔۔ اس لئے ہمیشہ اپنے کام موہ مایا میں پڑے بنا اچھی طرح کرو۔ موہ میں پڑے بنا کام کرنے سے منشیہ بھگوان کو پا لیتا ہے۔

۔۔ ہے ارجن، آتما جو سب کے شریر میں رہتی ہے اسے کبھی مارا نہیں جا سکتا۔ اس لئے تمہیں کسی کے پرانوں کا دکھ نہیں کرنا چاہیئے۔

۔۔ جس بدھی مان کا من دکھوں میں پریشان نہ ہو، سُکھوں کے لئے جس کی ترشنا ختم ہو گئی ہو، اور جو موہ، بھئے اور کرودھ سے مکت ہو گیا ہو، اسی کا من ستھِر ہوتا ہے۔

سادھوی حاضرین کو باری باری دیکھتی ہوئی بھگود گیتا کے شلوک سنا رہی تھی۔

لوگ جمع ہو رہے تھے۔ کچھ بزرگ دیواروں سے لگی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ باقی ہال کے فرش پر۔

پچھلی قطار میں کوئی سرگوشی میں باتیں کر رہا تھا۔ جو بالکل قریب بیٹھے ایک آدھ شخص کے کانوں تک بھی پہنچ سکتی تھی۔

''تصویر میں دونوں کتنے اچھے لگ رہے ہیں۔۔''

یہ آواز عورت کی تھی۔

''ہاں۔۔ حالات کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔۔''

یہ آواز مردانہ تھی۔

''ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی ہوں گی۔۔ جو پوری ہو گئیں۔۔''

''یہ تو زبردستی ہوا نا۔ کوئی بھگوان کی دی ہوئی موت تھوڑی تھی۔۔''

مرد نے کہا تھا۔

''ایسا ہونا ہی تھا۔۔''

''کیوں ہونا تھا۔۔؟''

''جانتی ہو راہل کی ماں نے بھی آتم ہتیا کی تھی۔۔''

''کیا کہہ رہے ہو۔۔؟''

''ہاں۔۔ جن دنوں چندر کانت پر رونی کا بھوت سوار تھا، وہ بہت پریشان رہنے لگی تھی۔ ایسے ہی جیسے پچھلے دنوں چندر کانت رہا کرتا تھا۔ وہ رشتہ ان کے گھر والوں نے کاروبار کی خاطر کیا تھا۔ لاہور سے مائیگریٹ ہونے کے بعد انہیں قدم جمانے کے لئے سہارا درکار تھا۔ جو ایسے سمدھیانے سے بآسانی ملنے کی توقع تھی۔ شکنتلا کے والد پانی پت کے مشہور ایکسپورٹر تھے۔ اون کا پشتینی کاروبار تھا۔ تعلقات کا پاس رکھنے والے سنسکاروں والے لوگ تھے۔ اور دونوں خاندان پہلے سے آپس میں کچھ جانکار بھی

تھے۔ اس بات کا فائدہ اٹھایا تھا ناگپالوں نے۔ مگر چندرکانت اس شادی سے کچھ خوش نہیں تھا۔۔ وہ شکنتلا سے ہمیشہ کھچا کھچا سا رہتا۔ راہل کی پیدائش پر کچھ خوش نظر آنے لگا تھا۔ لگتا تھا شاید سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پھر اس نے روہنی کو کہیں دیکھ لیا۔ اور ہمیشہ کی طرح خاموش رہنے لگا۔ کوئی پوچھتا تو توڑ پھوڑ پر اتر آتا تھا۔ ایک دن اس نے گھر میں اعلان کر دیا کہ اس نے لڑکی دیکھ لی ہے۔ اور وہ شادی کرنے والا ہے۔''

''پاگل تھا۔۔؟۔۔ شادی شدہ ہو کر۔۔''

''ہاں پاگل ہی تھا۔۔ شکنتلا بیمار پڑی اور تندرست ہی نہ ہوئی۔۔''

''شاید ہونا ہی نہ چاہتی ہو بے چاری۔۔''

''شاید۔۔ تین دن تک بے موسم کی ایسی برسات ہوئی تھی۔۔ کہ سکولوں میں چھٹیاں کر دی گئی تھی۔۔ وہ موت خاندان میں کوئی نہیں بھولے گا۔ ان کے گھر ہی کے باہر صدیوں پرانا ایک برگد جڑ سے اکھڑ گیا تھا۔ طوفان سا برپا کر دیا تھا موسم نے۔۔ جیسے آسمان بھی غم و غصّے میں مبتلا ہو۔ ساری برادری نے ماتم کیا تھا شکنتلا کی موت پر۔۔ چندرکانت کے گھر والوں نے تک اس کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ یہ شادی اس نے گھر سے نکالے جانے کے بعد ہی کی تھی۔ شکنتلا کو کئی دن نیند نہیں آتی تھی۔۔ پھر ایک رات اس نے کئی پتوں میں سے نیند کی گولیاں نکال کر نگل لیں اور پانی سے بھرے باتھ ٹب میں لیٹ گئی تھی۔''

''ہے بھگوان۔۔ یہ آدمی کیا سب کو کشٹ دینے کے لئے جنما تھا۔۔''

''خود بھی تو کشٹ میں تھا۔۔''

''اپنے ہی پاگل پن کے کارن نا؟''

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو۔۔؟ تم اس کے درشٹیکون سے سوچو۔۔ اس کے ساتھ بھی تو برا ہوا۔۔''

''پہلے کی چھوڑو۔۔ اس دفعہ۔۔''

''کیسے چھوڑا جا سکتا ہے۔۔ وہیں سے تو ساری بات شروع ہوتی ہے۔۔''

''میرا مطلب ہے اگر اسے کام میں رُچی ہوتی تو کیوں روہنی کو کام کی تلاش میں جانا پڑتا۔۔ نہ وہ باہر نکلتی۔۔ نہ وہ انسکیور ہوتا۔۔''

''وہ اس کے کام کرنے سے نہیں اس کی حرکتوں سے پریشان تھا۔۔''

''مطلب۔۔؟ تم سب مرد ایک جیسے انداز سے سوچتے ہو۔۔ میں تمہیں عام مردوں سے الگ سمجھتی تھی۔۔ تم بھی ایسے سوچو گے تو۔۔ تو اور لوگ پھر کیا کہتے ہونگے۔۔۔ ہے بھگوان۔۔''

عورت نے لمبی سانس لی۔

''تمہارا مطلب ہے سب جھوٹ تھا۔۔ چندر کانت بنا کارن کے پگلا گیا تھا۔۔''

''ہاں جھوٹ ہی ہوگا۔۔ مگر اگر سچ بھی ہوتا تو بھی۔۔ اسے کسی طرح رونی کی جان لینے کا ادھیکار نہیں تھا۔۔ اس کے اپنے ساتھ تو ایسا ہونا ہی تھا۔۔''

''ہاں۔۔ شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔۔ اسے تو اپنے پاپ کا بدلہ چکانا ہی تھا۔۔''

''ہاں سنسار کا یہ ہی سنتولن، یہ ہی بیلینس ہے جو بھگوان کی شکتی پر اٹوٹ وشواس کا کارن ہے۔۔''

''ہاں شاید۔۔ جو جیسا کرے۔۔ ویسا بھرے۔۔''

سادھوی خاموش ہوگئی تھی۔ پنڈت جی نے مائک سنبھالا۔۔ منتر پڑھے۔

''بھگوان ان دونوں کی آتما کو مکتی دے۔ تا کہ یہ دوبارہ جنم لینے کا کشٹ نہ بھوگیں۔۔''

پنڈت جی نے ہاتھ پرنام میں جوڑ کر کہا اور اپنی نشست سے اٹھ کر فرش پر ایستادہ ہوگئے۔

''اب پگڑی کی رسم کے لئے راہل ناگپال آگے آئے۔۔''

وہ بولے۔

ذرد چہرے پر سفید صافہ باندھا گیا۔۔

'' کہاں تو وہ اس کے سر پر سہرا دیکھتے اور کہاں۔۔ یہ۔۔''

آخری قطار میں بیٹھی عورت کی آواز میں سسکیاں شامل ہوگئیں۔

''ہاں۔۔ مُرجھا گئے ہیں بچے بیچارے۔۔''

مرد کی آواز میں اداسی تھی۔

راہل اور منی جوڑے ہوئے ہاتھ ٹھوڑی سے لگائے دروازے کے قریب گویا آنے والوں کا شکریہ ادا کرتے نمسکار کر رہے تھے اور لوگ ٹوکری میں رکھی پتیاں تصویر پر چڑھا کر دونوں کو پرنام کرتے نکل رہے تھے۔

آخری قطار والے مرد اور عورت سب سے آخر میں باہر نکلے۔

''مگر سنو۔۔ ان بچوں کا کیا قصور تھا۔۔ جو بھری دنیا میں۔۔ اس طرح۔۔''

مرد نے گردن بائیں جانب موڑ کر عورت کی طرف دیکھا۔
''ہاں۔۔ میں بھی۔۔ یہی۔۔ سوچ رہی تھی۔۔''
عورت نے ہچکی لے کر آہستہ سے کہا۔

مجسّمہ

عظمیٰ چیخ سن کر پلٹی تو دیکھا کہ اُس کی سات سالہ بیٹی کا چہرہ سفید پڑ رہا ہے۔ بہت عرصے بعد آج صبح ہی اُس نے نوٹ کیا تھا کہ عُناب کے رخسار پہلی بار گہرے گلابی نظر آنے لگے تھے۔

''کیا ہوا بیٹیا؟''

عظمیٰ مختصر سے پتھریلے زینے پر ٹھہر گئی اور پلٹ کر عناب کی طرف دیکھا تو عناب بھاگ کر اُس کے گھٹنوں سے لپٹ گئی۔

''وہ۔۔وہ۔۔مجسمہ چلنے لگا ہے امّی۔وہ میرے پیچھے پیچھے آ رہا ہے۔۔وہ۔۔وہ۔''

عُناب پر کپکپی طاری تھی۔

''نہیں، بیٹے۔۔آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔''

عظمیٰ نے جھک کر اُس کے آنسو پونچھے۔اُس کے ماتھے پر آ رہے بالوں کو ایک ہاتھ سے سنوارا اور دوسرے ہاتھ سے اُسے لپٹائے رکھا۔مگر اُس کا ہاتھ اُس کے رخسار کے قریب ہی ٹھہر گیا اور وہ خود کسی پتھر کے بُت کی طرح اُس منظر کو دیکھتی رہ گئی، جسے اُس کی عقل کسی صورت بھی قبول کرنے پر تیار نہ تھی۔

اُس دن بچے جھیل کی سیر کے بعد بے حد اُداس تھے۔ عظمیٰ انہیں کسی ایسے مقام پر لے جانا چاہتی تھی جہاں اُن کا جی بھی بہل جاتا اور اُن کے تجسّس کی تسکین بھی ہو جاتی۔ عظمیٰ خود کو اُن کا مجرم سمجھ رہی تھی۔ مگر اُس کا بھی کوئی قصور نہ تھا۔

''وہاں کی جھیلیں بہت خوبصورت ہوتی ہیں۔''

عظمیٰ نے انہیں سفر کرنے سے کئی دن پہلے جھیلوں اور وادیوں کی بہت سی باتیں بتائی تھیں۔

''بٹکل لیک جیسی۔۔؟''

عناب نے پوچھا تھا۔

''نہیں بیٹے۔۔ یہ تو مصنوعی ہے۔۔ سیاحوں کو attract کرنے کے لیے سرکار نے بنوائی ہے۔''

''تو کیا وہاں کی ساری جھیلیں Natural ہی ہیں۔''

عظمیٰ کا دس سالہ بیٹا راحل بولا۔

''ہاں بیٹے۔ جھیلیں تو قدرت کی ہی بنائی ہوتی ہیں۔ اب چونکہ انسان جھیلیں خود بھی بنا سکتا ہے اس لیے اب بہت سی مصنوعی جھیلیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ مگر ہمارے وہاں کی جھیلیں دنیا کی حسین ترین جھیلوں میں شمار ہوتی ہیں۔ اُن کا پانی اتنا شفاف ہوتا ہے جیسے۔۔ جیسے۔۔''

''جیسے منرل واٹر؟''

دو میں سے کسی نے کہا تھا۔

''ہاں بیٹا۔۔ ایسا شفاف کہ بس۔۔ کوئی دس سال پہلے آپ کے ابو کے ساتھ گئی تھی میں وہاں۔۔ جھیل کی سیر کو۔۔ شکارے میں بیٹھ کر۔ پانی اتنا صاف تھا کہ جھیل کی تہہ میں اُگی آبی گھاس صاف نظر آتی تھی۔ لمبی لمبی۔۔ پانی کی سطح تک آتی ہوئی۔ ذرا سا جھانکو تو ہری ہری گھاس میں روپہلی مچھلیاں ادھر ادھر پھرتی نظر آتیں۔ چھوٹی، بڑی بے شمار۔ آپ دیکھیں گے تو حیران رہ جائیں گے۔ جھیل کے کناروں کے قریب جہاں پانی کی نسبت مٹی زیادہ ہوتی ہے وہاں گلابی رنگ کے نیلوفر یعنی۔۔ کنول کے بڑے بڑے پھول کھلا کرتے ہیں۔۔ اگست کے مہینے میں۔ اُن کے پتے اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ عناب کے چھوٹے سے سر کا چھاتا بن سکتے ہیں۔''

عظمیٰ نے عناب کا سر ہاتھ میں تھام کر ہولے سے ہلا دیا۔ دونوں بچے کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

''پھر اُن مچھلیوں کے شکاری بھی نظر آتے ہیں۔ جانتے ہو کون؟''

''کون؟''

''نیل کنٹھ۔۔اور کون۔۔نیلے، سرخ، نارنجی پروں والے۔لمبی چونچ اور چھوٹی دم والے۔ پانی کے بالکل قریب اُڑتے ہوئے اچانک گردن تک پانی میں ڈبکی مار کر جھٹ سے کسی مچھلی کو دبوچ کر پھر سے اُڑ جاتے۔''

''بیچاری۔۔مچھلی۔۔''

عناب نے اُداس سا ہو کر کہا۔

''یہ تو Food Chain ہے۔۔کوئی نہ کوئی Living Being کسی نہ کسی دوسرے Living Being کو کھاتا رہتا ہے۔''

راحل نے عناب کو دیکھ کر سمجھانے کے انداز میں کہا تھا۔

عظمیٰ کی مسکراہٹ میں محبت جھلکنے لگی۔

''یہ تو ہم شہر کی جھیل کی بات کر رہے تھے۔وہاں کے قصبوں میں اور بھی بہت سی مشہور جھیلیں ہیں جن کے حسن کا جواب ہی نہیں۔۔ایک تو دنیا کی شفاف ترین جھیلوں میں دوسرے نمبر پر آتی ہے۔''

''پہلی صاف جھیل Supreme Lake ہے نا امّی؟''

راحل نے سر ہلا کر کہا تھا۔

''ہاں بیٹا۔''

بچوں ہی کی طرح عظمیٰ خود بھی بے قرار تھی۔

کوئی دس برس ہو گئے تھے۔۔اُس نے اُن گلیوں کو نہیں دیکھا تھا جہاں وہ کھیلی تھی۔وہ خوابوں میں خود کو اُن راستوں پر ٹہلتا دیکھتی جہاں سے گزر کر وہ سکول، کالج، یونیورسٹی گئی تھی۔اُسے اس ہوا کی خوشبو یاد آیا کرتی جس کی ٹھنڈک اُس کے جسم و جاں کو ترو تازہ رکھتی تھی۔

کیا دن تھے وہ۔۔

وہ ہاتھوں کی محراب سی بنا کہ منہ پر رکھ لیتی اور اپنے کمرے کی درمیانی کھڑکی سے باہر دیکھتی ہوئی منہ سے کُک کُک کُک۔۔کُک کُک کُک آوازیں نکالتی۔۔جانے کس درخت کی کون سی ٹہنی پر ننھے ننھے کیڑوں کو کھوجتا کوئی ہُدہُد اُس کی آواز میں آواز ملا دیتا۔کبھی وہ بولتی، کبھی ہُدہُد بولتا۔

کھڑکی کے قریب ایک پُرانا پیڑ بھی تھا۔جس پر سیاہی مائل سرخ شہتوت اُگا کرتے تھے۔ اُس کی شاخوں میں چڑیوں نے گھونسلے بنائے تھے۔ان کی چہکار سے ہی اکثر وہ بیدار ہوا کرتی تھی۔

ترنم ریاض

ایک دفعہ جب کرم کشی والوں نے ہر سال کی طرح، ریشم کے کیڑوں کے چارے کے لیے شہتوت کے درخت کی پتوں سے لدی ساری شاخیں اُتار لی تو چڑیا کا ایک گھونسلہ جانے کیسے دو ٹہنیوں کے درمیان ٹکا رہا تھا۔ مسہری پر کھڑے ہو کر عظمیٰ کو سارا منظر صاف دکھائی دیا کرتا تھا۔ چڑیا اپنے بچوں کے حلق میں چونچ ڈال کر اور سر جھٹک جھٹک کر دانہ اُنڈیلتی۔ اور بچے پنکھ پھڑپھڑاتے للچائی للچائی سی چہکار چھیڑے رکھتے۔ عظمیٰ پہروں اُنہیں سنا کرتی، گھنٹوں دیکھا کرتی۔ چڑیا نے کیسے اُڑنا سکھایا تھا اپنے بچوں کو۔۔ قدم بہ قدم۔۔ جیسے عظمیٰ نے راحل اور عُناب کو چلنا سکھایا تھا۔ جس طرح اس کی ماں نے اُسے سکھایا ہوگا۔

چڑیا ایک بار پھدک کر بچے کو دیکھتی تو وہ بھی ویسی ہی کوشش کرتا۔ مگر کبھی ایک پنکھ کھولنا بھول جاتا کبھی عدم توازن کی وجہ سے گر پڑتا۔ یا پھر بس۔ چڑیا کی طرف چونچ کیے رہ جاتا۔

چڑیا کے بچوں نے جب پہلی انفرادی اڑان بھری تھی تو اُس کے کمرے کے درمیان میں لٹک رہے چھوٹے سے فانوس پر آ بیٹھے تھے۔ وہاں کمروں میں سیلنگ فین کم ہی ہوا کرتے تھے بلکہ ہوا ہی نہیں کرتے تھے۔ ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔

وہ چوکھٹ پر دانہ بکھیر دیا کرتی تھی۔ بچے شاید اُس کی موجودگی سے کبھی خائف نہ تھے۔

فانوس کی تار کے ارد گرد سوکھی ہوئی چکنی مٹی سے دو ابابیلوں نے سیلنگ سے لگا کر ایک گھونسلہ بھی بنا رکھا تھا۔ خدا جانے یہ مخصوص مٹی کس مخصوص ندی کے کنارے سے لاتی تھیں یہ ابابیلیں۔ ایک گھونسلے کے لیے ان گنت بار مٹی ڈھونا پڑتی۔ اور مٹی بھی ایسی جیسے اُس میں گوند ملا دیا گیا ہو۔ بھری ہوئی چونچ کی ساری مٹی گھونسلے سے چپک جاتی اور ایک ذرہ بھی نیچے نہ گرتا۔ کبھی اتوار کو عظمیٰ جب دیر سے بیدار ہوتی تو سیلنگ کے قریب سے یاقوت جیسی چار آنکھیں چمکا کرتیں۔ چپ چاپ دیکھتی ہوئی۔ ابابیلوں نے کبھی اُسے جگانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مگر جب وہ اُٹھ بیٹھتی اور کھڑکی کا پردہ سرکاتی تو وہ لطیف سی چہکار چھیڑ دیتیں۔ جیسے ایک ایک ماترا پر گایا جانے والا کوئی غیر یقینی نغمہ۔۔ جن دنوں عظمیٰ اپنے اس کمرے میں اکیلی سونے لگی تھی تو ابابیلوں کی موجودگی نے اکیلے ہونے کا احساس تک اُس کے پاس نہ آنے دیا تھا۔

سفید سینے اور کالے کالے لمبے پنکھوں والی ابابیلیں۔ جیسے خمیدہ کمر والی ضعیفاؤں نے سفید لباس پر بڑے بڑے سیاہ اوورکوٹ پہن رکھے ہوں۔

کتنی یادیں کتنے سُکھ وابستہ تھے اُس جگہ کے ساتھ۔ دکھ بھی وابستہ ہوں شاید۔۔ مگر اُسے یاد نہ تھے۔

''مگر ہم جائیں گے کب امی۔۔''

عناب نے مچل کر کہا تھا تو راحل کی آنکھوں میں سوالیہ سی چمک جگمگائی تھی۔

''آج آپ کے ابو ٹکٹ لے آئیں گے۔۔بس آپ اپنی اپنی پیکنگ مکمل رکھئے۔کل یا پرسوں ہی نکلنا ہوگا۔۔گھنٹے بھر کی اُڑان۔۔اور ہم اپنے شہر میں۔۔''

جب وہ شہر پہنچے تو ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ایر پورٹ سے نکل کر سڑک پر آئے تو سفیدے کے لمبے چھریرے درخت دیکھ کر عظمیٰ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

''یہ سفیدے کے درخت ہیں بیٹا۔''

گاڑی کی پچھلی نشست پر اپنے دائیں بائیں بیٹھے بچوں سے اُس نے کہا۔

''اور وہ بید کے۔۔یعنی Willow۔''

فیروز نے ہاتھ سے سڑک کے کناروں سے ذرا دور باغوں کی طرف اشارہ کیا۔

''ان کی ایک قسم Weeping Willows کہلاتی ہے جو زیادہ نمی والی زمین میں اچھی طرح پنپتی ہے۔

''Weeping کیوں ابو۔۔''

''وہ بیٹا اس لیے کہ اُن کی ساری شاخوں کا جھکاؤ زمین کی جانب ہوتا ہے۔جیسے کسی پہاڑی سے کوئی جھرنا بہہ رہا ہو۔ان کو بید مجنوں بھی کہتے ہیں۔''

''برگد کی طرح؟جس کی جڑیں اوپر سے نیچے لٹکتی رہتی ہیں۔''

راحل نے کہا۔

''ہاں۔کچھ کچھ۔''

''لوگ کتنے گورے ہیں۔۔وہ دیکھئے امّی۔''

راحل نے سڑک کے کنارے کی طرف اشارہ کیا۔جہاں بس سٹاپ پر کچھ طلبا بس کے منتظر تھے۔

''اور Red,Red بھی۔''

عُناب نے کہا۔

''آپ یہاں رہیں گے تو آپ بھی ایسے ہی سرخ وسفید ہو جائیں گے۔یہاں کی ہوا تازہ جو ہے۔۔پہاڑوں پر ایسی ہی تازگی نظر آیا کرتی ہے۔۔جب ہم یہاں سے گئے تھے تو راحل کے رخسار سیب

ایسے سرخ تھے۔''

عظمیٰ نے اُس کے رخسار پر ہاتھ پھیرا۔

''اور میرے امی۔۔''

''آپ تو پیدا ہی نہیں ہوئی تھیں۔Metro Polis اور گرم آب و ہوا میں رہ کر ہم سب ہی سانولے سلونے ہو گئے۔۔''

عظمیٰ ہنس دی۔

چھٹیاں مہینے بھر کی تھیں۔ ہفتہ بھر رشتہ داروں سے ملاقاتوں میں گزر گیا۔

دوسرے ہفتے کوئی چھ روز ہڑتال رہی کہ کسی دکاندار کو کسی سرکاری محافظ نے محض اپنی انا کی تسکین کی خاطر گولیوں سے بھون دیا۔اُس کے بعد شہر میں اِدھر اُدھر بم دھماکے ہونے لگے۔ضروری کاموں کے لیے لوگ قدرت کے بھروسے نکل جاتے مگر گھومنے پھرنے کے خیال سے کہیں جانا۔۔؟ بات کچھ بنتی نہ تھی۔

پھر یوں ہوا کہ اُن کی رہائش ہی کے باہر بارودی سرنگ میں دھماکہ ہوا۔۔ دھماکے والے بھاگ گئے۔راہگیروں کو پکڑا گیا۔گھروں کی تلاشیاں ہوتی رہیں۔

تین دن پہیہ جام رہا۔۔اور آخیر ہفتہ بس سوچوں میں گزر گیا۔

واپسی میں دو دن رہ گئے۔اب تو کہیں جانے کا پروگرام بنانا ہی تھا۔بچے جھیل کی سیر کے لیے بیقرار تھے اور ان سے زیادہ عظمیٰ اور فیروز۔

جھیل تک کا راستہ کچھ زیادہ طویل نہ تھا۔اُن دنوں اُس راستے میں پانچ چھ سرکاری پارک ہوا کرتے تھے۔اب صرف ایک بچا تھا۔باقیوں میں قطار در قطار نئے نئے کتبے کھڑے تھے۔اکثر پر درج عمریں ۱۵/اور ۳۰ برس کے درمیان تھیں۔ وہ لوگ جب جھیل کے قریب پہنچے تو موسم نہایت خوشگوار تھا۔

جھیل کا باندھ کئی جگہ سے ٹوٹ چکا تھا۔کناروں کے پانی میں چھلے ہوئے بھٹے اور Wafers کے خول تیر رہے تھے۔ پانی گدلا تھا۔

''یہ تو گندی ہے امی۔۔''

عُنّاب نے ماں کی طرف دیکھ کر بے یقینی کے سے تأثرات لیے کہا۔

''یہ کنارہ ہے نا۔۔آگے آگے بالکل شفاف ملے گی جھیل۔''

عظمیٰ نے کچھ سوچتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے کہا۔ فیروز شکارے والے سے بات کر رہا تھا۔

''ہم شکارے میں بیٹھ کر وہاں تک جائیں گے۔۔وہ۔۔وہ دور جو چھوٹا سا جزیرہ ہے نا۔۔ جس میں چنار کے چار درخت ہیں۔۔وہ وہاں۔۔ وہاں جاتے ہوئے ہمیں راستے میں بے شمار ننھی ننھی مچھلیاں، ہری ہری آبی گھاس۔۔نیل کنٹھ اور سب کچھ دیکھنے کو ملے گا۔''

عظمیٰ نے ہاتھ سے دور اشارہ کر کے بچوں سے کہا۔

ہری بیلوں اور بڑے بڑے سرخ پھولوں والے پردوں اور نرم ربر کی کشادہ سیٹوں والا ایک شکارہ کنارے کے زینے سے لگا ان کا منتظر تھا۔ شکارے کا نام Lake Bird تھا۔

بچے گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھ گئے۔ عظمیٰ اور فیروز آگے والی نشست پر بیٹھے اپنے اطراف دیکھ رہے تھے۔۔کوئی دو ایک شکارے دور دور نظر آ رہے تھے۔

''رونق کتنی کم ہوگئی ہے''۔

عظمیٰ نے رونق کے غائب ہونے کی جگہ رونق کم کہا تو فیروز کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ کشتی کے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ عظمیٰ کے دل کی دھڑکن بڑھتی جا رہی تھی۔

کتنی یادیں وابستہ تھیں اس جھیل کے ساتھ۔۔وہ اپنے ابو امی اور بہن بھائیوں کے ساتھ ایک بڑی سی مکان نما کشتی میں، عمدہ پوشاک پہنے، سامانِ خورد و نوش سے لیس جھیل کی سیر کو نکلی ہے۔ کناروں پر مغل باغات کی سیر بھی کی جائے گی۔۔ابو کتنی مصروفیت کے باوجود چھٹی کے روز سب کو سیر پر لے جاتے تھے۔ اب ابو بھی نہیں رہے۔۔میلے کا سا سماں ہوا کرتا تھا۔ مقامی لوگوں سے لدی کشتیاں، ملکی اور غیر ملکی سیاح۔۔کوئی موٹر بوٹ پر جھیل کے پانی میں زور و شور سے لہریں پیدا کرتا ہوا جا رہا ہے کوئی Water Skeeing کر رہا ہے۔ ہنی مون پر آئے جوڑے شکاروں کے پردے برابر کیے عہد و پیمان میں مصروف ہیں، کہیں پیراکی ہو رہی ہے، کہیں کسی فلم کی شوٹنگ چل رہی ہے۔۔کسی پھولوں سے لدی کشتی کو کوئی گل رخ حسینہ کھیتی ہوئی پھول بیچ رہی ہے۔ ان پھولوں میں گلِ نیلوفر اپنے حسن و جسامت کی بنا پر سب پھولوں کا بادشاہ معلوم ہوتا ہے۔۔اُس کے ساتھ گلاب، نرگس، گیندا، موگرا، یاسمین اور جانے کون کون سی قسم کے پھول ماحول کو معطر کیے ہوئے ہیں۔ کسی کشتی پر پھلوں اور سبزیوں کی بہار ہے۔ جھیل میں تیرتے باغیچوں میں اُگی سبزیاں اور ایک سبزی جو پانی میں اُگا کرتی ہے۔ نیلوفر کے پھول کا موسم ختم ہو جانے پر اُس کے درمیان کا حصہ جہاں ننھی ننھی پتیاں اُگی ہوتی ہیں، رفتہ رفتہ پروان چڑھتا ہے اور مکمل

ڈوڈہ کہلاتا ہے۔ جس میں نرم و نازک لذیذ گریاں ہوتی ہیں اور اسی نیلوفر کی ڈنڈی بڑی ہو کر، کمل ککڑی، بھیں یا نڈر کہلاتی ہے۔ جو ایک مرغوب سبزی ہے۔ جھیل کے کناروں پر ہی ایک مخصوص قسم کی گھاس بھی اُگتی ہے جس کی شاخیں نہیں ہوتیں۔ اس کی چٹائیاں بُنی جاتی ہیں۔ ان چٹائیوں پر مٹی بچھا کر اسے قابل کاشت بنایا جاتا ہے۔ ان تیرتے ہوئے باغیچوں میں اُگی سبزیاں حیاتین سے پُر ہوتی ہیں۔ عظمیٰ نے سنا تھا کہ اس طرح کے تیرتے ہوئے باغ وادی کے علاوہ دُنیا میں صرف جنوبی امریکہ میں 'پیرو کی ٹے ٹیکا' جھیل میں پائے جاتے ہیں لیکن وہ قدرت کے بنائے ہوئے جزیروں پر انسان نے لگائے ہیں، جانے کیسے تیرتے ہوں گے وہ جزیرے۔ اُن پر بھی سبزیاں اُگائی جاتی ہیں۔ مگر وادی کی جھیلوں، ڈل، وُلر، نگین آنچار وغیرہ پر تیرنے والے باغیچے انسان کے ہاتھوں کا کرشمہ ہیں۔۔

آج پھلوں پھولوں والی کوئی کشتی نظر سے نہیں گزری ابھی تک۔

عظمیٰ سوچتی۔

یہ ملاح کتنی سست رفتاری سے نیا کھے رہا ہے۔ جیسے اُداس ہو۔ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے کوشاں، پُر جوش ملاحوں کی کشتیوں میں بیٹھنا ایک الگ ہی لطف دیتا تھا۔

کہیں کیوں نظر نہیں آ رہی تھیں آج یہ سب چیزیں۔؟۔۔کیوں۔۔؟ ہاں وہ جانتی تھی کیوں۔ مگر سمجھنے سے قاصر تھی۔ دور کنارے پر کہیں کنول کے پھول کھلے ہوئے تھے۔

عظمیٰ حیرت سے دیکھنے لگی۔

یہ تو اگست میں کھلا کرتے تھے۔ جون میں ہی کیسے۔۔ ہاں کرۂ ارض کی حرارت بڑھ جو گئی ہے۔۔ اسی لیے۔۔ اس دفعہ دوپہریں کچھ گرم بھی تھیں۔۔ عظمیٰ کو کئی بار خیال آیا تھا کہ یہاں بھی گرمی سے نپٹنے کا کوئی انتظام کیا جانا چاہیئے۔ نئے مکانوں میں اسی لیے اب سیلنگ میں پنکھے لگائے جا رہے ہیں۔۔ حضرت بل کے خواتین کی خاطر مخصوص عبادت والے دالان میں اس نے کولر بھی دیکھے تھے۔ فیروز نے بتایا تھا کی باقی دالانوں اور بالا دریوں میں بھی مصنوعی ٹھنڈک کا انتظام کیا گیا ہے۔ پہلے صرف فرش پر ایستادہ رہنے والے پنکھے استعمال ہوا کرتے تھے، گرمیوں کے محض چند ایک دن کی خاطر۔

اور اب۔۔ بھٹے، اخروٹ وغیرہ جو اکتوبر میں پکا کرتے تھے۔۔ فروخت ہو رہے ہیں۔۔ ساری دنیا ہی بدل رہی ہے۔۔ عظمیٰ آسمان کو دیکھنے لگی۔

مگر جھیل تو نہیں بدلی۔۔ اسے یکلخت خیال آیا تو وہ جھک کر پانی کو دیکھنے لگی۔ کشتی کنارے

سے خاصی دور آ گئی تھی۔۔ مگر پانی۔۔

عظمیٰ کے اندر چھن سے کچھ ٹوٹا اور ریزہ ریزہ بکھر گیا۔ وہ پانی کو دیکھتی چلی گئی۔ پانی مسلسل ویسا ہی نظر آ رہا تھا جیسا کناروں کے قریب تھا صرف اُس میں اس وقت اُسے چھلے ہوئے بھٹے اور آلو کی چسپس کی خالی تھیلیاں نظر نہیں آ رہی تھیں۔

جھیل کا پانی پہلے سے اتنا مختلف تھا کہ اُسے محسوس ہوا وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔۔ کوئی ڈراونا خواب جو ختم ہونے میں نہیں آ رہا۔ اُس کے چاروں طرف میلا گدلا پانی تھا۔۔ دور دور تک پھیلا ہوا۔۔ جیسے پانی میں سیاہی جیسی کوئی چیز گھل گئی ہو۔ گلی سڑی گھاس کے تنکے پانی میں تیر رہے تھے۔ پانی کسی کم گاڑھے دلدل کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ محض انچ بھر گہرائی کے بعد، پانی کے اندر کچھ واضح نہ تھا کہ کنارے پر بنے ہوٹلوں اور آبی گھروں کی آلودگی کا نکاس جھیل میں ہی ہوتا اور صفائی کا انتظام نہ کے برابر۔ کہیں کوئی مچھلی نہیں تھی۔۔ نہ ہی کوئی نیل کنٹھ۔ اس نے کہیں دور دیکھا تو معلوم ہوا کہ لوگوں نے جھیل کے کناروں سے اور اندر کی طرف بڑھ کر مکانات بھی تعمیر کر لئے ہیں۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کا دل کسی چیز کے سہارے ٹکا تھا جس کے اچانک سرکنے سے دل نیچے گرا چاہتا ہو۔ بچے اُس سے جانے کیا کیا سوال کر رہے تھے۔ فیروز انھیں تسلی بخش جواب دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور وہ شاید اپنے اندر کوئی بکھراؤ سا محسوس کر رہی تھی کہ خود کو سمیٹ کر کسی سے بات کرنا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔

کیا صدیوں پہلے کی طرح آج کوئی حکیم سُویہ نہیں پیدا ہو سکتا۔ کیا پھر سے کوئی معرکہ سر نہیں ہو سکتا۔ کتنا مشہور ہے کشمیر کی تاریخ میں سُویہ کا کارنامہ۔ صدیوں پہلے کا کارنامہ۔۔ نویں صدی کے ایک راجہ اَونتی ورمن کے راج میں ایک دانا درباری حکیم سُویہ ہوا کرتا تھا۔ جہلم جو اُن دنوں وِتستا کہلاتا تھا، گرمی کے موسم میں اکثر و بیشتر طغیانی پر ہوتا کہ دھوپ کی تمازت سے پہاڑوں کی برف پگھل کر وادیوں کی طرف بہہ نکلتی تھی۔ اور کناروں پر بسے گاؤں، شہر سیلاب کی زد میں آ جاتے تھے۔ خطے کے شمالی علاقوں میں ایک حصہ ہر برس جب سیلاب کا شکار ہونے لگا تو سُویہ نے رعایا سے محبت کرنے والے راجہ اونتی ورمن کے خزانے سے اشرفیاں لے کر دریا میں پھینکی جنھیں پانے کی خواہش میں لوگوں نے دریا کی تہہ سے مٹی نکال کر دریا کو گہرا اور کناروں کو اونچا کر دیا جس سے سیلاب کا خطرہ جاتا رہا۔۔ لوگ سُویہ کے اس کارنامے کی وجہ سے اُسے حکیم سُویہ پکارنے لگے کہ اُس کی حکمت سے وہ ایک بہت بڑی مصیبت سے ہمیشہ کے لیے آزاد ہو گئے تھے۔ اس مقام کا نام سُویہ پور رکھا گیا جو رفتہ رفتہ بگڑ یا سنور کر سوپور ہو گیا۔۔

عظمیٰ افسردگی سے سوچتی رہی۔۔ کیا آج کوئی ایسا حکیم۔۔ کوئی حاکم۔۔

کوئی ہمدرد۔۔ کوئی۔۔ جو جھیل کا سارا منظر پہلے جیسا کردے۔۔ شفاف اور کشادہ جھیل۔۔اس منتشر سرزمین کو سنوار دے۔

کشتی کو ہلکا سا جھٹکا لگا تو اُس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ کشتی کنارے سے لگ چکی تھی۔ بچے بُجھے بُجھے سے تھے۔ فیروز خاموش۔۔اور وہ خود بے حد اُداس۔ فیروز کو کہیں جانا تھا۔

عظمیٰ کی نظر بچوں کے چہروں کی طرف اُٹھ گئی۔

''عجائب گھر دیکھیں۔۔؟۔۔Museum؟''

پتہ نہیں اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جیسی کوئی شے کہاں سے آ چپکی۔

''ایک دم پرانے زمانے کی چیزیں۔۔جو آپ نے کبھی نہ دیکھی ہوں گی۔۔''

اُس نے تأثرات میں اشتیاق پیدا کیا۔

''جی امی۔۔''

راحل نے آہستہ سے کہا۔

''ہم بھی دیکھیں گے۔۔''

عناب ہلکے سے مسکرائی۔

میوزیم جہلم کے کنارے ایک روح پرور باغ سے لگا ہوا نہایت پرسکون معلوم ہو رہا تھا۔ پھاٹک کے قریب ریت کے تھیلیوں میں محفوظ پہرے دار نے ان کی شناختی پرچیوں کا معائنہ کیا۔۔میوزیم میں داخل ہوتے ہی بچے ہشاش بشاش نظر آنے لگے۔

احاطے سے اندر داخل ہوتے ہی ایک پرانے وقتوں کی توپ نے ان کا استقبال کیا۔ اُس کے بعد مہاتما بدھ کا ایک قدیم مجسمہ نظر آیا۔ داہنی طرف چھوٹا سا زینہ اتر کر باغیچے کے کنارے سے لگا ہوا ایک بہت بڑا پتھر تھا جو کوئی کتبہ معلوم ہوتا تھا۔ دوسری طرف بغیر سر کی ایک مورتی تھی جس کا جسم نہایت خوبصورتی سے تراشا گیا تھا۔

عمارت کے اندر جانے کا راستہ مختصر تھا اور پتھر کی پتلی لمبی سلوں کو ساتھ ساتھ رکھ کر بنایا گیا تھا۔۔سلوں کے درمیان جا بجا ہری ہری گھاس اُگ آئی تھی۔

عمارت میں داخل ہوتے ہی اُن کی نظر سرسوتی کے ایک پرشکوہ مجسمے پر پڑی، جس کے قدموں کے پاس لکھی عبارت پر دوسری صدی کی کوئی تاریخ درج تھی۔ سرسوتی کا مجسمہ آنکھیں بند کیے

پُراسرار سے انداز میں مسکرا رہا تھا۔ شیشے کے ایک بڑے شوکیس میں ایک اور موتی تھی۔۔ یہ مورتی درگا کی تھی جو ایک بہت بڑے دروازے میں جڑی ہوئی تھی۔ غالباً کسی مندر کا حصہ رہی ہوگی اور کھدائی میں دریافت ہوئی تھی۔ اُس کے گرد لگے دائرے میں ماتا درگا کے مختلف رُوپ لیے کئی چھوٹے چھوٹے مجسمے تھے۔۔ اور یہ سب ایک ہی پتھر کو تراش کر کسی عظیم فن کار نے نہایت مہارت سے بنایا تھا۔

''یہ چھٹی صدی میں رائج تھا۔۔ تانبے کا ہے۔''

بجھے بجھے سے گائڈ نے عجائب خانے کی سیر کو آئے اکلوتے سیاح کنبے کو بتایا۔ یہ سکہ مجسمے کے بالکل سامنے شیشے کی چھوٹی سی صندوقچی میں لگا تھا۔

دوسری طرف بھگوان مہاویر کا بہت بڑا مجسمہ جیسے کہ صدیوں سے مراقبے میں بیٹھا تھا۔ کونے میں کالی کی پُر جلال مورتی تھی۔ اُس کا ترشول اُس کے پیروں کے پاس پڑے کسی ظالم کے سینے میں پیوست تھا۔

ہال کا آخری سرا ایک مستطیل کمرے کے ساتھ جوڑا گیا تھا۔۔ جس میں چھوٹے سے دروازے سے گزر کر ہی داخل ہوا جاتا۔

اُس کمرے میں مختلف اوزار اور ہتھیار تھے۔ شیشے کی الماریوں میں بند۔ جن کے کونوں پر سَن، حاکم کا نام وغیرہ درج تھا۔

راحل اور عناب انھیں نہایت دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

چھ چھ فٹ لمبی بندوقیں۔۔ ذرہ بکتر۔ کچھ ہاتھی دانت کے دستے والی تلواریں تھیں۔ مخصوص امراء وزراء کی۔ کچھ پر دھات میں چھلائی سے گل بوٹے بنے ہوئے تھے۔ ماضی کے سیاست والے اوراق کو تاریخ بنانے کے عمل کے عوض اپنے حصے کا خون پی کر سارے ہتھیار خاموشی کے ساتھ دیوار سے لگ کر آ کھڑے ہوئے تھے۔

عظمیٰ نے ایک گہری سانس لی۔

قافلہ دوسرے ہال میں داخل ہوا۔۔ وہاں کی اشیاء بالکل مختلف تھیں۔ مغلوں کے زمانے کے غالیچے۔ پشمینے کے قالین۔۔ شاہ توس کی ایک بڑی سی چادر پر مہاراجہ رنبیر سنگھ کے وقت کے شہر کا ایک نقشہ۔ مکمل تفصیل سے بنا ہوا۔ جس میں جھیلیں، بستیاں، کوہ، دریا سب مختلف رنگوں کے ریشمی دھاگوں سے کاڑھے گئے تھے۔

مغلیہ، شاہی پوشاکیں، رومال وغیرہ۔ پیر ماشی اور اخروٹ کی لکڑی سے بنی دستکاریاں مختلف

دھاتوں کے برتن۔ ہاتھ دھلوانے والا تانبے کا قلعی کیا ہوا بہت بڑا منقش کوزہ اور آفتابہ۔

''اسے کیسے استعمال کرتے ہوں گے امّی؟''

راحل نے پوچھا۔

''کئی کئی لوگ اٹھاتے تھے دونوں کو۔۔ بیک وقت کم سے کم چھ چھ آدمی۔''

گائڈ نے اُسے بتایا۔

شیشے کے ڈھکن والی لمبی سی میز کے اندر مختلف دھاتوں کے ہاتھ سے بنے زیورات تھے۔ ان میں کچھ اب بھی رائج ہیں۔ عظمیٰ نے سوچا۔ جیسے کانوں کے بڑے بڑے بالے۔ اتنے بھاری جھمکے کہ ایک دوسرے سے ایک زنجیر کے ساتھ جوڑے گئے تھے۔ وہ زنجیر سر کے اوپر آنچل کے اندر رہتی اور کانوں پر بوجھ نہ پڑتا۔

دھات اور پتھروں سے بنی پازیبیں، مالائیں۔۔ کچھ برتن۔ کچھ قدیم کتب کے قلمی نسخے۔۔ مغل بادشاہ اورنگ زیب کے ہاتھ سے لکھا ہوا قرآن پاک۔ کچھ قدیم ریاستی معاہدے۔۔

اتنی دلچسپ اور اہم اشیاء کو دیکھ کر عظمیٰ اور بچّے کچھ کھلے کھلے سے مطمئن سے نظر آرہے تھے۔ اور پُر اشتیاق ہر شے کا مشاہدہ کر رہے تھے۔

اس کے بعد کے ہال کو ایک گلیارے کے ذریعے دوسری طرف کے ہال کے ساتھ جوڑا گیا تھا۔ بچّے اگلے ہال کی طرف جاچکے تھے۔

عظمیٰ جب وہاں پہنچی تو بچّے نہایت انہماک سے وہاں نسب مجسّموں کو دیکھ رہے تھے۔ یہ مجسمے ریاست کے تینوں خطوں میں رہنے والے لوگوں کے مختلف ملبوسات میں ایستادہ ڈمی کی طرح بنائے گئے تھے۔ مگر قدیم لباس میں۔ بغیر زیورات کے۔ سادہ۔ سادہ سے۔

اپنے بچپن میں بھی عظمیٰ نے انھیں اسی جگہ پر ایسے ہی نسب دیکھا تھا۔ ان کے کپڑے اب بوسیدہ ہو چکے تھے۔ گو کہ نلکیوں کے ذریعہ تمام الماریوں تک Perservative Gas پہنچائی جاتی تھی مگر یہ مجسمے الماریوں میں نہیں رکھے گئے تھے۔

سامنے کا دروازہ ایک بڑے ہال میں وا ہوتا تھا۔ اس میں عنقا اور موجود، دونوں قسم کے بہت سے پرندوں اور جانوروں کی کھالیں حنوط کر کے اس مہارت سے اصلی شکل میں منتقل کی گئی تھیں کہ نقل کا گماں تک نہ ہوتا تھا۔

شیر۔ چیتا۔ تیندوا۔ مارخور بکرا جس کے سینگ خمدار ہوتے ہیں اور جو بڑے شوق سے سانپ

کھاتا ہے۔ اود بلاؤ۔ نیولا۔ بھالو وغیرہ۔ اور اس کے علاوہ وادی میں پائے جانے والے پرندے، چیل، کوا۔ گدھ۔ کبوتر۔ سُن پچر جو مور سے مشابہہ ہوتا ہے کہ اُس کے سر پر تاج تو ہوتا ہے مگر دم نہایت مختصر۔ مختلف قسم کی بطخیں، راج ہنس، بگلے، طوطے، مینا، کستوری، کئی طرح کی بلبلیں اور دیگر اقسام کی چڑیاں۔

اسی ہال میں دوسری طرف اکبر بادشاہ کا چھوٹا سا آدھے دھڑ کا مجسمہ تھا۔ عظمیٰ کو یاد آیا کہ جب وہ بہت چھوٹی سی تھی تو اُس کے چچا نے بنایا تھا۔ چچا بہت لگن سے مجسمے بناتے تھے۔ انھوں نے اکبر کے تاج پر سونے کے گھول سے نقاشی کی تھی۔ پھر بازو کی تکلیف کی وجہ سے انھوں نے اپنا یہ مشغلہ چھوڑ دیا تھا۔ چچا نے اپنی ایک چہیتی بیوی کا مجسمہ بھی بنایا تھا۔ وہ ان کی دوسری بیوی تھی۔ وہ مجسمہ اب بھی ان کی آبائی بنگلہ کے کسی گوشے میں محفوظ ہے۔

عجائب خانے کے ریکارڈ میں فن کار کا نام بھی محفوظ ہوگا۔ عظمیٰ کو خیال آیا۔

یہاں کئی مجسمے چچا کے ہاتھوں کے بنے تھے۔ اونی پھرن اور ٹوپی پہنے حقہ پیتا ہوا آدمی۔ سماوار سے پیالی میں چائے انڈیل رہی تِلّے کی کڑھائی والے گریبان کا پھرن پہنے خاتون۔ ہل چلاتا ہوا کِسان۔ دودھ بلوتی ہوئی گوالن وغیرہ، کانچ لگی الماریوں میں محفوظ تھے اور اب بھی ان کی چمک جوں کی توں قائم تھی۔ ویسی ہی جیسے عظمیٰ نے اپنے بچپن میں دیکھی تھی۔

مگر ٹوٹے کانچ کی الماریوں کے اندر کی چیزوں میں کوئی جاذبیت باقی نہیں تھی۔ یعنی حال کی طرح ماضی بھی اُجڑ سکتا ہے کہ یہاں کی بھی دیکھ بھال ٹھیک طرح سے نہیں ہو رہی تھی۔ عظمیٰ نے ایک گہری سانس لی۔

گائڈ دوسرے دالان تک ساتھ آ کر لوٹ گیا تھا۔

وہ اُداس اُداس سی آگے بڑھتی رہی۔۔ ایک ایک چیز کو غور سے دیکھتی ہوئی جانے کیا کیا سوچتی ہوئی۔

ہال کے آخری سرے پر جہاں سے برآمدہ نظر آتا تھا، ایک قدِ آدم مجسمہ ایک پرانی چھوٹی سی میز پر ٹکا ہوا تھا۔ جیسے کسی ایسی بیمار لڑکی کی مورت، جو کھڑی رہنے سے تھک کر ذرا سا میز پر بیٹھ گئی ہو۔ سوکھی لکڑی سے ہاتھ پاؤں۔ گڈھوں میں دھنسی آنکھیں۔۔ عظمیٰ نے یہ مجسمہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ کس قدر عظیم فن پارہ۔۔ کسی بلند درجہ فن کار کا بنایا ہوا مجسمہ۔۔ وہاں کی ادھیڑ عمر کنواریوں کا ہو بہو عکاس۔ عظمیٰ اس شاہکار کو انگشت بدنداں دیکھتی رہ گئی۔

واہ۔۔

جانے مجسمے کی آنکھوں میں کیا بات تھی کہ دل میں درد سا بھر جاتا۔۔اس کی نظریں باہر برآمدے والے راستے پر گڑھی تھیں جیسے کسی کی راہ تک رہا ہو۔

عظمٰی عش عش کر اٹھی۔

اور بچوں کو بلاتی ہوئی عمارت سے باہر نکل آئی۔راحل اُس کے پیچھے پیچھے چلا آیا۔

عناب نے پکار کر کہا کہ آ رہی ہے۔

عجائب خانے کے کراہتے ہوئے سکوت میں اُس کی آواز گونج اُٹھی۔اونگھتے ہوئے محافظ نے چونک کر ادھر اُدھر دیکھا تھا۔

عظمٰی آگے بڑھ گئی۔ابھی اُس نے پہلے ہی زینے پر قدم رکھا تھا کہ اُسے عناب کی چیخ سنائی دی۔عناب کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔

ادھیڑ عمر کنواری لڑکی کا لاغر مجسمہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا ہوا اُنہی کی طرف چلا آ رہا تھا۔

عظمٰی دم بخود اُسے دیکھتی رہ گئی۔

(افسانوی مجموعے یمبرزل سے)

یمبرزل

اس انجام کا خدشہ سب کو تھا مگر اس کی توقع کسی کو نہیں تھی۔ ماں اس پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھی۔ باپ اسے قبول نہیں کر سکا تھا۔ یاور ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اور انیقہ ۔۔

''بکی باجی۔۔ یہ الجیبر امجھے ضرور فیل کرے گا۔۔''

یوسف نے پھرن کے اندر سے آگ بھری کانگڑی باہر نکال کر سبز گل بوٹوں والے سرخ قالین کے عین درمیان رکھ دی۔

''ہم سے تو یہ نہ ہوگا۔۔ نہ ہم پاس ہوں گے۔''

وہ لانبی لانبی انگلیوں سے ترچھی مانگ کے دونوں اطراف کنگھا کرنے لگا اور گردن اُچکا کر دیوار میں لگے بڑے سے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے گنگنانے لگا۔

''چوپ۔۔ چوپ۔۔''

بکی کی خاص کوشش کے بعد بھاری بنائی ہوئی آواز گونجی۔

''چپ چاپ بیٹھے رہو۔۔ کانگڑی اٹھا کر کنارے نہیں رکھ سکتے تم یوسف، کسی کی ٹھوکر لگ گئی۔۔تو۔۔؟''

''نکی باجی۔ یوسف بھائی تو خوامخواہ کانگڑی گود میں اُٹھائے پھرتے ہیں۔۔اب ایسی سردی تو ہے نہیں۔ ابو نے اس کمرے میں اسی لیے بخاری نہیں لگائی کہ ہم سب چست رہیں گے اور پڑھنے میں مصروف رہیں گے۔۔ خوب سارے کپڑے پہن کر کہاں لگتی ہے سردی۔۔ کانگڑی پھرن کے اندر ٹھونس کر جمائیاں لیتے رہتے ہیں۔۔ جب دیکھو۔ خاک پڑھیں گے۔۔؟''

یاور نے کتاب پر جھکا سر اُٹھا کر نکی کے چہرے پر اپنی طرف سے بڑی اہم بات کہہ کر ردِعمل جانچنے کی کوشش کی۔ اور ایک نظر آئینے میں یوسف کے عکس کو دیکھ کر نتھنے سکیڑے پھر ابرو اوپر کو کھینچے اور دانت نکوس کر بغیر آواز ہنسا اور کتاب پر ایسی عجلت سے جھکا جیسے بہت ضروری سبق ادھورا چھوڑنا پڑا ہو۔

''آپ سے کس نے رائے مانگی تھی۔۔''

نکی نے آواز میں بھرا ہوا رعب ذرا کم کر کے کہا۔

''آپ اپنا کام کیجئے''

وہ بولی۔

''ادھر لاؤ کتاب یوسف۔۔ ابھی تو سمجھایا تھا یہ سوال تم کو۔۔''

نکی نے لمبا سا رجسٹر اور کتاب اپنی طرف سرکائے تو یوسف فرش پر کہنیوں کے بل لیٹ گیا اور رجسٹر پر نظریں گاڑھ دیں۔

''اوپر اُٹھو یوسف۔۔ سونے کی تیاری مت کرو نا۔۔ میرا ابھی کل پیپر ہے۔۔ پلیز۔۔''

نکی فوراً دبلی پتلی سی باریک آواز والی لڑکی بن گئی۔ اور یوسف جیسے کہ ہوش میں آ گیا۔

''اوہ۔۔ Sorry نکی باجی۔۔ ایک بار اور کوشش کرتا ہوں۔۔''

یوسف نے رجسٹر اور کتاب اپنی طرف سرکائے۔ کچھ لمحے نکی کی طرف دیکھتا رہا۔ گلابی جلد والا کتابی چہرہ۔ لمبی سی آنکھوں پر چھوٹا سا بغیر فریم کا چشمہ۔ رخسار پر کان کے پیچھے سے آنے والے بالوں کی ایک پتلی سی لٹ۔ اور کان میں چھوٹی سی سنہری بالی۔ دوسری بالی اُس زاویئے سے نظر نہیں آتی تھی۔ باقی بال سر کے پیچھے کی طرف موٹے سے سیاہ ہیر بینڈ میں پھنسے تھے۔ دودھ ایسی سفید گردن پر دو ایک لاجوردی نسیں۔ اور گردن کے ساتھ لگا سیاہ رنگ کے سویڈ کے موٹے سے کپڑے پر بغیر کڑھائی کے کالر والے پھرن کا بند زپ۔ کلائی تک آتی ہوئی آستین میں سے جھانکتے نازک ہاتھ میں قلم۔ سامنے کئی کتابیں اور

کاپیاں بکھری ہوئیں۔

''کیا سوچ رہے ہو اب۔۔تم۔''

نکی نے اُسے کچھ پل لگاتار دیکھ کر پوچھا۔

''نہیں۔۔کچھ نہیں نکی باجی۔۔''

وہ جلدی سے بولا اور کتاب پر جھک گیا۔نکی نے دیوار سے ٹیک لگادی اور تلوے فرش پر رکھ کر موڑے ہوئے گھٹنوں پر کتاب پھیلا دی۔

تینوں سر کتابوں پر جھک گئے۔

نکی یاور کی بڑی خالہ تبسم بیگم کی اکلوتی اولاد تھی۔یاور کی ماں تنویر بیگم کی لاڈلی بھانجی، جو کچھ دن اپنی خالہ کے یہاں رہنے آئی تھی۔بلکہ اس کی موجودگی میں اُس کا خالہ زاد بھائی یاور بھی پڑھنے کے معاملے میں ذرا سنجیدہ ہوجایا کرتا تھا۔وہ جماعت ششم کا طالب علم تھا۔نکی گیارہویں درجے کی طالبہ تھی۔کچھ مہینوں پہلے تنویر بیگم اپنے جیٹھ کے بیٹے یوسف کو بھی اپنے یہاں لے آئی تھیں کہ وہ کچھ شرارتی واقع ہوا تھا اور تنویر چچی سے بہ نسبت اپنے والدین کے، زیادہ مانوس تھا۔

''نکی باجی آپ خود تو پڑھ نہیں رہیں۔۔''

یوسف نے سر ذرا اونچا کر کے نکی کی نوٹ بک دیکھنے کی کوشش کی۔

''شاعری کر رہی ہوں گی نکی باجی۔''

یاور نے بغیر سر اٹھائے کہا۔

''تم لوگ میرے استاد ہو یا میں تمہاری۔چپ چاپ اپنا کام کرو۔۔ورنہ ایک ایک تھپڑ۔۔''

''آج تو آپ یوسف بھائی کے ایک تھپڑ جڑ۔۔''

''چپ بے ایک تھپڑ کے بچّے۔۔نکی باجی صرف دھمکاتی ہیں۔۔ماریں گی تھوڑے ہی۔۔''

''اب جس نے بات کی نا۔۔تو ساری دھمکیاں سچ ہوجائیں گی۔سمجھے تم لوگ۔۔اتنا اچھا شعر ہوا ہے۔۔مگر تم لوگ سوچنے کی مہلت دو تو نا۔۔''

''تو سنا دیجئے نا نکی باجی۔۔پلیز۔۔ورنہ یوسف بھائی بڑے خالو سے کہہ دیں گے۔۔''

یاور اپنا چھوٹا سا گورا ہاتھ ہونٹوں پہ رکھ کر ہنسا۔نکی نے اس کی طرف نتھنے پھلا کر اور آنکھیں سکیڑ کر دیکھا پھر دانت بھینچے۔شہادت کی انگلی ناک پر رکھی اور آواز بھاری کر کے کھنکھارا کی۔

''خاموش۔۔''

اُس نے سر جھٹک کر کہا اور تینوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

نکی نے تازہ ترین شعر سنایا اور یاور نے ہاتھ لہرا لہرا کر داد دی:

چھوڑ جانے سے پہلے، تصور ترا

مجھ سے کہہ دو، کہ ہوگا کہاں چھوڑنا

''واہ نکی باجی۔ یہ اُسی غزل کا شعر ہے نا۔۔ جو آپ نے کل سنائی تھی۔۔''

''ہاں اُسی کا۔۔ اور سنائی نہیں پڑھی، کہا جاتا ہے۔''

نکی نے یاور کو سمجھایا۔ یوسف نے نکی کی آنکھوں میں دیکھا۔

''ہاں۔۔

اس سے پہلے، پڑے یہ جہاں چھوڑنا

وقت کی ریت پر کچھ نشاں چھوڑنا''

''تم سمجھدار ہو۔۔ ورنہ لوگ تو شعر کا تماشا بنا دیتے ہیں۔''

نکی نے ترچھی نظر سے یوسف کو دیکھا اور یاور کا گال تھپتھپا کر کہا۔

''اللہ۔۔ اتنی سنجیدگی سے داد دی۔۔''

یوسف نے چہرے پر خفگی کے آثار طاری کرنے کی کوشش کی۔

یاور اور یوسف دونوں چچازاد بھائی تھے اس لیے صورتوں میں مشابہت ممکن تھی مگر ان دونوں کے چہرے کافی حد تک ایک سے تھے۔ سیاہ گھنگھریالے بال، سرخ و سفید رنگت، متناسب دانت اور نیلی نیلی پتلیاں۔ دو چیزیں البتہ الگ تھیں کہ یوسف کا قد یاور سے کوئی دو فٹ زیادہ تھا بلکہ وہ تو نکی سے بھی فٹ بھر لمبا تھا اور دوسرے اُس کی مونچھیں اُگ آئی تھیں اور کہیں کہیں داڑھی بھی۔

اُس دن شہر کے سب سے بڑے چوک میں بم پھٹا تھا۔ کچھ فوجی جوان زخمی ہوئے تھے۔ کچھ عمارتیں جلی تھیں۔ ہر روز اسی طرح کا کچھ نہ کچھ ہوا کرتا تھا۔ سکون کی لے پر بہتے وقت میں کچھ ایسا انتشار اُٹھا کہ آٹھوں پہر اُتھل پُتھل ہو گئے۔

یوسف نکی کو گھر چھوڑنے جا رہا تھا۔ اُس کے گھر کو مُڑنے والے موڑ پر دھواں اڑتا دکھائی دیا۔ لوگ بے تحاشا ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ چوڑی سڑک کی دوسری جانب بستی تھی اور اس طرف قبرستان۔ دور سے بکتر بند گاڑیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ لوگ تیزی سے سڑک پر سے غائب ہو رہے تھے۔

گولیوں کی آوازیں ان کا تعاقب کر رہی تھیں۔

بھاگتے ہوئے لوگوں میں سے ایک معلوم نہیں کیسے گر گیا۔ اُس کے پیچھے سے آ رہی فوجی گاڑی میں سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ یوسف نے ایک لمحے کے کسی حصے میں دیکھا کہ گرے ہوئے آدمی کے بالکل قریب کوندا سا لپکا تھا اور گولی چلنے کی آواز آئی تھی۔ پھر سڑک پر گرا آدمی کوئی فٹ بھر اُچھلا اور دوبارہ سڑک پر آ رہا۔ یوسف سڑک کے کنارے کی طرف بھاگا۔

اُس نے مضبوطی سے نکی کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

یہ سب نکی نے بھی دیکھا تھا۔

سڑک کا کنارہ ختم ہوتے ہی ڈھلان شروع ہو جاتی تھی۔ وہ دونوں چند قدم اور نیچے کو بھاگے اور منڈیر کے ساتھ لگ گئے۔ نکی نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھا تھا۔ ہچکیاں اس کے سینے میں گھٹ رہی تھیں۔ وہ چیخنا چاہتی تھی۔ یوسف نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اُسے اپنے ساتھ زمین پر بٹھا دیا۔

کئی منٹوں تک وہ دونوں ہانپتے رہے۔ پھر ماحول پر سکوت طاری ہو گیا۔

نکی نے آنکھیں بند کر لیں اور سر پیچھے کو ٹکا دیا۔ رفتہ رفتہ ان کی سانسیں معمول پر آ گئیں۔ یوسف نے دیکھا کہ سامنے وسیع و عریض قبرستان کے احاطے میں کچھ قبریں ہیں اور بے شمار نرگس کے پھول کھلے ہیں۔

"نکی باجی۔۔ آپ کی رنگت بالکل یمبرزل جیسی ہے۔ یمبرزل کے پھولوں جیسی ہے۔ اگر آپ کا نام یمبرزل ہوتا تو بہت اچھا لگتا۔ جسے یہ لفظ سمجھ میں نہ آتا وہ آپ کو نرگس بلا سکتا تھا۔۔ ہے نا۔۔؟"

یوسف ساکت بیٹھا سامنے دیکھتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔ نکی نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور بائیں جانب گردن موڑ کر اُسے حیرت اور اداسی سے دیکھا۔

"تمھیں موت کے سناٹے میں زندگی کی باتیں کیسے سوجھتی ہیں یوسف؟"

وہ بے بس سی ہو کر بولی۔

"کتنے قریب تو ہیں دونوں۔۔ زندگی اور موت۔۔ دیکھا نہیں آپ نے۔۔"

اُس نے آہستہ سے کہا۔ منڈیر کی اُس طرف سڑک پر کوئی آہٹ ہوئی تو یوسف نے سر ذرا سا اوپر اُچکا کر دیکھا۔۔ سڑک پر گرا آدمی اُٹھ گیا تھا اور لنگڑاتا ہوا دوسری طرف جا رہا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے دوسرا کندھا تھام رکھا تھا۔

''وہ دیکھیے۔۔وہ دیکھیے نکی باجی۔۔میں نے سچ کہا تھا نا۔۔''

یوسف بولا تو نکی نے جھانک کر دیکھا۔

''اللہ۔۔تیرا شکر۔۔تو پھر وہ۔۔یہ۔۔وہ گولی؟''

وہ اپنے گلے کے قریب ہاتھ رکھ کر بولی۔

''اس کے بازو میں لگی ہوگی۔۔شانے میں۔۔''

وہ بولا۔

دونوں منڈیر سے لگے بیٹھے رہے۔

''نکی باجی۔۔ایسا نہیں لگتا جیسے موت کا سکون سے کوئی گہرا رشتہ ہو۔جیسے موت ہی سکون کا دوسرا نام ہو۔۔زندگی، موت اور سکون۔۔سب کا مفہوم ایک ہوگیا ہو۔۔اس وقت ایسا نہیں لگ رہا۔''

اُس نے نکی کی طرف گردن موڑ کر کہا۔

''ہاں۔۔شاید۔۔''

نکی نے کچھ توقف سے کہا اور سامنے دیکھتی رہی۔

''نکی باجی۔۔''

اس نے کہیں دور سے پکارا حالانکہ وہ دونوں ساتھ لگے بیٹھے تھے۔

''ہوں۔۔''

وہ بغیر لب وا کیے بولی۔

''اگر اس وقت کوئی ہم پر بندوق تان دے تو۔۔؟''

''تو۔۔؟۔۔کیا؟''

اُس نے گردن موڑ کر یوسف کے چہرے کو دیکھا۔

''تو ہمیں جان بچانے کے لیے بھاگنا چاہیے کیا۔؟''

یوسف نے پر سکون لہجے میں کہا۔

کئی لمحے خاموشی میں گزر گئے۔

''۔۔نہیں۔۔''

کچھ دیر بعد نکی نے اُسی لہجے میں جواب دیا اور کچھ اور پل اُس کے چہرے کو دیکھتی رہی۔پھر ایک لمبی سانس بھر کر سر پیچھے ٹکا دیا۔دونوں کے ہونٹوں پر ایک ابدی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

جب آ گے پیچھے نتیجہ آیا تو نکی چوری چھپے شعر کہنے کے باوجود بہت اچھے نمبر لائی۔ یاور کے بھی اچھے نمبر تھے۔ یوسف بس پاس ہو گیا۔

''اچھی طرح تو حل کر لیتے تھے تم سارے سوالات۔۔ پھر حساب میں کم Marks کیوں آئے۔۔ اسی لیے ڈویژن اچھی نہیں آئی۔ اب تمھیں تمہاری پسند کے مضامین نہیں ملیں گے۔ اب پڑھنا۔۔ سمجھے۔''

نکی نے اُس کا کان دھیرے سے پکڑا اور چھوڑ دیا۔ مطالعے کا کمرہ دوبارہ آباد ہو گیا تھا۔

''Maths کے پرچے کے دوران آپ کی بہت یاد آئی نکی باجی۔۔ وہ آخری پرچہ تھا نا۔۔ آپ اُس سے پچھلی شام کو گھر جا چکی تھیں تو میں۔۔ میں۔۔''

اُس نے سر جھکا لیا۔ الٹے ہاتھ پر ٹپ سے ایک آنسو گرا۔

تین چار سال سے لگاتار چلتا آ رہا تناؤ اس سال بھی زوروں پر تھا۔ ہر خطۂ زمیں کی طرح اس وادی نے بھی اپنے حصے کے اُتار چڑھاؤ جھیلے تھے۔

چاہے ہزاروں برس راج کرنے والے ہندو راجاؤں کے دور میں یا طلوعِ اسلام کے بعد ایک ہی خاندان کے سلاطین کشمیر کی سینکڑوں برس کی حکومت میں، یا پھر سلطان زین العابدین کے بعد خانہ جنگیوں سے نجات دلانے والے چک بادشاہوں کے دور میں، ہر بدلتے منظرنامے نے تاریخ کے پنوں پر سرخ حاشیے کھینچے۔ مگر اس بار ایک عجیب سی بے چینی تھی جو کسی طرح قرار نہیں پا رہی تھی۔۔ اور زندگی پھر بھی رواں تھی۔

''اس بار سب محنت کریں گے۔۔ خود میرا بارہویں کا Exam ہے۔۔ اور وہ بھی سائنس۔۔ ماماں سنتی ہی نہیں میری بات۔۔ مجھے بھی محنت کرنا ہوگی بہت۔۔''

نکی نے ناک سکیڑ کر گردن ٹیڑھی کر کے کہا۔

''آپ ڈاکٹر بنیں گی۔۔ نکی باجی۔۔؟ یوسف دھیمی آواز میں بولا۔

''اور کیا۔۔ سب ہی پیچھے پڑے ہیں میرے۔۔ میں تو آرٹس پڑھنا چاہتی ہوں۔۔ چاہتی تھی۔۔''

''اور؟۔۔ میں...... کیا کروں گا نکی باجی۔۔؟''

اُس کی آواز میں افسردگی سی تھی۔

اُس نے بال پوائنٹ کا پچھلا حصہ دانتوں میں دبا رکھا تھا اور جھکے ہوئے سر اور اٹھی ہوئی نظروں سے نکی کے چہر۔ے کو دیکھ رہا تھا۔

''تم کچھ اچھے مارکس لاتے تو تمھارا ایڈمیشن کامرس میں تو ہو ہی جاتا۔۔اب بھی اگر تم محنت کرو اور اگلے سال بارہویں میں اچھے نمبرات لے آ ؤ تو کالج میں تم کامرس لے سکتے ہو۔ پھر MBA وغیرہ کر کے تمھارا کریئر۔۔''

''میں ویسے بھی ابو کا سارا کاروبار سنبھالنے والا ہوں۔۔''

وہ جیسے بے خیالی میں بولا۔

''مگر Qualified ہو کر سنبھالو گے تو پڑھے لکھے کہلاؤ گے۔۔ سب کی نظروں میں۔۔تم محنت کرنا نا۔۔''

نکی اُس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر قلم اُس کے منھ سے نکال کر اُس کے ہاتھ میں دے دیا۔

''ورنہ پھر۔۔ جانے نکی باجی کہاں ہوں۔۔اور آپ کہاں ہوں۔''

یاور نے پریشان سے لہجے میں دونوں کو باری باری دیکھ کر کہا...... دونوں اسے خاموش دیکھتے رہ گئے۔ وہ دوبارہ اپنی نوٹ بک پر جھک گیا تو ان دونوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ کچھ سیکنڈ یا کچھ منٹ یوں ہی گزر گئے۔ پھر نکی سر جھکا کر اپنی کتاب کو دیکھنے لگی۔

''میں محنت کروں گا۔۔نکی باجی۔۔''

یوسف نے خالی خالی سی آواز میں کہا۔

''یوسف بھائی بول تو ایسے رہے ہیں جیسے کہہ رہے ہوں میں محنت کیسے کروں نکی باجی۔۔ میرے پاس اچھے کاموں کے لیے وقت ہی کہاں ہے۔''

باہر شور مچاتی ہوئی ہوا چلنے لگی۔ برآمدے کی طرف کھلنے والے بھورے رنگ کے دروازے پر ٹیپسٹری کا سفید اور بھوری بیلوں والا پردہ پھول کر کُپا ہو گیا۔

''کیوں نہیں کریں گے۔۔محنت۔۔''

وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔

''اور کیا۔ جانے ہر وقت کیا سوچتے رہتے ہیں۔۔ جانتی ہیں نکی باجی۔۔ پچھلے سال Exam

کے دنوں میں بغیر پڑھے پاس ہوئے ہیں یہ۔۔آپ تو سونے چلی جاتی تھیں۔۔یہ میرے ساتھ یہیں پڑھتے تھے نا۔ پڑھتے کیا تھے بس۔۔یوں ہی۔۔ایک دن آدھی رات تک آپ کا Side Pose بنانے کی ناکام کوشش کرتے رہے۔۔نہیں بنا پائے تو کاغذ پھاڑ کر تھوڑا سا روئے۔ اُس کے بعد کتاب ہاتھ میں لی۔ اُسے غور سے دیکھنا شروع ہی کیا تھا کہ۔۔سو گئے۔۔ہاہا۔۔ہی ہی ہی۔۔''

اس دوران نکی چپ چاپ نوٹ بک کی ورق پلٹتی رہی۔اُس نے دفعتاً بالکنی کی طرف دیکھا۔

''آج برف گرے گی۔۔یاور۔۔یہ دونوں تکیے دروازے کے ساتھ لگادو۔۔اُف کتنی زوروں کی ہوا چل رہی ہے۔''

''پردہ پھولتا ہے تو الہ دین کا جن لگتا ہے۔ ہے نا۔۔یوسف بھائی۔''

اُس رات جھیلِ ڈل میں واقع دو جزیروں میں سے ایک جزیرے کے بیچ ایستادہ چار چناروں کے درمیان دیودار کی لکڑی کے خوبصورت ریستوراں میں کسی نے آگ لگادی تھی۔ سڑک کے اُس پار سرکاری مڈل سکول کی عمارت بھی جل رہی تھی۔

''کرفیو لگا رہا تو کہیں ہمارے Exams اب Postpone ہی نہ ہوجائیں۔''

یوسف نے کتاب کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''یوسف بھائی، آپ کی آواز سے کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ آپ کو تشویش ہو رہی ہے یا آپ اُمید کر رہے ہیں۔۔''

یاور نے بغیر سر اوپر کیے کہا۔ یوسف ہلکے سے مسکرا دیا تھا اور نکی کچھ اونچی آواز میں ہنسی تو اس کی یوسف کے زاویئے سے نظر آنے والے کان کی بالی جھل مل کرتی ہلنے لگی۔ پھر اُس نے سر جھکالیا۔

''ایسے تو وقت ضائع ہوگا۔۔''

نکی نے کہا اور کچھ فکرمند سی نظر آنے لگی۔

''کچھ دن اور پڑھ لیں گے نا۔۔''

یوسف نے آہستہ سے کہا۔

ہوا کے تیز جھونکوں نے شور مچا رکھا تھا۔اور اوپر ٹین کی چھت کے نیچے، پٹے ہوئے فرش پر مشرق کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے دو شیشے چھناک سے ٹوٹ کر گرے۔ نیچے کمرے میں تینوں طالب علموں نے

بیک وقت اوپر سیلنگ کی طرف دیکھا۔لکڑی کے یکساں جسامت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے جوڑ کر بنائے گئے بے شمار دائروں والی ہشت پہلو ختم بند سیلنگ پر بھورے رنگ کا وارنش ہلکا سا چمک رہا تھا۔

''چھت پر شیشہ ٹوٹا ہے کوئی۔۔''

یاور سیلنگ کی طرف دیکھتا رہا۔

''کسی نے کھڑکی کھلی رکھ چھوڑی ہوگی۔۔''

اس نے یوسف کی طرف دیکھا۔

''بتادوں کیا۔۔یوسف بھائی۔۔نکی باجی کو۔۔''

یاور نے کہا تو یوسف کے چہرے کا رنگ پل بھر کو بدلا۔اور پھر اُس نے واپس اپنے چہرے پر نارمل سے تاثرات لاتے ہوئے کھڑکی کے شیشے سے باہر نظر جمادیں۔جہاں سفیدے کے درختوں کی چوٹیاں نظر آرہی تھیں،جنہوں نے ہریالی جھٹک کر برف اوڑھ لی تھی۔

''درخت ایسے نہیں نظر آرہے،جیسے مردے کفن اوڑھ کر کھڑے ہل رہے ہوں۔''

یوسف نے قہقہہ لگایا۔

''نہیں ایسے لگ رہے ہیں جیسے قوال جھوم رہے ہوں۔''

یاور نے کہا۔

''بات کیوں ٹال رہے ہیں یوسف بھائی۔۔چھت کی پچھلی کھڑکی کے پاس ابھی بھی کرسی پڑی ہے۔۔جس پر بیٹھ کر جناب چاند کو دیکھ کر۔۔سگریٹ۔۔''

یاور نے نکی کی طرف دیکھا۔

''سگریٹ۔۔''

نکی کانپ سی گئی۔یوسف نے مجرموں کی طرح سر جھکالیا اور ہاتھ میں پین لیے کتاب کے چھپے ہوئے حصے کے اطراف سکیچ بناتا رہا۔کناروں کے قریب ابھی کافی جگہ بچی ہوئی تھی جہاں وہ مزید کچھ چیزیں بنا سکتا تھا۔

''پرابلم کیا ہے تمہاری۔۔یوسف۔۔؟''

نکی نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔اُس کے لہجے میں غصے سے زیادہ حیرت اور بیچارگی عیاں تھی۔

''اگر آپ مجھ سے چھوٹی ہوتیں نکی باجی تو کیا ڈانٹتیں مجھ کو۔۔؟یہ بھی تو ایک پرابلم ہے۔میں اگر آپ سے بڑا ہوتا تو میرا Future پہلے طے ہوجاتا۔۔اور۔۔اور۔۔''

یوسف کی بات ادھوری رہ گئی کہ نئے آئے ملازم نے ہتھیلی سے زور زور سے کواڑ کھٹکھٹایا۔

''بی بی جی کھانے کے لیے بُلا تا۔۔''

وہ بڑی بشاشت سے ٹوٹی پھوٹی اردو بولا۔

''تو کیا ہوتا مستقبل کا پتہ چل جانے سے۔۔''

نکی نے گردن خم کی۔

''اصل میں نکی باجی، ان کو لگ رہا ہے کہ آپ آگے آگے بھاگ رہی ہیں اور یہ پیچھے بھاگتے ہوئے رگر گر کر اُٹھ رہے ہیں۔۔آپ Distinction لا رہی ہیں اور یہ بمشکل پاس ہو پاتے ہیں۔۔ خدانخواستہ کہیں فیل ہو گئے۔۔تو۔۔پھر۔۔''

''تو پھر۔۔اور چھوٹا ہو جاؤں گا آپ سے۔۔میں۔۔میں۔۔میرا دل۔۔ہی نہیں لگتا۔۔ پڑھنے میں۔۔''

''اب زیادہ فلسفہ مت جھاڑو۔۔پچھلے سال 10th تک تو اوّل آتے تھے۔۔اصل میں مجھے ہی پڑھانا نہیں آتا۔۔میں اب تم لوگوں کو۔۔آج کے بعد۔۔''

یاور نے جھٹ سے کتاب بند کی۔

''نہیں نہیں نکی باجی۔۔یوسف بھائی کی غلطی کی سزا مجھے کیوں۔۔میں تو نہایت شریف آدمی ہوں۔۔محنتی بچہ ہوں۔۔اچھا بچہ۔۔''

''بالکل، بالکل اُس میں کوئی شک کی گنجائش ہی نہیں۔''

یوسف نے ہاتھ بڑھا کہ اس کا پہلو گدگدایا تو انگڑائی کے لیے اٹھی ہوئی چھوٹی چھوٹی باہیں گرا کر وہ زور سے ہنسا۔

امتحان ختم ہوئے تو نکی نے بے شمار صفحے سیاہ کر دیئے۔

کالی کالی یہ تقدیر
نیلی نیلی وہ آنکھیں

یا

خواب میرے ہیں کتنے ہر جائی
تیری آنکھوں میں جا کے رہنے لگے

وغیرہ قسم کے۔ اور نہ جانے اور کیا کیا۔

اُس دن سورج کی کرنیں چمکیلے آسمان سے ہوتی ہوئی باغیچے میں گر رہی تھیں۔ ٹین کی، ڈھلوان ساخت کی چھت سے برف پگھل پگھل کر بوندیں بن ٹپکتی رہی۔ ہوا کچھ تیز چلنے لگتی تو یہ بوندیں زمین پر گرنے سے پہلے جم جم جاتیں اور فقط کوئی مہین سا قطرہ گرتا، باقی پانی کی مخروطی نلیوں کی صورت رہ جاتیں۔

اونچی دیوار کے باہر سرکاری مکانوں کی قطاروں کے درمیان بنے چھوٹے سے راستے پر بچے سائیکل چلا رہے تھے۔ آج کرفیو نہیں تھا۔ نکی دھوپ میں بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی۔ اُس کی ماں تبسم بیگم بھی آئی ہوئی تھیں اور تنویر خالہ کے ساتھ بیٹھی ساگ چن رہی تھیں۔ گیٹ پر گاڑی رکنے کی آواز آئی۔

''ڈرائیور آ گیا۔۔ بازار ہو آئیں ذرا۔۔ ابھی تین گھنٹے کرفیو نہیں لگے گا۔''

تنویر بیگم گیٹ کی طرف پلٹ کر بولیں۔ جہاں ڈرائیور نہیں یوسف ہاتھ میں چابی لیے اندر داخل ہوا۔

''ارے۔۔ میرے بچے۔۔ اٹھارہ کا تو ہو جا پہلے۔۔''

تنویر بیگم کے چہرے پر پریشانی تھی۔

''اتنی اچھی تو چلاتا ہوں چچی۔۔ پھر میں نے تو کالونی کے اندر ہی ڈرائیو کیا نا۔۔''

وہ مؤدبانہ بولا۔

''اللہ اپنی حفاظت میں رکھے۔۔ تمھیں۔۔''

وہ دوبارہ ساگ چننے لگیں۔

''پھر میں اٹھارہ سے کم لگتا ہوں کیا۔۔''

اُس نے نکی کے قریب جا کر اخبار اٹھاتے ہوئے تنویر بیگم کے پاس بیٹھ کر کہا۔

''نہیں۔۔ ماشاء اللہ وہ بات نہیں بیٹا۔۔ مگر پھر بھی تمھیں۔۔''

تنویر بیگم نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''جو بات غلط ہے۔۔ وہ غلط ہے۔ ٹھیک کہتی ہیں تنویر۔۔''

نکی کی ماں نے ساگ کے بڑے سے ہرے ہرے پتے پر سے ہرے رنگ کا چھوٹا سا رینگنے والا کیڑا اُٹھا کر باغیچے کی سوکھی گھاس والی بھیگی زمین پر پھینکا۔ دیوار پر سے ایک مینا نیچے اُڑ آئی اور کیڑے کو چُگ کر پھر اوپر کی طرف اُڑ گئی۔

''اُوئی۔۔ ماماں۔۔''

نکی نے جھرجھری سی لے کر ماں کا چہرہ دیکھا۔

''مطلب۔۔؟''

تبسم بیگم کی تیوری چڑھ گئی۔

''ڈرتی ہو۔۔؟۔۔کیڑوں سے۔۔؟''

تبسم بیگم نے حیرت، حقارت اور تشویش کو نہایت کمال سے اپنے لہجے میں شامل کر لیا تھا۔ ان کے نتھنے پھول گئے تھے۔

''تم Frog کو Disect کرتی ہو Lab میں۔۔؟''

انھوں نے آنکھیں پھیلا کر منہ ادھ کھلا چھوڑ دیا۔

''کل کو Human Body کو کیسے Disect کروگی تم۔۔بولو۔۔؟''

اُنہوں نے سر پکڑ لیا۔

''میری اُمیدوں پر پانی پھیر دو گی۔۔میرا ادھورا خواب پورا نہیں کرے گی یہ لڑکی۔۔یہ ڈرپوک لڑکی۔۔مجھے پہلے ہی خدشہ تھا اس کی طرف سے۔۔''

انھوں نے تنویر بیگم کی طرف دیکھ کر آواز میں دُکھ بھر کر کہا اور جلدی جلدی پلکیں جھپکنا شروع کیں، گویا آنسو پی رہی ہوں۔ پھر سر کو مزید جھکا کر ساگ بیننے لگیں۔ سب اُنہیں خاموش دیکھتے رہے۔

''نہیں۔۔ماماں۔۔جو آپ کہیں گی۔۔میں وہی کروں گی۔''

نکی روہانسی ہو کر بولی۔ یوسف نے اخبار کا صفحہ پلٹا۔

اگلے برس جس دن برفانی طوفان نے بہت سے درختوں اور کئی مکانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اُس دن تک اور بہت سی تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔

امتحانوں کے نتائج آچکے تھے۔ یاور اچھے نمبروں سے پاس ہو کر نئی جماعت میں آدھا برس گزار چکا تھا۔ یوسف فیل ہو گیا تھا اور اُس کے گھر والے اُس سے نالاں تھے۔ نکی ماماں کی نگرانی میں Enterence کی تیاریوں میں مصروف تھی۔

پڑھنے کے کمرے میں یوسف اور یاور رہ گئے تھے۔

''نکی باجی کو یہاں بیٹھ کر کتنا اچھا لگتا ہوگا۔''

یاور نکی کی جگہ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

''تم اپنی جگہ بیٹھو نا۔۔ بڑوں کی جگہ نہیں بیٹھتے۔۔ اگر اس وقت نکی باجی آ گئیں تو کیا سوچیں گی کہ میری جگہ بیٹھ گیا ہے یاور۔۔ شاید نہیں چاہتا کہ میں کبھی آ کر پھر اس جگہ بیٹھوں۔''

یوسف نے اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھتے ہوئے آہستہ سے کہا تو یاور اُچھل کر اپنی نشست پر پہنچ گیا جیسے اُس کی نکی باجی آ ہی گئی ہوں۔

''ارے باپ رے۔۔ Sorry یوسف بھائی۔۔''

یوسف لمبے سے رجسٹر پر جھک گیا۔

نکی کے بائیں کان کی بالی جھل مل کرنے لگی۔

بالوں کی لٹ نے آدھا رخسار چھپا لیا۔

نکی دانتوں میں قلم دبائے، پھولوں والے ہیئر بینڈ میں بال سمیٹ رہی ہے۔

رجسٹر کے تین صفحوں پر حساب کا ایک ہی سوال حل کیا گیا ہے۔ ایک سیاہ روشنائی سے۔۔ نکی کے ہاتھوں۔ دوسرے دو صفحوں پر یہ ہی سوال یوسف نے حل کرنے کی کوشش کی ہے جس پر نکی نے سرخ قلم سے تصحیح کی ہے۔ صفحے کے کنارے پہ دو آنکھیں بنی ہیں۔ ابھی ابھی یوسف نے پنسل سے بنائی ہیں۔ کالی کالی پتلیوں والی دو آنکھیں۔

نیلی آنکھوں میں پانی تیر رہا ہے۔۔ اگر پلک جھپک دی گئی تو۔۔ آنسو چہرے پر اُگی چھوٹی چھوٹی داڑھی میں سے ہوتا ہوا گردن پر بہہ نکلے گا۔۔ اور کہیں یاور دیکھ لے تو۔۔ اُس کا دل اُداس ہو جائے گا۔

لیکن یاور نے یوسف بھائی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ لیے تھے۔

مختصر سی غلام گردش میں یاور کی باتوں کی آواز گونجی تو زینے پر نکی کے تیز تیز اٹھتے ہوئے قدموں کی آواز اور کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دی۔ وہ باورچی خانے سے نکل کر آتی ہوئی ماں سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔

''Sorry Maama''

''ابھی چوٹ لگ جاتی تو؟ کل آخری پرچے کے دن تم۔۔''

''تو Rest کر لیتی ماماں۔۔ میری ساری Preparaton تو ہو چکی ہے آج تو میں کئی گھنٹے کی نیند بھی Afford کر سکتی ہوں۔۔ یہ جناب کدھر سے راستہ بھول گئے۔۔''

وہ مسکراتی ہوئی بولتی چلی گئی۔

''اللہ نے میری سن لی۔۔خالہ۔۔''

یاور نے تبسم بیگم کا ہاتھ پکڑ لیا۔وہ نکی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ابروؤں کے درمیان ایک لکیر کھنچی تھی۔تبسم بیگم اس کی طرف پلٹیں تو وہ نکی باجی کو دیکھنے لگا۔

''اسلام وعلیکم نکی باجی۔۔آنکھوں کے گرد کے گڈھے بتا رہے ہیں کہ خوب پڑھائیاں ہو رہی ہیں۔۔بلکہ ہو چکی ہیں۔۔کچھ اپنا یہ چھوٹا سا بھائی بھی یاد ہے۔۔کل میرا Maths کا Exam ہے۔۔''

وہ فکر مند نظر آنے لگا۔

''صرف ایک گھنٹہ چاہیئے آپ کا نکی باجی۔۔آپ اپنی books لے چلیے۔۔وہیں Revise کر لیجیئے گا۔۔''

وہ تبسم بیگم کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

''خالہ آج نکی باجی کو بھیج دیں میرے ساتھ۔۔قسم سے بالکل کچھ نہیں آتا مجھے۔۔فیل ہو جاؤں گا خالہ۔۔رہی سہی عزت خاک میں مل جائے گی۔''

''چپ۔۔شریر کہیں کا۔۔تو تو ماشاءاللہ خود قابل لڑکا ہے۔اس کا تو بیٹا Last۔۔''

''خالہ آپ یقین کریں یہ آٹھویں درجے کا Maths اس قدر مشکل ہے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔اور پھر نکی باجی بے چاری جیسے قیدِ بامشقت کاٹ رہی ہیں۔ان کی بھی کچھ Outing ہو جائے گی۔۔امّی نے تاکید کی تھی خالہ۔۔کہ نکی باجی کو کچھ روز کے لیے ساتھ لے آؤں۔۔امی نے انھیں خواب میں دیکھا تھا۔۔یاد کر کے تڑپ رہیں تھیں۔۔آپ کو میرے سر کی قسم خالہ۔۔''

یاور نے تبسم بیگم کا ہاتھ جھٹ اپنے سر پر رکھ لیا۔

تنویر بیگم نے نکی کو گلے سے لگایا تو وہ ان کی باہوں میں جیسے غائب سی ہو گئی۔

''میری بچی۔۔میری جان۔۔یہ کیا مصیبت ہے یہ Enterence۔اُف ننھی سی جان۔۔''

نکی اُن کے سینے سے لگی رہی۔تنویر خالہ کے پیچھے کوئی چھ قدم کے فاصلے پر ادھ کھلے دروازے کی دہلیز میں کھڑے یوسف کے چہرے پر مبہم سی مسکراہٹ تھی۔خالہ کے کندھے کے اوپر سے ہو کر نکی کی نگاہیں جب اس سے ملیں تو وہ کمرے کے اندر چلا گیا۔پھر دبیز سرخ قالین پر دو قلابازیاں کھائیں اور نکی

کی نشست کے تکیے کا غلاف درست کرنے لگا۔

اُس رات ساتویں کے چاند کی پھیکی چاندنی میں ٹین کی چھت والا مکان ہلکی ہلکی چمک بکھیرتا پُرسکون سو رہا تھا۔

صرف پڑھنے کا کمرہ روشن تھا۔

یاور پڑھتے پڑھتے حساب کی کاپی پر رخسار رکھ کر سو گیا۔

''صرف دس منٹ تک آرام کر سکتے ہو۔۔تم؟ نکی نے اُس کا سر سہلاتے ہوئے کہا۔اُس نے دھیرے سے آنکھیں نیم وا کیں اور پھر موند لیں۔

''پھر دو آخری سوال۔۔اور چھٹی۔۔تمہاری تیاری مکمل ہے۔۔''

وہ بولی۔یاور نیند کے جھونکوں کے درمیان ایک پل کو ہلکے سے مسکرایا اور دوسرے پل کمرے میں اُس کے چھوٹے چھوٹے خراٹے گونجنے لگے۔

وہ دونوں اسے چپ چاپ دیکھتے رہے ان کے چہروں پر بھی ایک پرسکون سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

''اب۔۔کیا کرو گے۔۔یوسف۔۔''

نکی کا چہرہ اُداس ہو گیا۔

''اب کیا ہوگا۔۔نکی باجی۔۔اب کیا ہو سکتا ہے۔۔آپ۔۔آپ۔۔''

دور کہیں مشین گن نے لگاتار کئی گولیاں برسائیں۔

باغیچے میں ایستادہ سفیدے کے درختوں میں کوّے یہاں وہاں اُڑ کر کائیں کرنے لگے۔کچھ دیر بعد ماحول پر دوبارہ سکوت چھا گیا۔

''میں اور پیچھے رہ گیا نکی باجی۔۔ہم ساتھ نہیں چل سکیں گے نا۔۔اب۔۔اور کوئی راستہ نہیں نا۔۔اب اور کچھ نہیں ہو سکتا نا۔۔ہے نا۔۔نکی باجی۔۔''

یوسف کی آواز کا کرب واضح ہو گیا تھا۔نکی نے سر بہت زیادہ جھکا لیا تھا۔وہ سوئے ہوئے یاور کے بالوں میں انگلیاں پروتی رہی۔آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ بہہ کر اُس کے حلق کے قریب دوپٹے میں جذب ہوتے گئے۔

''آپ کچھ نہ بولیں گی نکی باجی۔۔میں جانتا ہوں۔۔''

اُس کی تھکی ہوئی آواز میں شکوہ ہی شکوہ تھا۔

''مگر میں بھی۔۔نہیں رہوں گا۔۔نکی باجی۔۔''

اُس کی آواز یکا یک تیز ہوگئی۔

''۔۔چلا جاؤں گا۔۔میں۔۔''

آواز پھر مدھم ہوگئی تھی۔نکی نے سر اُٹھا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔پریشان پریشان سے چہرے پر ویران ویران سی آنکھیں۔چھوٹی چھوٹی مونچھیں۔داڑھی کچھ گھنی ہوگئی تھی۔اتنی کہ سرخ وسفید چہرے پر ایک سیاہ حاشیہ بنا کر اسے مزید خوش شکل بنا رہی تھی۔

آنسو بہہ نکلے تھے۔

''چلا جاؤں گا۔۔دور۔۔آپ سے۔۔اتنا دور کہ۔۔کہ۔۔''

اُس نے دبی دبی سی ہچکی لی۔نکی نے بے اختیار اپنے گلے پر ہاتھ رکھ دیا۔جیسے اُس کا دم گھٹنے لگا ہو۔

''نہیں۔''

وہ آواز کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔

''نکی باجی میں۔۔ملٹنٹ بن جاؤں گا۔۔دنیا چھوڑ دوں گا۔''

''نہیں۔۔پاگل ہوگئے ہو کیا۔۔یہ سب کیا کہہ رہے ہو۔''

نکی تڑپ کر بولی اور اُس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔

''تم تنویر خالہ سے۔۔اگر بات کرو۔۔تو۔۔وہ ہم دونوں کو کتنا عزیز رکھتی ہیں۔''

نکی نے دوپٹے سے آنکھیں خشک کیں۔اور ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

''ماماں کو سمجھا سکتی ہیں۔۔ہیں نا؟''

''۔۔ہاں۔۔شاید۔۔شاید۔۔''

بجھی بجھی آنکھوں میں امید کی قندیل سی روشن ہوئی۔

جس دن نکی کی ماں نکی کی کامیابی کی خوشیاں منا رہی تھی۔اُس دن نکی پتھر کی طرح خاموش ہوگئی تھی۔

اسی دن یوسف نے تنویر خالہ سے بات کی تھی۔اور تنویر خالہ کچھ لمحوں تک کچھ بھی نہ بولی تھیں۔

یوسف کے چہرے کو دیکھتی رہ گئی تھیں کہ کہیں وہ مذاق تو نہیں کر رہا۔ مگر اُس کے چہرے پر ایسی سنجیدگی تھی کہ تنویر بیگم خود کو بے بس سا محسوس کرنے لگیں۔ لیکن پھر اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر مسکرائیں۔

''وہ تو تمہاری بڑی بہن ہے بیٹا۔۔ مذاق کرتے ہوا پنی چچی سے۔؟ وہ بھی ایک بے جوڑ سی بات کے لیے۔ اُس کی ماں۔ میری زبان سے کہیں ایسا سن لے۔ تو مجھے زندگی بھر معاف نہ کرے۔ جانتے ہو تم ان کا مزاج۔۔''

انھوں نے چولہے پر چڑھی نمک والی چائے سے بھرے تانبے کے گول پیندے والے پتیلے میں ذرا سا جھانکا۔ اور چائے کا رنگ جانچنے کے لیے تانبے کے لمبے دستے والا کفگیر، پتیلے میں گھمانے کے بعد اس میں چائے بھر بھر کر واپس ڈالتی رہیں۔ جالی والے دستے کے اندر پڑی کنکریاں، اوپر نیچے ہونے سے چھن چھن بجنے لگیں۔ کفگیر پتیلی کے کناروں پر ٹکا کر تبسم بیگم ریفریجریٹر کی طرف دودھ لینے کو بڑھیں۔ اس دوران انھوں نے یوسف کی طرف نظر نہیں اٹھائی۔

''جانتی ہوں میرا بیٹا مجھے ایسے امتحان میں کبھی نہیں ڈالے گا۔''

انھوں نے دودھ کے ساتھ چائے کی پیالیوں میں ڈالنے کے لیے بالائی کی کٹوری نکالی اور یوسف کی طرف نگاہ ڈالی۔ وہ دیوار سے لگا انھیں ہی دیکھ رہا تھا۔

''بیٹھو میں چائے لا رہی ہوں۔۔''

انھوں نے مسکرا کر کہا۔ اور ملازم کو دستر خوان بچھانے کے لیے آواز لگائی جو گھر کے پچھواڑے باڑی میں پتہ گوبھی کے لمبے پتے توڑ توڑ کر رات کے کھانے میں بننے والے کسی سالن کے لیے بید کی ٹوکری میں جمع کر رہا تھا۔

تنویر بیگم جب ملازم کو آواز لگا کر کھڑکی سے پلٹیں تو دیکھا کہ یوسف جا چکا ہے۔

کہتے ہیں وہ رات قیامت کی رات تھی۔ اندرونِ شہر، ہر گھر میں چھاپے پڑے تھے۔ خطاوار دھماکے کر کے غائب ہو گئے تھے اور بے گناہوں کو غالباً غلط مخبری کی وجہ سے دھڑ ادھڑ پکڑ کر کسی نامعلوم منزل کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔

ہوسٹل سے چھٹیوں میں گھر لوٹے دو بھائیوں کو ان کے والدین کے سامنے دہشت گردی کے الزام میں گولیاں مار دی گئی تھیں۔ غصے یا غلط فہمی یا کسی اور انجانی وجہ سے۔

رہ رہ کر انسانی چیخیں کانوں میں پڑتیں تھیں۔ اُس رات شہر میں شاید ہی کوئی سویا تھا کہ موت

کے آنے کے ڈر کے ساتھ ساتھ عزت کے جانے کا خوف بھی تھا۔

تنویر بیگم کے وہاں سے نکل کر یوسف اسی سڑک پر چل رہا تھا جہاں چوراہے کا ایک راستہ جھیل کی طرف جاتا تھا۔ ایک پہاڑی کی طرف۔ ایک شہر کے اندر والے علاقے کی طرف اور ایک نکی کے گھر کی طرف۔

اس سڑک سے گذرتے ہوئے اُس کی رفتار غیر ارادی طور پر دھیمی ہوگئی۔

بے اختیار نگاہیں داہنی جانب ڈھلان کی طرف اُٹھ گئیں۔ بغیر گونجے ایک آواز سماعت تک آ گئی۔

تمھیں موت کے سناٹے میں زندگی کی باتیں کیسے سوجھتی ہیں یوسف۔

آج سے زندگی کی بات نہیں کروں گا نکی باجی۔۔

کاش اُس دن کوئی بندوق تان دیتا۔۔ ہم پر۔۔ کتنی پرسکون۔۔ کتنی حیات بخش موت ہوتی۔۔ میں یوں۔۔ زندگی سے بھاگ۔۔ نہ رہا ہوتا۔ مگر اب مجھے بھاگنا چاہیئے یہاں سے۔۔ مجھے۔۔ بھاگنا۔۔ چاہیئے۔۔ نکی باجی۔۔ میں دور جا رہا ہوں آپ سے۔۔ بہت دور نکی باجی۔۔ بہت دور۔۔

اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔۔ ڈھلان کے اس طرف کنارے پر اُگی گھاس سوکھ کر بے رنگ ہوگئی تھی۔

وہ بھاری بھاری قدم اٹھاتا ہوا طویل سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ راستے میں کہیں کہیں دوکانیں تھیں جو بند ہو رہی تھی۔

ابھی تو اندھیرا ابھی نہیں ہوا۔ تو پھر۔۔ دُکانیں کیوں بند۔۔

ہوا کریں۔ اُسے کسی سے کوئی مطلب نہیں۔ اس نے کچھ اور قدم آگے بڑھائے ہی تھے کہ سائرن کی تیز آواز کانوں سے ٹکرائی۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا بس یوں ہی بے خیالی میں شاید۔ سڑک ویران تھی اور تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ سائرن کے بعد لاؤڈ سپیکر پر کوئی اعلان ہوا۔ آواز دور سے آ رہی تھی۔ وہ چلتا رہا۔ یہاں تک کہ سڑک ایک موڑ پر مڑ گئی۔ کچھ فاصلے سے بکتر بند گاڑیاں آتی دکھائی دیں۔

وہ ویسے ہی چلا جا رہا تھا۔

میں۔۔ جا رہا۔۔ ہوں۔۔ نکی باجی۔۔ میں۔

دفعتاً موڑ پر بائیں جانب کو بستی کے اندر جاتی ہوئی کچی سڑک پر کسی نے اس کا بازو پکڑ کر اسے اندر گلی میں کھینچ لیا۔

''کہاں جا رہے ہو۔۔ کرفیو میں۔۔ پاگل ہو گیا۔۔؟''

ایک داڑھی والا نوجوان تھا۔ اُس کے ساتھ تقریباً یوسف کی عمر کا ایک لڑکا تھا جس نے دونوں ہاتھوں میں گیندیں سی تھام رکھی تھیں۔ داڑھی والے نوجوان کے پاس ایک تھیلا تھا۔ جس میں کچھ سامان تھا۔ اُس نے وہ تھیلا اُسی زینے پر رکھا تھا جہاں اُس نے یوسف کو کھینچ کر بٹھا دیا تھا۔ زینہ کسی مکان کے پچھواڑے سے ملحقہ تھا جو ایک تنگ گلی میں کھلتا تھا۔ اس سے پہلے کہ یوسف کچھ کہنے کے لیے زبان کھولتا، اس نے دیکھا کہ موڑ کے قریب پہنچنے سے بہت پہلے، اس کا ہم عمر لڑکا گاڑیوں کی طرف دوڑا اور دو گاڑیوں کو اپنی گیندوں کا نشانہ بنا کر ایک اور گلی کی طرف بھاگا۔۔ داڑھی والے نوجوان نے کانوں پر ہاتھ دھر لیے۔ فلک شگاف دھماکہ ہوا۔

''انا للہ وانا الیہ راجعون۔''

نوجوان زیرِ لب بولا۔

''کک۔۔ کک۔۔ کیا ہوا؟''

یوسف بری طرح گھبرا گیا تھا۔

''شاہباز شہید ہو گیا۔۔ وطن پر۔۔ قربان ہوا۔۔ دین پر قربان ہوا۔۔''

نوجوان نے بارعب سی آواز میں کہا۔ اور آسماں کی طرف اُڑ رہے سیاہ دبیز دھوئیں کو دیکھنے لگا۔

''آقا۔''

شاہباز اسی لمحہ گلی میں نمودار ہوا تھا۔

''تم۔۔ تم۔۔ شہید نہیں ہوئے۔۔؟''

وہ تعجب اور تاسف سے بولا۔

''نہیں۔۔ آقا۔۔''

شاہباز نے سر جھکا دیا۔

''کیوں بدنصیب۔۔''

اس نے داہنا ہاتھ ہوا میں اوپر سے نیچے کو لہرایا۔

''باقی کی Convoy بہت دور تھی۔۔ میں کس پر کودتا۔۔''

وہ آہستہ سے بولا۔

''آہ بدبخت۔۔ کیا اسی دن کے لیے ہم نے تمھیں شاہ باز کا خطاب دیا تھا۔ جب تک

گاڑیاں سامنے آتیں خود دوڑ کر قریب چلے جاتے۔۔اسی لیے ہم نے کہا تھا کہ فدا ہونے کے لیے دستی بم ایسے با اثر نہ ہوں گے۔دوسرے ہوتے تو ہم خود ریموٹ سے کنٹرول کرتے۔۔اور اب تک تم جنت میں ہوتے اور ان کا کام تمام ہو گیا ہوتا۔تمہارے بعد جب تمہارے والدین انتقال کرتے تو وہ بھی جنت میں جاتے۔کم سے کم اتنا تو سوچتے۔وہیں ڈٹ جاتے گاڑیاں تو آ ہی جاتیں۔دیکھو اس کے بعد قافلہ نے رخ موڑ دیا۔''

نوجوان نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''اگر کوئی شہید ہوتا ہے تو کیا اس کے والدین جنت میں جاتے ہیں؟''

یوسف نے نوجوان کو خاموش ہوتے دیکھ کر فوراً سوال کیا۔

''ہاں۔۔بالکل۔۔ایسا ہی ہوتا ہے۔۔''

نوجوان نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

''مگر میں نے تو ایسا کہیں نہیں پڑھا۔حافظ کی ماں جنت میں جاتی ہے۔وہ بھی اگر اُس نے خود اپنی اولاد کو حفظِ کلام اللہ کرایا ہو۔۔ورنہ میں نے کسی حدیث میں یہ نہیں پڑھا کہ۔۔''

یوسف نے تجسّس سے کہا۔

''نادان ہو تم۔۔جہاد کے راستے میں۔۔''

وہ ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر کچھ کہتے کہتے رُکا۔

''یہاں کریک ڈاؤن ہو سکتا ہے۔نکلنا ہو گا جلدی۔۔''

اُس کی آواز دفعتاً تشویش سے بھر گئی۔شاہباز پھرن کے اندر پہنی ہوئی واسکٹ کی جیبوں میں بھرے بم نکال نکال کر زینے پر رکھے تھیلے میں ڈال رہا تھا۔

''رہنے دو۔۔بعد میں نکال لینا۔۔پھنس جائیں گے ورنہ۔۔''

نوجوان جلدی سے اٹھتے ہوئے بولا۔

''راستے میں۔۔کہیں پھٹ گیا آقا۔۔تو؟''

''تم اتنے خوش نصیب کہاں ہو۔۔''

نوجوان نے اُسے نظر بھر کر دیکھا۔

''آقا میرا۔۔میرا مطلب تھا اگر غلط جگہ کہیں پھٹ گیا۔۔تو۔۔تو۔۔خدانخواستہ آپ کو۔۔کہیں آپ۔''

وہ ہکلایا۔

''اگر آپ اجازت دیں تو۔۔تھیلا میں سنبھال لوں۔''

یوسف نے مضبوط لہجے میں کہا۔

نوجوان مسکرادیا۔

''مبارک۔صد مبارک۔''

اُس نے یوسف کو بغور دیکھا اور گلی کے اندر مڑ گیا۔

کہتے ہیں وہ رات قیامت کی رات تھی۔

وادی کے حالات ابتر ہوتے گئے۔کس نے اس سکون پر شب خوں مارا۔کوئی اپنے گھر میں تو ایسا نہیں کرتا۔کوئی باہر کا ہوگا۔مگر باہر کے بھی سب لوگ تو ایسی سوچ نہیں رکھ سکتے۔کچھ منفی سوچ والے افراد نادانی، غرور اور غلط فہمی کا شکار ہوگئے ہوں گے کہ صدیوں سے ایسا ہوتا آیا ہے اور کبھی بھی، کہیں بھی ہوسکتا ہے۔

اس خطے کے ساتھ سولہویں صدی سے ہی یہ سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔چندر گپت موریہ اور پھر اشوک کے مہان ہندوستان کو افغانستان اور نیپال کی آخری سرحدوں تک وسیع کرنے والی عظیم الشان سلطنتِ مغلیہ کے شہنشاہوں نے بھی ایسا ہی کیا، جب شاعرہ معروف و مقبول اور ہر دل عزیز ملکہ کشمیر زُون، یعنی چودھویں کا چاند ملقب حبّہ خاتون کے شوہر بادشاہ یوسف شاہِ چک کو اکبر اعظم نے دھوکے سے قید کرلیا تھا۔شاہ غریب الوطنی میں اپنی ملکہ سے دور انتقال کرگیا۔وطن کی مٹی بھی اسے نصیب نہ ہوئی۔۔اور ملکہ روتے روتے دیوانی ہوگئی۔ہجر کے نغموں سے بیاضیں سیاہ کردیں۔اور آخر کار اپنے یوسف کو پکارتے پکارتے حبّہ خاتون نے بھی اس دنیا کو خیر باد کہہ دیا۔وادی میں اُس کے نغمے گونجتے رہے۔

''ژولہ ہمورو شے روشے وَلو میاِنہ پوشے مدنو''

(روٹھ کر مجھ سے تو چلدیا پھول سے میرے محبوب آ)

پھر افغانستان سے افغان آئے۔

شامتِ اعمال سے افغان حاکم ہوگئے

آئے وہ اور طالع بیدار اپنے سو گئے

کسی شاعر نے احتجاجاً شعر کہا تھا۔پھر پنجاب سے سکھ، کیا کیا ٹیکس لگائے گئے تھے۔اُن کے

دور میں۔ اور پھر سات سمندر پار سے انگریزوں نے آ کر وادی جموں کے ڈوگروں کو فروخت کر دی۔ ایک 'native' کو دوسرے 'native' کا آقا بنا دیا۔ وہ بھی ایک تکلیف دہ دور تھا۔ کشمیریوں کو تو مطلق العنان مہاراجہ سے آزادی چاہیئے تھی۔۔ سب نے جی بھر کے ظلم ڈھائے۔۔

نکی نے کتابوں میں یہ سب پڑھا تھا۔

کشمیری۔۔ محکوم ہی رہے۔۔ صدیوں۔۔

اب کہیں آدھی صدی بھر پہلے جمہوریت آئی۔۔ تو۔۔ کچھ سکون کے بعد پھر یہ بے سکون شب و روز۔ کیوں ہو رہا ہے یہ سب۔ کیوں۔۔

جانے کیوں آج اُسے بالکل ہی نیند نہیں آ رہی تھی۔ جانے کیا کیا سوچ رہی تھی وہ آج۔ کبھی کبھی اچانک گھبرا اٹھتی تھی۔ نہیں اچانک نہیں۔ جب کہیں سے کسی دھماکے کی آواز آتی۔ اور آواز تھی کہ بار بار آ جاتی۔

ادھر رات تھی کہ طویل ہوئی جاتی تھی۔ اگر صبح ہو جاتی تو وہ تنویر خالہ کے وہاں فون کر کے خیریت معلوم کرتی ان کی۔۔ سب کی۔۔ سب کی خیریت۔ اسے رہ رہ کر جانے کیسی محرومی کا احساس ہو رہا تھا۔ ایک عجیب سے خالی پن کا۔ ایک جان لیوا سی فکر کا۔ کون سی فکر تھی یہ۔ اُسے ٹھیک سے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ یاور سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔ یا شاید۔۔ اگر یوسف سے کوئی بات۔۔ کوئی بات ہو پاتی۔۔ اگر۔۔ یاور سے بھی کوئی رابطہ نہ ہوا تھا کل سے۔۔ شاید یوسف نے تنویر خالہ سے کوئی بات کی ہو۔ کوئی پرامید بات ہوتی تو اب تک۔۔

صبح تنویر بیگم کو معلوم ہوا کہ یوسف کل رات اپنے گھر نہیں گیا تو اُن کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اُنہوں نے دو ایک جگہ اور فون کرنے کے بعد نکی کے یہاں فون کیا تھا کہ شاید کسی کو معلوم ہو۔۔ تو نکی کا سر زور سے چکرایا تھا۔۔

چلا جاؤں گا نکی باجی۔۔ دور چلا جاؤں گا۔۔ اتنا دور ہو جاؤں گا کہ۔۔ آپ۔۔ یوسف نے دبی دبی ہچکی لی تھی۔

نکی بے ہوش ہو چکی تھی۔

کئی روز ہو گئے تھے۔ یوسف کی کوئی خبر نہ تھی۔ اُس کے والد کو دل کا دورہ پڑ چکا تھا۔ اُس کی فربہ اندام ماں کا وزن آدھا ہو گیا تھا۔ اور اس کی تنویر چچی اپنی بھابی سے نظر نہ ملاتی تھی۔ اور یوسف کی

سلامتی کی دعائیں مانگا کرتی۔

نکی پتھر کی مورت سی میڈیکل کالج جایا کرتی۔

جب دن مہینوں میں بدلے اور تین مہینے ہو گئے تب ایک دن یاور کو اپنے سکول کے باہر یوسف کھڑا نظر آیا۔ وہ دوڑ کر اُس سے لپٹ گیا۔

''کہاں چلے گئے تھے یوسف بھائی۔۔''

وہ رو پڑا۔ یوسف کی آنکھیں بھر آئیں۔

''کیوں چلے گئے تھے یوسف بھائی۔۔ اب تو نہیں جائیں گے نا۔ سب کو دُکھی کر دیا آپ نے۔۔ ہم سب مر جائیں گے آپ کے بغیر۔ مت جایئے گا اب کبھی بھی۔''

وہ یوسف کی درمیانی پسلی تک آتا تھا۔ اس کے سینے کے ساتھ سر ٹکائے کمر میں باہیں ڈالے بولتا رہا۔ اور یوسف جو اُسے جانے کیا کیا کہنے آیا تھا، ایک ہاتھ سے اُسے لپٹائے اور دوسرے سے اس کا سر سہلاتا رہا۔

''میں گھر سے ہی آ رہا ہوں۔ صبح آیا تھا۔۔ سب خیریت ہے نا۔۔ اُدھر۔''

''ہاں۔۔ اُدھر۔۔ بڑی خالہ کے وہاں نا؟''

اُس نے یوسف کی آنکھوں سے مشابہہ آنسوؤں سے لبریز آنکھیں اُٹھا کر اُسے دیکھا، تو یوسف نے اثبات میں سر ہلایا۔

''نکی باجی بالکل ادھ موئی سی ہو گئی ہیں۔ ان کا Face پیلا ہو گیا ہے۔۔ وہ تو کسی سے بات ہی نہیں کرتیں اب تو۔۔''

مسہری پر اوندھی، اپنی بیاض پر جھکی نکی کو خبر ہی نہ ہوئی کہ کب یاور آ کر اُس کے پلنگ کے قریب قالین پر بیٹھ گیا۔

رستہ بھول گئیں خوشیاں ڈھونڈوں جا کر کس رستے

یاور نے ایک صفحے پر نظر ڈالی۔ بے چاری نکی باجی۔۔

تیری دو آنکھوں کی راحت جو گئی
زندگی میری مصیبت ہو گئی

"نکی باجی۔۔"

نیلی نیلی دو آنکھیں پلنگ کے بان پر ناک ٹکائے اُسے دیکھ رہی تھیں۔

"کیسی ہیں نکی باجی؟"

یاور نے چہرہ اوپر کیا۔

پل بھر کو نکی کا دل جیسے حلق میں اُچھل آیا تھا۔ سال بھر پہلے تک یوسف ایسا ہی لگا کرتا تھا۔ اُس نے گلے کے قریب ہاتھ رکھ کر گویا زخمی طائر سے پھڑ کتے دل کو سنبھالا۔

"کیسا ہے میرا پیارا سا چھوٹا سا دوست۔ میرا بھیا؟"

اُس نے خوش دلی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی اور یاور کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

"بہت خوش ہوں نکی باجی۔۔ میں۔۔"

خوشی اُس کی معصوم سی آواز سے چھلکی پڑتی تھی۔ نکی بے قرار آنکھوں سے اس کے چہرے کے تأثرات میں اپنے سوالات کا جواب مانگنے لگی تو اُس نے کتابوں کے بیگ میں رکھے پینسل باکس میں سے ایک پرچی نکال کر نکی کے حوالے کی۔

وہ دونوں پہاڑی کے دامن میں کئی بارہ دریوں پر مشتمل باغ کے بالائی باغیچے کے کونے میں بیٹھے تھے۔ صدیوں پہلے مغل شہزادے داراشکوہ نے ستاروں کی گردش جاننے کے لیے جھیل ڈل کے کنارے کوہِ زَبروَن پر یہ مشاہدہ گاہ بنوائی تھی کہ اُسے علم نجوم سے خاصا شغف تھا۔ باغ کا نام پری محل رکھا گیا تھا۔

بے شمار پھولوں سے سجے ان باغیچوں سے جھیل کا منظر نہایت دل فریب معلوم ہوتا تھا۔ جھیل کے کنارے واقع مغل باغات کی سیر کرنے والوں کی تعداد شام کو بڑھ جایا کرتی تھی، لیکن ادھر اب ایسا شاذ و نادر ہی ہوا کرتا۔ نیچے کنارے پر رنگ برنگی چھوٹی کشتیوں کی قطاریں سونی تھیں۔ یہ کشتیاں شکارے کہلاتی تھیں اور وادی کے اچھے دنوں میں سیاحت کی مصروف ترین آماجگاہ ہوتیں۔ بڑے بڑے گل بوٹوں والی نشست گاہوں اور خوش رنگ ریشمی پردوں والی ان کشتیوں کو کنارے باندھ، ناخدا جانے کہاں چلے گئے تھے۔ حالانکہ بہار شباب پر تھی۔ دور بیچ جھیل کے ایک چھوٹی سی بغیر چھت کی کشتی جس کی لکڑی بہت سا پانی پینے سے بدرنگ ہوگئی تھی۔ دوسرے کنارے کی طرف آہستہ خرامی سے رواں تھی۔

"کہاں تھے۔۔ تم؟"

نکی نے اسے کئی لمحوں تک بغور دیکھا۔ وہ ایک دم بدلا بدلا لگ رہا تھا۔ اُس نے داڑھی بڑھا رکھی تھی۔ گھٹنوں سے نیچے تک لمبے کرتے کے اوپری کھلے بٹن میں سے سینے میں اُگے سیاہ بال جھانک رہے تھے۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے اور گھنگھریالے بال پہلے کی ہی طرح داہنے ابرو تک آتے تھے، جن کے پیچھے نیلی نیلی آنکھیں جیسے دو جہاں کی فکر میں غلطاں تھیں۔

''تم میرے ساتھ چلوگی انیقہ۔۔؟''

یوسف کی آنکھیں یکا یک جیسے باغی ہوگئیں تھیں۔ اُس کے طرزِ تخاطب پر نکی چونکی نہیں تھی۔

''کہاں۔۔؟''

چھوٹے سے پھاٹک کے قریب لگے سونف کے پودے ہوا کے جھونکے سے لہرائے۔ ایک دلربا سی مہک پھیل گئی۔

''یہی ایک راستہ ہے۔۔ ورنہ۔ کوئی آپ کو کیوں مجھے سونپے گا۔۔ ہاں نہیں کریں گی نکی باجی تو۔۔ تو خدا کی قسم۔۔ خدا کی قسم۔۔''

وہ پل بھر میں پہلے کی طرح اداس اور مجبور سا ہو گیا۔ آنسو بھر آئے۔

''نہیں یوسف۔۔ نہیں۔۔''

اس کی ایک آنکھ سے آنسو ٹپکا۔ نکی اُسے دیکھتی رہی۔

''ایسا مت کرو۔۔ ایسا نہ کہو۔۔ یہ کیسے ممکن ہوگا۔۔ یہ کیونکر ہوگا۔۔؟''

''کیوں نہیں ہوگا نکی باجی۔۔''

اُس نے نکی کا ہاتھ پکڑ کر چھوڑ دیا۔

لمبی سفید دم والی ایک سیاہ چڑیا سامنے زرد گلابوں کی کیاری پر آ بیٹھی اور منقار آسمان کی جانب اٹھا کر دفعتاً زور سے چہچہائی۔ یوسف نے نظر دوڑا کر چڑیا کی طرف دیکھا۔ نکی نے بھی چونک کر اُدھر دیکھا تھا۔ دونوں مسکرا دیئے۔

''ہم ایسے ہی ہمیشہ ساتھ ہنس سکتے ہیں نکی باجی۔۔ مان جائیے نا۔۔ میں آپ کی تعلیم ضائع نہیں ہونے دوں گا۔ خود بھی کوئی اچھا کام کروں گا۔۔ اب بھی وقت ہے نکی باجی۔۔ میرے دوستوں نے سب انتظام کر رکھا ہے۔۔ ہم نکاح کرلیں گے۔ پھر کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔۔ ورنہ بعد میں کبھی ایسا موقع نہیں آئے گا۔۔ ابھی بھی ہاں کر دیجئے نکی باجی۔۔''

نکی اپنے گھٹنوں کو باہوں کے حلقے میں لیے بیٹھی اپنے پاؤں دیکھتی رہی۔

''میں تمھیں دنیا کی ہر خوشی دوں گا۔ اپنا سب کچھ تمہارے قدموں میں رکھ دوں گا۔۔ ہمارا چھوٹا سا۔۔ گھر ہوگا۔۔تم ہمیشہ مسکراتی رہوگی۔۔کوئی تمہاری ماں کی طرح تم پر بندشیں نہیں ڈالے گا۔۔''

وہ خاموش ہوگیا۔اور سر جھکا کر نکی کے پیروں کو دیکھتا رہا۔ پرندے چہچہاتے رہے۔سونف کی خوشبو ہواؤں میں گھلتی رہی۔نکی چپکے چپکے روتی رہی۔دو ایک آنسو اُس کے پاؤں پر گرے۔یوسف نے انھیں ہاتھ سے پونچھ لیا۔

''کیا ہوا۔۔نکی باجی۔۔''

وہ تھکی ہوئی سی آواز میں بولا۔

''میں۔۔جانتا تھا۔۔آپ میرا ساتھ۔۔میرا ساتھ۔۔نہیں دیں گی۔۔''

اُس کی آواز بھرا گئی تھی۔وہ آواز کی لرزش قابو میں رکھ کر بولتا ہوا موٹر سائیکل تک آ گیا۔

سامنے جھیل میں سورج نے غوطہ لگایا اور ڈوب گیا۔آسمان کا وہ کنارہ اُس وقت تک دہکتے انگارے سا سرخ رہا جب تک موٹر سائیکل نیچے سڑک کے موڑ تک آ گئی کہ یوسف سامنے دیکھ رہا تھا اور نکی کی نظروں کے سامنے سڑک ختم ہونے تک آسمان ویسا ہی سلگتا سلگتا سا رہا۔کبھی کبھی منظر دھندلا جاتا مگر آنسو ٹپک جاتے تو سب صاف نظر آنے لگتا۔

نکی کے گھر کو مڑنے والی گلی کے موڑ پر یوسف نے لبِ سڑک موٹر سائیکل روک دی اور دونوں پاؤں زمین پر ٹکائے موٹر سائیکل پر ہی بیٹھا رہا۔

''آنکھوں سے۔۔اوجھل مت ہونا۔۔یوسف۔۔''

نکی کی آواز کانپتی رہی۔ہچکیاں گھٹتی رہیں۔

''اپنے فیصلے پر آپ تمام عمر پچھتائیں گی نکی باجی۔''

اس کی آنکھوں میں موت کی سی سرد مہری تھی۔اُس نے موٹر سائیکل سٹارٹ کردی۔نکی نے ہنڈل پکڑے ہوئے اُس کے ہاتھ پر دونوں ہاتھ رکھ دیے۔اس کی آنکھوں کو خوفزدہ سی نظروں سے دیکھتے ہوئے اُس نے اپنے ہاتھوں کی گرفت اُس کے ہاتھ پر مضبوط کردی۔

''ایسا مت کرنا۔''

وہ سرتاپا التجا بن گئی۔

یوسف اسے کچھ لمحوں تک چپ چاپ دیکھتا رہا۔اُس کے ہونٹوں پر ایک رنجیدہ سی مسکراہٹ

پھیل گئی ۔ ۔اور موٹر سائیکل آگے بڑھ گئی ۔نکی موڑ پر پتھر کی مورت سی کھڑی اُسے دور ہوتا دیکھتی رہی ۔

'نادلائے میانِ یوسُفو ولو'

(پکارتی ہوں میں تجھ کو مرے یوسف آجا)

کسی شعر کا مصرع اس کے ذہن میں گونج گیا۔

رخساروں پر دو تازہ آنسو ڈھلک آئے ۔دو آنکھیں سڑک کے موڑ پر رکھ کر وہ گھر کی جانب مڑ گئی۔

اُن دنوں حالات اور بکھر گئے تھے ۔وادی اور اُداس ہوگئی تھی ۔ گھروں میں افراد کم ہو گئے تھے ۔دل رنجیدہ رہا کرتے تھے ۔گھروں سے کام کی خاطر نکلنے والوں کے شام کو لوٹنے تک گھر میں رہنے والے وسوسوں میں گھرے رہتے ۔

سال بھر ہونے کو آیا تھا ۔یوسف کی کوئی خبر نہ تھی ۔اُس کی ماں کا دل کبھی اداس ہو جاتا اور کبھی پُر اُمید ۔یہ دل اُسے دن میں کئی کئی بار مارتا اور زندہ کرتا تھا۔

اُس کے باپ کو دل کا دوسرا دورہ پڑ چکا تھا۔

جس دن پڑوس کے کسی لڑکے کی پہچان کے ایک آدمی نے بتایا کہ یوسف زندہ ہے مگر دور سرحد کے اُس پار ۔ ۔اُس دن اُس کی ماں سارا دن صرف روتی رہی تھی ۔

'میرا بیٹا زندہ ہے ۔ ۔مگر موت کی ٹریننگ لے رہا ہے ۔'

جانے کتنی دفعہ اُس نے یہ جملہ اپنے آپ سے دہرایا تھا ۔مگر دل کے مریض شوہر کے سامنے صرف آہیں بھر کر رہ جاتی ۔

'ہم سے دور ہی سہی ۔ ۔زندہ تو ہے ۔ ۔کبھی نہ کبھی لوٹ آئے گا ہمارے پاس ۔ ۔آخر ہمارا بچہ ہے ۔ ۔ہمارا خون ہے ۔ ۔"

وہ شوہر کو تسلی دیا کرتی ۔

خزاں کی آمد نے چناروں میں آگ لگا رکھی تھی ۔

نکی کے گھر کے پچھواڑے باہری دیوار کے اُس پار کنجڑوں کی کھیتیاں تھیں جن میں کئی طرح کی سبزیاں لہلہایا کرتی تھیں ،مگر ان دنوں وہاں صرف کڑم کا لمبی ڈنڈیوں والا ساگ اُگا ہوا تھا جس کے بڑے بڑے پتے چنار کے درخت کے پیچھے سے جھانکتے ہوئے اکتوبر کے چاند کی بھیگی ہوئی چاندنی میں

نکھرے نکھرے سے نظر آ رہے تھے۔

چاندنی کو اپنی مسہری کے کنارے تک آتا دیکھ نکی اُٹھ کر کھڑکی تک چلی آئی۔ کچھ لمحے وہاں کھڑی رہ کر واپس بستر پر لیٹ گئی۔ وہ آج بھی سو نہیں پا رہی تھی۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ وہ تاریکی میں آنکھیں کھولے چھت کو ٹکٹکی باندھ دیکھتی رہی۔ آنسو اُس کے کانوں میں جمع ہوتے رہے۔ اس کی اکثر راتیں آدھی سے بھی زیادہ بے خواب گزر جاتیں۔

پاس کی تپائی پر پڑے فون کی گھنٹی بجی۔ لمبی دوری سے بجنے والی لمبی گھنٹی۔ نکی نے لپک کر ریسور اٹھایا کہ گھر میں کسی کی نیند نہ خراب ہو۔

کون ہوگا اتنی رات گئے۔۔

''نکی باجی۔۔''

اس کی باریک سی ہیلو کے جواب میں آواز آئی۔ دل سینے میں ایسے دھڑکا جیسے مردہ بدن میں کسی نے اُسی لمحے روح پھونک دی ہو۔۔ اُس کا ہاتھ بے اختیار حلق پر چلا گیا۔

''یوسف۔۔''

اس کی آواز کانپی۔

''کہاں ہو یوسف؟''

وہ رو پڑی۔

''مجھے جیتے جی مار کر تم۔۔ تم کہاں چھپ گئے یوسف۔۔ کب آؤ گے۔۔ کہاں سے بول۔۔''

وہ ہچکیاں لینے لگی۔

''میں مرا نہیں نکی باجی۔۔ زخمی ہو کر نامراد پڑا رہا۔۔ اس وقت سمندر پار ہوں۔۔''

''تم آ جاؤ یوسف۔۔ میں بھی نیم مردہ ہوں۔۔ ساتھ مریں گے دونوں۔''

''میرا وہاں آنا۔۔ ناممکن ہے۔۔ میرے پاس پاسپورٹ کہاں ہے وہاں کا۔ جہاں کے پاسپورٹ سے یہاں آیا ہوں۔۔ وہ بھی مجھے کہاں چھوڑیں گے۔۔''

''کیوں کیا تم نے ایسا یوسف۔۔ تم مجھے کس قصور کی سزا دے رہے ہو۔۔ اپنے والدین کو کیوں دُکھ دے رہے ہو۔۔ لوٹ آؤ یوسف۔۔''

''نہیں نکی باجی۔۔ برف باری کے وقت آنے میں پکڑا نہ گیا تو روپوش تو رہنا پڑے گا۔۔ سب کی زندگی خطرے میں کیسے ڈال دوں۔۔ یہ ممکن ہی نہیں ہوگا۔''

''آ کر Surrender کرلو یوسف۔۔ یہ راستہ کیوں کر چن لیا تم۔۔''

''چپ۔۔ یہ لفظ دوبارہ کبھی مت دہرایئے گا۔۔ یہیں پر ختم کر دیا جاؤں گا۔۔ شہادت کا موقع نہیں ملے گا مجھے۔۔ آپ نہیں جانتیں۔۔''

''یہ کوئی شہادت ہے یوسف۔۔ ناراض ہو کر تم۔۔ تم تو اتنے ذہین تھے۔۔ اتنے سمجھدار تھے۔۔ یہ تمھیں کیا ہو گیا۔۔ ہے۔۔ تم۔۔''

''بس کیجئے نکی باجی۔۔ ہمیشہ آپ مجھے اپنے Student کی طرح اپنی مرضی کی باتیں سمجھاتی آ رہی ہیں۔۔ اب میں۔۔''

''میری مرضی۔۔ میری۔۔ مرضی۔۔ میری کون سی مرضی رہی ہے۔۔ کیسی مرضی۔۔''

آنکھوں میں نئے نئے آنسو بھر آنے سے اُس کی ناک بندسی ہو گئی تو آواز بھیگ گئی۔

''sorry نکی باجی۔۔ دل نہیں دُکھانا چاہتا تھا آپ کا۔۔ معاف کر دیجئے مجھے۔۔ معاف کر دیجئے۔۔''

اُس کی آواز بھی رندھ گئی۔ اور فون بند ہو گیا۔

نکی نے فون کان سے ہٹا کر رخسار سے لگا لیا۔

کتنے عرصے کے بعد اس نے یوسف کی آواز سنی تھی۔

فون رکھ کر وہ کھڑکی کے قریب آ گئی چوکھٹ پر ہاتھ دھر کر چاند کو دیکھتی رہی اور پھر کہیں کہیں دور دور نظر آتے تاروں کو۔

شاید فون کٹ گیا ہو۔۔ اور پھر گھنٹی بج جائے۔۔ اس انتظار میں وہ رات بھر نہیں سوئی۔ سحر تک بھی نہیں۔

کچھ مہینے اور گزر گئے۔ نکی اُس کے فون کا انتظار کرتی رہی۔ گھر کے راستے میں آنے والے قبرستان میں نرگس کے پودے کئی بار زمیں سے اونچے ہوئے، پھولے اور مرجھائے۔ فون نہیں آیا۔ راتوں کو برہا کے گیت لکھ لکھ کر اُس نے بیاضیں بھر دیں۔

ہر روز کالج سے لوٹتے وقت قبرستان کے قریب سے گذرتے ہوئے اُس کی رفتار سست ہو جایا کرتی۔ نظریں اس طرف اٹھ جاتیں۔

ایک دن اُس نے دیکھا کہ قبرستان کی دیوار کے چھوٹے سے دروازے کی جگہ بڑا سا پھاٹک

لگایا گیا ہے۔

'کُل نفسٍ ذائقۃ الموت'

پھاٹک کی ہری محراب پر سیاہ رنگ کی عبارت نے اس کی نظریں جکڑ لیں۔ کچھ لمحے وہ عبارت کو دیکھتی رہی۔ پھر اُس کے قدم پھاٹک کے درمیان لگے چھوٹے سے کواڑ کی طرف اُٹھ گئے۔ وہ ڈھلان اُتر کر منڈیر سے جا لگی۔ سامنے دور تک پھیلے ہوئے قبرستان میں بے شمار قبروں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ جگہ جگہ نئے کتبے کھڑے تھے۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑک اٹھا۔ وہ زمین پر بیٹھ گئی اور آنکھیں زور سے بھینچ لیں۔

اگر اس وقت۔۔ کوئی ہم پر بندوق تان دے۔۔ تو کیا ہمیں بھاگنا چاہیئے نکی باجی۔۔

کسی نے دھیرے سے کہا۔

بند آنکھوں سے نکل کر آنسو نکی کے رخساروں پر پھسل گئے۔

نہیں۔۔ نہیں یوسف۔۔ تم مجھ سے دور بھاگ گئے۔۔ میں۔۔ میں کہاں بھاگ سکتی ہوں۔۔ میں کہاں جا سکتی ہو۔۔ میں کہاں جاؤں۔۔ یوسف۔۔

نکی چپکے چپکے سسکنے لگی۔ خوب رو لینے کے بعد جب جی کچھ ہلکا ہوا تو اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ نرگس کے پھولوں میں ایستادہ کتبوں پر نام اور تاریخِ پیدائش کے ساتھ تاریخِ انتقال درج تھے۔

نصیر احمد ملک: تاریخِ پیدائش : ۹ر ستمبر ۱۹۷۰ء

وفات : ۶ر فروری ۱۹۹۲ء

محمد راشد میر : تاریخ پیدائش : ۵ر جون ۱۹۷۲ء

وفات : یکم جولائی ۱۹۹۳ء

وہ دہشت زدہ سی منڈیر سے لگی بیٹھی دُور دیوار تک پھیلے کتبے پڑھتی رہی۔ اُس کے چہرے پر کرب اُتر آیا۔ ہونٹ دانتوں میں بھینچے سسکیاں لیتے ہوئے اُس نے منھ دوسری جانب موڑا تو ایک بالکل تازہ تربت پر سیاہ سنگ مرمر سے تراشی لوحِ مزار نئی بہار کی نکھری ہوئی ٹھنڈی دھوپ میں چمک رہی تھی۔ قبرستان کے کناروں پر لگے بید کے درخت اُس پر بار بار سایہ کیے دیتے تھے۔

یوسف احمد خان پیدائش : ۱۱ر مارچ ۱۹۷۳ء

وفات : ۲ر جون ۱۹۹۳ء

"نہیں۔۔"

اُس کا ہاتھ بے اختیار اُس کے ہونٹوں پر چلا گیا۔ دوسرا ہاتھ اُس نے اپنے حلق پر رکھ دیا۔۔ دبی دبی سی چیخ اُس کے سینے میں گھٹ کر رہ گئی۔ ہچکیاں لے لے کر روتے ہوئے اُس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اُس کا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔ گلے کو اُس نے انگلیوں سے ایسے تھام رکھا تھا جیسے اُس کی جان اسی راستے نکل بھاگنے والی ہو۔

یہ نہیں ہوگا۔۔ میرے ساتھ۔۔ میرے اللہ۔۔ یہ نہیں ہوگا۔۔ اُس نے تڑپ کر آسمان کی جانب نگاہیں اٹھائیں اور سر پیچھے منڈیر پر اُگی ہری ہری نم گھاس سے ٹکا دیا۔ نیلا نیلا آسمان بے داغ نظر آرہا تھا۔ آنسو اُس کی آنکھوں سے بہہ بہہ کر چہرہ بھگوتے رہے۔ دیوار سے ملحقہ مسجد میں بجلی نہ ہونے کے باعث بغیر لاؤڈ سپیکر کی پُر دردسی اذان گونجا کی۔

بید کی ٹہنیوں میں لوٹ آنے والی چڑیوں نے جب چہک چہک کر آسمان سر پر اٹھالیا تو نکی نے اپنی سرخ سرخ آنکھوں پر دوپٹہ رکھ کر تھکے ہوئے پپوٹوں سے لگے آنسو جذب کر لیے۔ اور کھڑے ہونے سے پہلے ایک نظر پھر بائیں جانب دیکھا۔ ایک بار پھر اس کا ہاتھ اس کے گلے کے قریب چلا گیا۔

وہاں کوئی تازہ قبر تھی نہ کتبہ۔

اُس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اور اُسے سخت پیاس لگ رہی تھی۔

پھر۔۔ مہینے سالوں میں بدلنے لگے ایک دن کسی نے یوسف کی والدہ کو فون کر کے بتایا کہ آج شب کے ایک بجے یوسف اُن سے ویڈیو کانفرنسنگ کے ذریعہ رابطہ قائم کرے گا۔

''ہمارا بیٹا زندہ ہے سلامت ہے۔۔''

اُس کی ماں نے یہ خوش خبری گھر میں سب کو فرداً فرداً سنائی۔ اُس دن وہ سارا وقت لوریاں گاتی رہی، اور رہ رہ کر اُس کی آنکھیں بھیگتی رہیں۔

کمپیوٹر کے مانیٹر پر اُس کے بیٹے کی تصویر اُبھری تو وہ پہچان ہی نہ پائی۔ اُس نے سر منڈوا رکھا تھا۔ داڑھی گریبان تک بڑھی ہوئی تھی۔ آنکھیں نیم وا سی تھیں اور جب اُس نے والدین کو مخاطب کیا تو اُس کی آواز بھی تھکی تھکی سی معلوم ہوتی تھی۔

''آجاؤ۔۔ چاند۔۔ گھر آجاؤ۔۔''

ماں نے مانیٹر پر نظر آرہے اُس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور رو پڑی۔

''تمہاری ماں۔۔مرجائے گی بیٹا۔۔''

باپ کی آواز کانپ رہی تھی۔

''ابو امی بیمار ہیں یوسف۔۔تمہارے بغیر گھر بالکل تباہ ہوگیا ہے۔۔تمہارے بغیر کسی کا جی نہیں لگتا۔۔''

بہن سسکیاں لینے لگی۔

''اس طرح کی باتوں سے میرا ایمان کمزور کرنے کی کوشش نہ کریں آپ لوگ۔۔بس دعا کریں کہ میں جام شہادت نوش کروں۔۔اور آپ سب کے لیے جنت کے دروازے وا کروں۔۔''

اُس کی آواز میں عزم جھلک رہا تھا مگر چہرے پر غم کے سائے سے لہرا جاتے۔

''کسی طرح کچھ دن کے لیے آجاؤ۔۔یہ سب صحیح نہیں میرے لعل۔۔میں تمھیں سمجھا دوں گی۔ کچھ دن کے لیے آجاؤ۔۔تمھیں سینے سے لگانے کے لیے میرا۔۔میرا کلیجہ پھٹا جارہا ہے۔۔''

ماں روتی رہی۔

''میرے جنازے کو کندھا دینے۔۔کندھا دینے ہی آجا۔۔میرے بچے۔۔''

باپ بے بسی سے بولا۔

''اب جنت میں ملاقات ہونے کی دعا مانگئے ابو۔۔امی بزدلوں والی باتیں مت کیجئے۔۔''

یوسف کی آواز میں یاسیت شامل ہوگئی۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو۔۔کس نے بہکا دیا تم کو۔۔میرے بیٹے۔۔ہمارے پاس کبھی جی بھر کے بیٹھتے۔۔بات کرتے ہمارے ساتھ۔۔تو ہم تمھیں سمجھاتے تو۔''

''اُف ابو۔۔پھر وہی نصیحتیں۔۔پھر آپ۔۔میری بات کبھی سمجھیں گے۔کبھی آپ ابو۔۔کبھی نہیں۔۔اچھا کچھ دن بعد پھر Contact کروں گا میں۔۔''

اُس کے چہرے پر کرب اُتر آیا تھا۔مانٹیر کا Screen کورا ہوگیا۔

کاش وہ ایک جھلک دیکھ پاتی۔یاور سے ویڈیو کانفرنسنگ کی بات سن کر نکی کے دل میں حسرت جاگی اور سوگئی۔

کچھ دن بعد یہ بات بھی پرانی ہوگئی اور ہوتی چلی گئی۔یوسف کی کوئی خبر نہ آئی۔ایک برس اور بیت گیا۔

یاور نے آ کر نکی کو بتایا کہ یوسف کے والد اب زیادہ بیمار رہنے لگے ہیں۔ اور کچھ بہتر ہوتے ہی یوسف کی ماں انھیں حج پر لے جائے گی۔

یوسف کے والدین فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد کسی دوسرے شہر چلے گئے اور کوئی دو ماہ بعد لوٹے۔

انھیں دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے وہ برسوں کی عمر جی کر لوٹے ہوں۔ نہایت ضعیف اور۔۔ بیمار۔۔ اور دوسرے ہی دن، دل کا تیسرا دورہ پڑنے سے یوسف کے والد انتقال کر گئے۔

یوسف کی ماں کے آنسو نہیں بہے تھے۔

وہ اب اکثر اپنے کمرے میں پڑی رہتی۔

اُس کا چہرہ بالکل سپاٹ ہو گیا تھا۔

اب وہ ٹیلیفون کی گھنٹی پر چونکتی بھی نہیں تھی۔

بہت پہلے جب یوسف زخمی ہوا تھا تو اُس کی ناک سے کئی دن خون بہتا رہا تھا۔ وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ کسی دھماکے کے دوران کہیں سے کوئی چیز اُس کے ابرو پر آ لگی تھی۔ جب سے ہی اُس کے سر میں شدید درد رہتا تھا۔ ساتھی اُس کے سر پر کس کے گمچھا باندھ دیتے۔ درد دور کرنے کی گولیاں بے شمار کھانا پڑتیں۔ پہلے پہل درد اٹھنے کے درمیانی وقفے طویل ہوا کرتے جو رفتہ رفتہ مختصر ہونے لگے اور اب یہ عالم تھا کہ آدھ پون گھنٹے کے وقفے سے درد اٹھتا اور چھ، آٹھ گھنٹے رہا کرتا۔

حج کے دوران یوسف نے اپنے والدین سے رابطہ قائم کیا تھا۔

دوسرے شہر میں ملاقات طے ہوئی۔ اور برسوں بعد انھوں نے اپنے بیٹے کو دیکھا تھا جو بیحد کمزور لگ رہا تھا۔ مگر والدین کو دیکھ کر مسلسل مسکرائے جا رہا تھا۔

دوسرے دن سمندر کے اوپر بہت سے بادل ادھر سے اُدھر اُڑتے پھر رہے تھے۔ جیسے بادلوں کا پہاڑ راستہ بھٹک گیا ہو۔ جزیرے پر تعمیر ہوٹل کی کثیر منزلہ عمارت کے کسی اُوپری منزل کے سوئٹ کی بالکنی میں وہ تینوں بیٹھے تھے۔ یوسف کو ہفتے بھر بعد ٹھکانے پر لوٹ جانا تھا۔ والدین کا ویزا بھی ختم ہونے والا تھا۔

اُس دن یوسف کے والد بے حد پرسکون لگ رہے تھے۔ ان کی نظریں بیٹے کے چہرے سے ہٹتی نہیں تھیں۔ انھیں یقین ہو چلا تھا کہ بیٹا اُن کی بات مان لے گا اور وہ اُسے واپس لے آنے کا کوئی نہ

کوئی راستہ نکال لیں گے کیونکہ اس نے ماں باپ کی کسی بات کے جواب میں کوئی ضد نہیں کی تھی۔ خاموش سنتا رہا تھا۔

یہ باتیں یوسف کی بہن نے یاور کو بتائیں تھیں۔۔ مگر بہت دن بعد۔

جب خود اُسے اُس کی ماں نے بتایا تھا۔

بہت دن بعد۔ جب اُس کی ماں کے سپاٹ چہرے پر کچھ تاثرات ابھرنے لگے تھے۔

بہت دن بعد۔ جب اُس کی ماں رونے اور بات کرنے لگی تھی۔

اُس دن ماں کی گود میں سر رکھے بادلوں کو دیکھتے ہوئے یوسف کے سر میں درد اُٹھا تھا۔ جو کسی طرح کم ہونے میں نہ آیا اور پہلے سے کہیں زیادہ شدید ہوتا چلا گیا۔

ایکسرے سے نظر آیا کہ اُس کے دماغ کی باہری جانب کے سیال مادے میں بائیں آنکھ کے بالکل سیدھ میں کوئی انچ بھر لمبی اور آدھ انچ نصف قطر کی کوئی چیز پڑی ہے۔ M.R.I سے پتہ چلا کہ وہ ایک گولی ہے جو بہت پہلے آنکھ کے اندرونی کونے سے گھس کر نہ جانے کس طرح بغیر آنکھ کی پتلی سے لگے، سر میں بیٹھ گئی تھی۔ اب سرجری کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔

آپریشن کر کے گولی نکال دی گئی۔۔ مگر یوسف کو ہوش نہ آیا۔

کچھ دن 'کوما' میں رہ کر یوسف موت سے ہم آغوش ہو گیا۔

دیارِ غیر میں اُسے سپردِ خاک کر کے اُس کے والدین لوٹ آئے تھے۔

نکی کے گھر کے راستے میں پڑنے والے قبرستان میں کسی نئی میّت کے لیے اب کوئی جگہ نہیں بچی ہے۔ اُس کی دیواریں خستہ ہو کر کئی جگہ سے ٹوٹ گئی ہیں۔۔ یہاں تک کہ بہار کی آمد پر سڑک پر چلتے وقت بغیر منڈیر تک جائے، نرگس کے پھول آسانی سے نظر آ جاتے ہیں۔

وہاں سے گذرتے وقت نکی کی رفتار خود بخود دھیمی پڑ جاتی ہے۔ اُس کی نظریں بید کے درختوں سے ہوتی ہوئی قبرستان کے سارے احاطے میں بھٹکتی رہتی ہیں۔ گو کہ یوسف کی تربت ادھر نہیں ہے۔۔ پھر بھی۔۔ (افسانوی مجموعے یمبرزل سے)

◆❖◆

چند آراء

ترنم ریاض اردو کی ابھرتی ہوئی فکشن نگار ہیں ۔انہوں نے اپنے ناول اور افسانوں کے ذریعے قارئین اور نقادوں کو چونکا دیا ہے ۔اردو فکشن کے گلستان میں ان کی آمد، آمدِ بہاراں ہے ۔اردو تنقید کو ان کی حقیقی شناخت اور ان کے مرتبے کے تعین میں شاید کچھ دیر لگے گی ۔

مغنی تبسم (شعر و حکمت ۔۸)

۔۔۔آج اردو افسانے کی دنیا میں جو چند نام معتبر اور منور ہیں ان میں ایک نام ترنم ریاض کا بھی ہے ۔ترنم ریاض نے ترجمے بھی کئے تحقیقی اور تنقیدی مضامین بھی سپردِ قلم کئے ۔ناول اور افسانے بھی لکھے ۔ان کے افسانے ان کے ہمعصر افسانہ نگاروں سے بڑی حد تک جدا گانہ رنگ رکھتے ہیں ۔کرداروں کو ترنم ریاض نے اپنے قلم سے چھو کر زندہ کر دیا ہے ۔ان کے ہاں پلاٹ، کردار، افسانہ پن اور بیانیہ وغیرہ سب کچھ ہے، لیکن افسانہ بتاتا ہے کہ افسانہ نگار نے ان کی طرف ارادتاً توجہ نہیں کی ۔ندی کے بہاؤ کی طرح وہ سب کچھ سمیٹ لیا جو سمیٹ لینا چاہیئے ۔منظر نگاری تو ان کے ہاں

ہے ہی۔ خوب بھی اور خوبصورت بھی۔ لیکن کہیں کہیں انہوں نے جزیات نگاری سے کام لیتے ہوئے مناظر کو اور چکا چوند کر دیا ہے۔ ترنم ریاض نے اپنے اردگرد کے حالات کی نہایت عمدہ عکاسی کی ہے۔ اس خصوص میں افسانہ 'یمبر زل' غیر معمولی ہے۔ دہشت گردی اور موت کی آہٹوں کے پس منظر میں۔ امتحانات۔ بچوں کے امتحانات کے لئے تیاری۔ رشتے ناطے، امتحانات کے نتائج، مزید تعلیم کے منصوبے۔ ترنم ریاض نے اس افسانے میں غیر معمولی فن کاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ ترنم ریاض کے افسانے، افسانے نہیں لگتے۔ معاشرے کی منہ بولتی تصویریں بن جاتے ہیں۔ ان ہی تصویروں کے البم کے نام ہیں: ''یہ تنگ زمیں''، ''ابابیلیں لوٹ آئیں گی''، ''یمبر زل'' اور دوسرے افسانے!

سلیمان اطہر جاوید (ترنم ریاض کی افسانہ نگاری)

ترنم ریاض اردو شعر و ادب میں کوئی اجنبی نام نہیں رہا۔ انہوں نے تیزی کے ساتھ شہرت اور مقبولیت حاصل کی ہے۔ اور اردو شاعری اور افسانے کے قارئین نیز صاحبانِ نقد و بصر کے ذہنوں میں سما گئی ہیں۔ عام طور پر بہت کم اہلِ قلم ایسے نظر آتے ہیں جنہوں نے اتنے کم وقت میں ادب کے اکابرین سے اپنے آپ کو منوا لیا ہو۔ یہ نصرت ایسی ہے جس پر اگر ترنم ریاض فخر کریں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ترنم ریاض کی شخصیت میں وسعت ہے۔ ان کے کارنامے متعدد اور مختلف جہتوں میں سامنے آتے رہے ہیں ان کے یہاں تخلیق کا وہ جوہر ہے جو اپنے ارتقا، اظہار اور ایک منفرد انداز کے لئے مضطرب اور بے چین ہے۔

علیم اللہ حالی (انتساب۔۴)

ترنم ریاض کشمیر کے ایک جاگیردار گھرانے کی بیٹی، پروفیسر ریاض پنجابی کی بیگم اور جوانی کو چھوتے ہوئے دو عدد بیٹوں کی شفیق ماں ہیں۔ کئی کتابوں کی مصنفہ اور شاعرہ ہیں۔ آئے دن ادبی سرگرمیوں میں مصروف رہتی ہیں۔ ریڈیو اور ٹی وی سے خاص دلچسپی ہے۔ ان کی نفاست و نزاکت اور عادات و اطوار کو دیکھ کر ہم انہیں شہزادی کہتے ہیں۔ سچ مچ برا تو نہیں مانتیں لیکن جھوٹ موٹ کی خفگی میں اور بھلی لگتی ہیں۔ جینز جیکٹ ہو، کوٹ ٹراؤزرس ہوں، ساری بلاؤز ہو یا شلوار قمیص، کوئی بھی لباس زیبِ تن کریں، ہر لباس میں خود اپنی مثال لگتی ہیں۔ انتہائی مہذب اور شائستہ خاتون ہیں۔ اردو انگریزی، کشمیری اور پنجابی زبانیں فرفر بولتی ہیں۔ خاکسار کی پہلی تصنیف، 'شادابیاں' ان ہی کی ہمت افزائی کا نتیجہ ہے۔ اب سے کئی سال

ترنم ریاض

پہلے جب انہیں اپنے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین سنائے تھے تو دل کھول کر مسکرانے کے علاوہ انہوں نے نقرئی قہقہے بھی لگائے تھے۔ جب ہی سے ہمت بندھی کہ کتاب چھپوائی جائے۔ ہوسکتا ہے کہ ہمارے مضامین لوگوں کے چہروں کی شادابی زائل ہونے کا سبب نہ بنیں۔ خاکسار کی یہ تیسری تصنیف، ترنم ریاض کی جانب سے محاورتاً گھوڑے کو چابک مار کر آگے بڑھانے کا نتیجہ ہے کیوں کی گھوڑا جب رفتار پکڑتا ہے تو یہ نہیں دیکھتا کہ اس نے کتنے سنگِ میل پار کئے۔

ایس۔ایم کوثر رضوی۔ آل انڈیا ریڈیو

ہنستی بولتی ریڈیو بستی (سنئے کہ نہ سنئے)

مطبوعہ۔ ۲۰۰۶

۔۔۔ترنم ریاض کو مصوری، سنگتراشی اور موسیقی سے رغبت ہے۔ چرندو پرند، حیوانات و نباتات سے انسیت ہے۔ فن میں ڈوب کر کچھ پالینے کی جستجو ہے۔ ان کا یہ جمالیاتی احساس ان کے فکشن میں بہت شدت سے محسوس ہوتا ہے۔ ترنم ریاض اپنے موضوعات عام زندگی سے چنتی ہیں۔ ان کے ہاں علامتیں اُن کی فکری زمین سے پھوٹتی ہیں۔ وہ کہانی کی بنت میں فضا اور ماحول سے بھی علامتیں یا اشارے اکٹھا کرتی ہیں۔ کبھی ایک مصور کی طرح کہانی کے کینوس پر مختلف رنگوں کے ذریعے مختلف شیڈس ابھارتی ہوئی نظر آتی ہیں تو کبھی سنگتراش کی طرح مجسموں کی رگوں میں خون کی روانی اور حرارت شامل کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ ترنم ریاض کے فکشن کا یہ بنیادی وصف ہے کہ کہانی جہاں ختم ہوتی ہے، قاری کے ذہن میں اپنی تکمیل کی طرف نئے سرے سے بڑھنے لگتی ہے اور اس طرح قاری خود بھی مصنفہ کے تخلیقی عمل میں شریک ہو جاتا ہے۔۔۔

صغیر افراہیم (ترنم ریاض کا فکشن)

ترنم ریاض ایک Sweet Temper افسانہ نگار ہیں۔ ان کی کہانیوں میں صوفیانہ لے اور سرمستی ہے۔ تصوّف کا ایک طیف ہے جو ان کے تخیل پر محیط ہے۔ رابعہ عدویہ بصری کی طرح ان کی

کہانیوں میں پاکیزگی، عطوفت، امومت اور ممتا ہے۔ وہ عورت اور مرد کے خانے میں تقسیم ہو کر کہانیاں نہیں لکھتیں بلکہ ان کی کہانیاں فردِ کائنات کی کہانی ہوتی ہے جس کے جذباتی ارتعاشات کو ہم ان کی کہانیوں میں محسوس کر سکتے ہیں۔ ترنم ریاض عالمی حالات و واقعات سے مکمل طور سے آگاہ ہوتے ہوئے بھی کائنات اور حیات کے مسائل کو انسانی نظر سے دیکھتی ہیں۔ ان کے یہاں جوششِ باراں نہیں ہے اور نہ ہی تمرد و طغیانی و آشفتہ جولانی بلکہ تحمل، تدبر اور تفکر ہے۔ ان کا ردِعمل کسی بھی سطح پر ہیجانی یا جذباتی نہیں ہوتا بلکہ نہایت مثبت ہوتا ہے۔ وہ عورت مرد کے تعلقات اور دونوں کے مابین رشتوں کے رموز سے واقف ہیں اور اپنے متعینہ حدود و حریم میں رہ کر مسائل پر غور و فکر کرتی ہیں۔ درد و کرب کے باوجود آتش فشاں نہیں بنتیں بلکہ نہایت قرینے اور خوش سلیقگی کے ساتھ اپنے غم و غصے، خفگی، برہمی کا اظہار کرتی ہیں۔ ان کی تخلیق سے جو تصویر اُبھرتی ہے وہ ایسی عورت کی ہے جس کے ایک ہاتھ میں مشعل اور دوسرے ہاتھ میں پانی سے لبالب پیالہ ہے۔ ان کی کہانیوں میں خدا کی رحیمی کے اسرار نظر آتے ہیں۔ ان کی کہانی آہستہ رو آب اور سبک خرام پانی کی طرح استقامت کے ساتھ آگے بڑھتی ہے۔ کہانی میں نہ کوئی شور و غوغا ہے، نہ مصنوعی فضا آفرینی۔ فطری فضا میں ان کی کہانی اتمام کی منزل تک پہنچتی ہے۔ وہ کہانی میں اپنا فلسفہ، اپنا ادراک، اپنا وِژن نہیں بگھارتیں۔

حقانی القاسمی (ترنم ریاض بحیثیتِ افسانہ نگار)

MIRAA RAKHT E SAFARR

(SHORT STORIES)

TARANNUM RIYAZ

نام : ترنم ریاض

جائے پیدائش : سرینگر، کشمیر

تعلیم : ایم اے، ایم ایڈ

تصانیف

افسانوی مجموعے:

۱۔ یہ تنگ زمین

۲۔ ابابیلیں لوٹ آئیں گی

۳۔ یمبرزل

۴ مرا رختِ سفر

شاعری:

پرانی کتابوں کی خوشبو

تراجم:

۱۔ سنو کہانی (ہندی سے ترجمہ)

۲۔ ہاؤس بوٹ پر بلی (انگریزی سے ترجمہ)

۳۔ گوسائیں باغ کا بھوت (ہندی سے ترجمہ)

ناول:

مورتی

تنقید و تحقیق:

۱۔ بیسویں صدی میں خواتین کا اردو ادب

۲۔ چشمِ نقشِ قدم

زیرِ طبع:

ناول۔ صحرا ہماری آنکھ میں

مشغلہ:

برقی میڈیا سے وابستگی

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)

Ph: 23216162,23214465 Fax : 0091-11-23211540

E-mail :info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com

Website: www.ephbooks.com

978-81-8223-409-3